# اُصولِ عقائد

مؤلف

آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی مدظلہ العالی

اہتمام

حجۃ الاسلام علامہ ریاض حسین جعفری فاضلِ قم

ناشر

ادارہ منہاج الصالحین

جناح ٹاؤن، ٹھوکر نیاز بیگ، لاہور

فون: 35425372

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ


| | | |
|---|---|---|
| کتاب | : | اُصولِ عقائد |
| تالیف | : | آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی |
| اہتمام | : | حجۃ الاسلام علامہ ریاض حسین جعفری فاضل قم |
| پروف ریڈنگ | : | چوہدری محمد عمران حیدر جعفری |
| اشاعت | : | اپریل 2015ء |
| ہدیہ | : | -/[redacted] روپے |

ملنے کا پتہ

اِدارہ مِنہاجُ الصَّالِحِین ۔ لاہور

الحمد مارکیٹ فسٹ فلور دکان نمبر 20- غزنی سٹریٹ- اُردو بازار- لاہور

فون: 042-37225252 ، 0301-4575120

بسم الله الرحمن الرحیم

# ترتیب


☼ عرض ناشر 15

توحید 19

پہلا سبق 20

☼ خدا کی تلاش 20

☼ خالق کائنات کی معرفت حاصل کرنے کے لیے ہم کیوں غور و فکر کرتے ہیں؟ 20

☼ شکرگزاری کا احساس 21

☼ خدا کی معرفت سے ہمارے نفع ونقصان کا تعلق 22

دوسرا سبق 25

☼ ہماری روزمرہ زندگی میں خدا کے وجود کی نشانیاں 25

☼ خدا کی معرفت اور علوم کی ترقی 25

☼ خدا کی معرفت، تلاش اور اُمید 26

☼ خدا کی معرفت اور ذمہ داری کا احساس 27

☼ خدا کی معرفت اور سکونِ قلب 28

تیسرا سبق 31

☼ خدا کو معرفت کے لیے دو اطمینان بخش راستے 31

| | |
|---|---|
| ☼ اندرونی راستہ | 31 |
| **چوتھا سبق** | 36 |
| ☼ ایک اہم سوال کا جواب | 36 |
| ☼ نتیجۂ بحث | 39 |
| **پانچواں سبق** | 41 |
| ☼ ایک سچا واقعہ | 41 |
| **چھٹا سبق** | 45 |
| ☼ خدا کی معرفت کے لیے دوسرا راستہ | 45 |
| ☼ بیرونی راستہ | 45 |
| ☼ عقل اور نظم وضبط میں رابطہ | 46 |
| **ساتواں سبق** | 50 |
| ☼ نظام کائنات سے چند مثالیں | 50 |
| ☼ ہمارے جسم کی مملکت کا مرکز | 50 |
| ☼ دماغ کا سب سے عجیب وغریب حصّہ "مغز" | 52 |
| ☼ دماغ کا ایک اور حیرت انگیز حصّہ "حافظہ" | 52 |
| **آٹھواں سبق** | 56 |
| ☼ ایک چھوٹے سے پرندے میں عجائبات کی دنیا | 56 |
| ☼ چمگادڑ اور اس کی عجیب وغریب خلقت | 56 |
| ☼ سچ بتائیں کہ وہ ہستی کون ہے؟ | 59 |
| ☼ نہج البلاغہ میں چمگادڑ کی خلقت کا تذکرہ | 59 |
| **نواں سبق** | 61 |
| ☼ حشرات اور پھولوں کی باہمی دوستی | 61 |

☆ دو قدیمی اور مخلص دوست 62
☆ توحید کا ایک درس 64

## دسواں سبق 67

☆ چھوٹی مخلوقات کے بے انتہا وسیع جہان میں 67
☆ ایٹم کی حیرت انگیز دنیا 68
☆ ایٹم توحید کا درس دیتے ہیں 68
☆ دسویں سبق کے لیے ایک تکمیلی بحث 73
☆ خداوند عالم کی شان دار صفات 73
☆ صفات جمال وجلال 74
☆ خداوند عالم کی مشہور ترین صفات 75

# عدل 79

## پہلا سبق 80

☆ عدل کیا ہے؟ 80
☆ خداوند عالم کی تمام صفات میں سے "عدل" کو کیوں منتخب کیا گیا ہے؟ 80
☆ عدالت کیا ہے؟ عدالت کے دو مختلف معانی ذکر کیے گئے ہیں؟ 82
☆ مساوات اور عدالت کے درمیان فرق 85

## دوسرا سبق 87

☆ پروردگار کے عدل پر دلائل 87
☆ حُسن وقبح عقلی 87
☆ سرچشمہ ظلم کیا ہے؟ 88

## تیسرا سبق 93

☆ آفات وتکالیف کا فلسفہ 93

☼ محدود معلومات اور اردگرد کے حالات کے زیراثر فیصلے 93
☼ مغموم اور خبردار کرنے والے حوادث 96

چوتھا سبق 100
☼ زندگی کے ناخوشگوار حادثات کا فلسفہ 100
☼ انسان مشکلات کی آغوش میں پرورش پاتا ہے 100
☼ مشکلات خدا کی طرف رجوع کا ذریعہ ہیں 102

پانچواں سبق 105
☼ آفات و مشکلات کے فلسفہ کے بارے میں 105
☼ مشکلات اور نشیب وفراز زندگی کو روح عطا کرتے ہیں 105
☼ خودساختہ مشکلات 107

چھٹا سبق 111
☼ مسئلہ جبر واختیار 111
☼ عقیدۂ جبر کا سرچشمہ 111
☼ جبر کے معتقد افراد کی غلط فہمی کی اصل وجہ 112
☼ الف: سیاسی اسباب 114
☼ ب: نفسیاتی اسباب 115
☼ اجتماعی اسباب 115

ساتواں سبق 118
☼ ارادہ اور اختیار کی آزادی پر واضح ترین دلیل 118
☼ منطق "جبر" کا "مذہب" کی منطق سے تضاد 120

آٹھواں سبق 123
☼ اَمرٌ بَینَ الاَمرَین (یا وسطی مکتب) کیا ہے؟ 123

| | |
|---|---|
| ✪ جبر کے مقابلہ میں "عقیدۂ تفویض" | 123 |
| ✪ مکتب واسطہ (یا درمیانی راہ کا عقیدہ) | 124 |
| ✪ دوسری مثال | 125 |
| ✪ قرآن اور جبر و اختیار کا مسئلہ | 126 |
| **نواں سبق** | 130 |
| ✪ ہدایت اور گمراہی خدا کے ہاتھ میں! | 130 |
| ✪ ہدایت اور گمراہی کی اقسام | 130 |
| ✪ ایک اہم سوال | 131 |
| ✪ خدا کا ازلی علم گناہ کرنے کی وجہ ہے؟! | 133 |
| **دسواں سبق** | 137 |
| ✪ خدا کا عدل اور مسئلہ "خلود" | 137 |
| **نبوت** | 143 |
| **پہلا سبق** | 144 |
| ✪ ہمیں رہبرانِ الٰہی کی احتیاج | 144 |
| ✪ ہمارے علم و دانش کا محدود ہونا | 144 |
| ✪ تعلیم کے اعتبار سے احتیاج | 147 |
| ✪ اجتماعی اور اخلاقی مسائل میں رہبری کی ضرورت | 148 |
| **دوسرا سبق** | 151 |
| ✪ اجتماعی قانون گزاری کے لیے انبیاء کے وجود کی ضرورت | 151 |
| ✪ بہترین قانون ساز کون ہے؟ | 152 |
| ✪ یہ شرائط کس میں موجود ہیں؟ | 154 |

☼ توحید اور نبوت کے درمیان رابطہ 155

تیسرا سبق 158

☼ انبیاءؑ کیوں معصوم ہیں؟ 158

☼ گناہ اور خطا سے پاک ہونا 158

☼ عصمت کا مقام کیسے باعثِ فضیلت ہو سکتا ہے؟ 161

چوتھا سبق 163

☼ پیغمبرؐ کی شناخت کا بہترین راستہ 163

☼ چند روشن نمونے 164

☼ دوسری مثال 165

☼ معجزات کو خرافات سے نہیں ملانا چاہیے 165

☼ معجزہ کا دوسری خارق عادت چیزوں سے فرق 166

پانچواں سبق 169

☼ پیغمبرِ اسلامؐ کا سب سے بڑا معجزہ 169

☼ ولید بن مغیرہ کی کہانی 172

چھٹا سبق 176

☼ اعجاز قرآن کے چند دریچوں کی طرف 176

☼ حروف مقطعات کیوں؟ 176

☼ فصاحت و بلاغت 177

ساتواں سبق 182

☼ قرآنِ مجید کا کائنات کے بارے میں نظریہ 182

اٹھواں سبق 190

☼ قرآن اور جدید علمی انکشافات 190

☼ قرآن اور قوت جاذبہ کا قانون 190

☼ زمین کی اپنے گرد اور سورج کے گرد گردش 193

نواں سبق 197

☼ پیغمبرؐ اسلام کی سچائی وحقانیت پر ایک اور دلیل 197

دسواں سبق 204

☼ پیغمبرؐ اسلام کا آخری نبی ہونا 204

☼ خاتمیت کا دقیق مفہوم 204

☼ پیغمبرؐ اسلام کے خاتم الانبیاءؑ ہونے کی دلیل 205

امامت 213

پہلا سبق 214

☼ امامت کی بحث کا آغاز کب ہوا؟ 214

☼ کیا یہ بحث اختلافات بڑھانے والی ہے؟ 215

☼ امامت کیا ہے؟ 218

دوسرا سبق 221

☼ امام کے وجود کا فلسفہ 221

☼ الٰہی رہبروں کی ہمراہی میں روحانی تکامل 221

☼ آسمانی ادیان کی حفاظت 222

☼ اُمت کی سیاسی واجتماعی قیادت 223

☼ اتمام حجت کی ضرورت 225

☼ امام فیضِ الٰہی کے حصول کا بڑا وسیلہ 225

تیسرا سبق 228

☼ امام کے لیے ضروری شرائط وخصوصیات 228

- ☼ خطاؤں اور گناہوں سے معصوم ہو 229
- ☼ مجسم علم ہونا 230
- ☼ شجاعت 231
- ☼ پرہیزگاری اور تقویٰ الٰہی 231
- ☼ اخلاقی جاذبیت 232

**چوتھا سبق** 234

- ☼ امام کا انتخاب کس کی ذمہ داری ہے؟ 234
- ☼ کیا اُمت کو پیغمبر کا جانشین مقرر کرنے کا حق حاصل ہے؟ 235
- ☼ کیا پیغمبرؐ نے اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا؟ 237
- ☼ اجماع اور شوریٰ 239
- ☼ علی علیہ السلام سب سے افضل تھے 240

**پانچواں سبق** 243

- ☼ قرآن اور امامت 243
- ☼ قرآن بتاتا ہے کہ "امامت" خدا کی طرف سے ہے 243
- ☼ آیتِ بلّغ کیوں نازل ہوئی؟ 245
- ☼ "اُولی الامر کی اطاعت" کے حکم والی آیت 247
- ☼ اُولی الامر سے مراد 247
- ☼ آیتِ ولایت 248

**چھٹا سبق** 252

- ☼ امامت، سنتِ پیغمبرؐ کی روشنی میں 252
- ☼ حدیثِ غدیر 253
- ☼ حدیثِ غدیر کی سند 257

☼ حدیثِ غدیر میں "مولا" کا معنی 258

ساتواں سبق 260

☼ "حدیثِ منزلت" اور "حدیثِ یوم الدار" 260

☼ حدیثِ منزلت کا مضمون 262

☼ حدیثِ یوم الدار 263

اٹھواں سبق 266

☼ حدیثِ ثقلین اور حدیث سفینہ 266

☼ حدیثِ ثقلین کی اسناد 266

☼ حدیثِ ثقلین کا مفہوم 268

☼ چند قابلِ توجہ باتیں 268

☼ حدیثِ سفینۂ نوحؑ 270

نواں سبق 272

☼ بارہ امامؑ 272

☼ بارہ اماموں کے بارے میں روایات 272

☼ مذکورہ احادیث کا مفہوم 274

☼ ائمہ کے ناموں کے ساتھ ان کا انتخاب 276

☼ جو شخص مرجائے اور اپنے زمانے کے امامؑ کی معرفت حاصل نہ کرے 278

دسواں سبق 282

☼ حضرت امام مہدی علیہ السلام 282

☼ بارہویں امامؑ اور دنیا کے مصلحِ اعظم 282

☼ تاریک شب کا اختتام 282

☼ فطرت اور مصلحِ اعظم کا ظہور 283

☼ باطنی الہامات کی علامات 283

☼ عقلی دلائل 286

☼ قرآن اور حضرت مہدیؑ کا ظہور 288

☼ احادیث میں حضرت مہدی علیہ السلام کا تذکرہ 290

☼ اہلِ تشیع کی احادیث 291

معاد 295

پہلا سبق 296

☼ ایک اہم سوال: موت اختتام ہے یا آغاز؟ 296

☼ بہت سے لوگ موت سے ڈرتے ہیں، کیوں؟ 296

☼ خوف کی حقیقی وجہ 297

☼ موت سے فنا مراد لینا 297

☼ سیاہ اعمال نامے 298

☼ دو مختلف نظریے 299

دوسرا سبق 303

☼ معاد کے بغیر زندگی بے معنی ہے 303

☼ انسانی تربیت میں عقیدہ معاد کا اہم کردار 305

تیسرا سبق 310

☼ روز قیامت کی عدالت کا نمونہ خود آپؐ کے وجود میں ہے 310

☼ تیسری عدالت جو اس سے بھی منظم اور دقیق ہے وہ "ضمیر کی عدالت ہے" 311

چوتھا سبق 316

☼ فطرت کی تجلیوں میں معاد 316

☼ بقا کے ساتھ عشق 316

☼ گزشتہ اقوام میں موت کے بعد زندگی کا تصور 317

## پانچواں سبق 321

☼ قیامت عدل کے ترازو میں 321

☼ اختیار اور ارادہ کی آزادی 322

## چھٹا سبق 326

☼ موت کے بعد کی زندگی اسی جہان میں کئی دفعہ مشاہدہ ہو چکی ہے؟ 326

## ساتواں سبق 332

☼ معاد اور فلسفہ تخلیق 332

## آٹھواں سبق 338

☼ روح کی بقا موت کے بعد زندگی کی علامت 338

☼ روح میں بیرونی دنیا کے انعکاس جیسی خصوصیت 340

☼ روح کے حقیقی ہونے اور مستقل ہونے پر تجرباتی دلائل 342

## نواں سبق 346

☼ جسمانی اور روحانی معاد 346

☼ جسمانی معاد پر قرآنی شواہد 347

☼ عقلی شواہد 348

☼ معاد جسمانی کے حوالے سے سوالات 349

## دسواں سبق 353

☼ جنت، جہنم اور اعمال کا مجسم ہونا 353

☼ اعمال کا مجسم ہونا 356

☼☼☼

# عرضِ ناشر

حضور سرور کائنات ﷺ کے وصال کے ساتھ ہی وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، اور نصوصِ قطعیہ سے یہ منصب نبوت و رسالت امامت و ولایت میں تبدیل ہو گیا اور امام وقت پر یہ بھاری بھر کم ذمہ داری عائد ہو گئی۔ یعنی امام قائم مقام نبی و رسول ہوتا ہے۔ سادہ لفظوں میں کہ امامؑ اپنی طرف سے شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ نہیں کرتا، بلکہ اس کی تشریح و توضیح کرتا ہے، کیونکہ یہ بھی نمایندہ الٰہی ہوتا ہے اور معصوم عن الخطاء ہوتا ہے، یعنی لوحِ محفوظ پر لکھے ہوئے حکمِ واقعی اور حقیقی کو اُمت تک پہنچاتا ہے، جس میں کسی قسم کی خطاء اور اشتباہ کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

سلسلۂ امامت و ولایت غیبت امام زمان علیہ السلام تک تو چلتا رہا، لیکن امام علیہ السلام کی غیبت کے بعد بنی نوع انسان کے لیے ایک مشکل ایجاد ہو گئی کہ اپنے مسائلِ جدیدہ اور مستحدثہ کا حل کس سے پوچھیں؟

کیونکہ حجتِ خدا تو ظاہری طور پر آنکھوں سے اوجھل ہے، جب کہ دین اسلام اکمل و کامل اور جامع ہے۔ اس میں کسی قسم کی جھول اور نقص نہیں ہے، لہٰذا امامؑ نے اپنے خاص نائب مقرر کیے جن کو "نواب اربعہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ امام علیہ السلام کے اس نائب خاص کو اگر کوئی مشکل پیش آتی تو وہ امامؑ سے متوسل ہو کر اپنے مسائل کا حل پوچھ لیتے، لہٰذا اس زمانہ نیابت کو "غیبتِ صغریٰ" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان نواب اربعہ کے بعد امامؑ نے اپنے نائب کی علامات کا ذکر کیا کہ جس میں یہ یہ علامات پائی جائیں گی وہ میرا نائب ہوگا۔ امامؑ کے اس زمانہ کو "غیبتِ کبریٰ

سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور اصطلاح میں اس نائب کو "مجتہد جامع الشرائط" سے یاد کیا جاتا ہے۔

امام زمان علیہ السلام کی غیبت کبریٰ سے لے کر آج تک بلکہ ظہور امامؑ تک یہ مجتہد فقہ اسلامی کی تشریح و توضیح اور مسائلِ جدیدہ کا نصوص عقلیہ و نقلیہ سے حل پیش کر رہے ہیں۔

قارئین کرام!

میں نے جس مقصد کے لیے طولانی تمہید باندھی اس کا مقصد یہ ہے۔ اسی وجہ سے مذہب جعفریہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے کبھی بھی اجتہاد کا دروازہ بند نہ ہونے دیا بلکہ ہر دور میں ہمارے مجتہدین کرام نت نئے اُٹھنے والے مسائل کا اجتہادی حل قرآن وسنت کی روشنی میں پیش کر کے دیگر فرقوں کے حاملین کو باور کرایا کہ قرآن ایک مکمل ضابطہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ جعفریہ ہر عہد میں ممتاز و منفرد رہی، اور ارتقائی منازل بخیر و خوبی بلکہ کمال احسن طریقہ سے طے کرتی رہی۔ ہمیں کوئی ایسا زمانہ نہیں ملتا کہ ہمارے مجتہدین نے پیش آمدہ مسائل کے سامنے سرنگوں کیا ہو، یا اپنی بے بسی کا اعلان کیا ہو، ایسا قطعی طور پر نہیں ہوا، بلکہ قرآن وسنت اور دوسری نصوص کے ذریعے ان کا حل ڈھونڈا۔ جب کہ اُمت اسلامیہ کے دوسرے فرقے تذبذب کا شکار رہے، کبھی کسی کو اجتہاد کے اعلیٰ درجہ پر فائز کر دیا، یعنی اجتہاد کا دروازہ کھول دیا، اور پھر ان کے مرنے کے بعد بھی ان کی تقلید جاری رکھی، ساتھ اجتہاد کا دروازہ بھی بند کر دیا لیکن فقہ جعفریہ کے رہبرو، رہنماؤ! تمھاری عظمت کو سلام! تم نے منصب کی پاسداری کی، شخصیت کی پوجا نہیں کی۔ فقہ جعفریہ نے مجتہدین کے اَبدی اور اساسی قانون "مَاتَ الْمُفْتِيْ مَاتَ الْفَتْوىٰ" "کہ جب مفتی فوت ہوجائے تو پھر فتویٰ بھی فوت ہوجاتا ہے" وضع کر کے شخصیت پرستی کی قطعی نفی کی۔ ہر عہد

کا جامع الشرائط مجتہد وہ روشن ستارہ ہے کہ جو آسمانِ اجتہاد پر طلوع ہو کر علم و فضل کی روشنی ہر سُو بکھیرتا ہے، اور پھر جب ایک عرصہ کے بعد یہ غروب ہو جاتا ہے تو اس کی جگہ پر بہتر درخشندہ و تابندہ ستارہ اُبھرتا ہے جو پوری جلالت کے ساتھ اُفقِ اجتہاد کی ضوفشانی کے لیے تیار رہتا ہے۔

لہٰذا یہ زمینی حقائق (Ground Reality) ہیں کہ جن کا کوئی بھی صاحبِ فکر انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مجتہدین کرام کی پوری زندگی علوم و فنون کی درس و تدریس اور تحقیق و جستجو میں صرف ہو جاتی ہے اور عموی طور پر یہ نابغۂ روزگار عمر کا طویل حصّہ اُصول و فقہ پر ریسرچ میں گزار دیتے ہیں۔

بلاشک و شبہ فقہ اسلامی پر جتنی عرق ریزی علمائے شیعہ نے کی، کسی دیگر فقہائے اسلامی کو نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن ہمارے بعض مجتہد ایسے بھی گزرے یا بقیدِ حیات ہیں کہ جنھوں نے علوم و فنون کی تحقیق کے ساتھ ساتھ تفسیرِ قرآن، تاریخِ اسلام اور عقائد و نظریات جیسے موضوعات پر بھی قلم اُٹھایا۔ چونکہ ان برجستہ ہستیوں کو علوم و فنون پر پہلے ہی مہارت ہوتی ہے، لہٰذا وہ ان سنہری اصولوں کو سامنے رکھ کر تحقیق کرتے ہیں، جن کے استدلال و براہین کو رد کرنا ایک مشکل امر ہوتا ہے۔

آسمانِ علم و آگاہی کے چمکتے دمکتے ستاروں میں سے حوزہ علمیہ قم کے عظیم استاد و محقق آیت اللہ العظمیٰ آقائے ناصر مکارم شیرازی مدظلہ العالی کا نام اہمیت کا حامل ہے کہ آپ درسی اور اجتہادی مصروفیات کے باوجود دوسرے متعدد موضوعات پر کام کر چکے ہیں اور پوری دنیا سے داد حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی تیس جلدوں پر محیط تفسیر نمونہ نے تو پوری دنیا پر ان کا علمی ڈنکا بجا دیا ہے۔ اور یہ تفسیر دنیا کی متعدد زندہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ آپ نے محققین اور دانشوروں کی ایک کمیٹی قائم کر کے ایک اچھی روایت ڈالی جو ہمہ وقت مختلف موضوعات پر تحقیق میں مصروفِ عمل ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''أصول عقائد'' بھی ان کی عظیم علمی و تحقیقی کاوش ہے جس کا اُسلوب نہایت فصیح و بلیغ ہے۔ آپ نے براہینِ عقلیہ اور نقلیہ کے ذریعے خدا کی واحدانیت سے لے کر دوسرے عنوانات کو موضوعِ بحث قرار دیا ہے۔

آیت اللہ طاہری خرم آبادی کے زیرِ اثر ادارہ معارف اسلامی پبلشر نے اس کتاب کو زیورِ اشاعت سے مزین کیا تھا۔ ہم نے ان کے شکریہ کے ساتھ اُردو خواں حضرات کے لیے شائع کیا ہے، تاکہ اس سے ہمارے ہم وطن بھی استفادہ کر سکیں۔

پروردگارِ عالم! ہمارے اس پاک مشن کو بحق چہاردہ معصومین علیہم السلام اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ اسی طرح علم کے بحرِ بیکراں سے طالبانِ علم و عرفان کی تشنہ لبی کو دُور کر سکیں، اور اسی خوب سے خوب تر کی جستجو میں عمر تمام ہو جائے، اور ہمارا محبانِ آلِ محمدؐ میں سے شمار فرمائے۔

والسلام مع الاکرام

طالبِ دُعا!

ریاض حسین جعفری فاضلِ قم

سربراہ ادارہ منہاج الصالحین، لاہور

maablib.org

# توحید

maablib.org

پہلا سبق

# خدا کی تلاش

## خالق کائنات کی معرفت حاصل کرنے کے لیے ہم کیوں غور و فکر کرتے ہیں؟

اس وسیع و عریض کائنات کے بارے میں جاننے اور اس سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق ہم سب کے دلوں میں ہوتا ہے۔ یقیناً ہم سب جاننا چاہتے ہیں کہ:

دل فریب ستاروں سے بھرا یہ بلند و بالا آسمان

دل کش مناظر سے بھری پڑی یہ وسیع زمین

یہ رنگ برنگی مخلوقات، خوب صورت پرندے، انواع و اقسام کی مچھلیاں، دریا و پہاڑ، پیارے پیارے پھول، کلیاں اور آسمان کی طرف بڑھتے ہوئے مختلف درخت، کیا یہ سب خود بخود وجود میں آ گئے ہیں؟

یا یہ عجیب و غریب نقش و نگار کسی ماہر و توانا نقاش کے ذریعے کھینچے گئے ہیں؟

اس کے علاوہ ہم سب کے ذہنوں میں سب سے پہلے یہ سوالات بھی اُبھرتے ہیں کہ:

— ہم کہاں سے آئے ہیں؟

— کہاں ہیں؟

— اور کہاں جا رہے ہیں؟

اگر ہمیں ان تینوں سوالات کے صحیح جوابات حاصل ہو جائیں تو یہ ہماری خوش نصیبی

ہوگی یعنی ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہماری زندگی کا آغاز کہاں سے ہوا؟ آخر کار ہم کہاں جائیں گے؟ اور اب (یعنی اس جہان میں) ہمارے کیا فرائض ہیں؟

ہماری روح کا جذبہ تجسس ہمیں کہتا ہے کہ:

ان سوالات کے جواب تلاش کیے بغیر چین و آرام سے نہیں بیٹھنا۔ مثال کے طور پر اگر کار کے کسی حادثے میں کوئی شخص زخمی اور بے ہوش ہو جائے اور اسے علاج و معالجہ کے لیے ہسپتال لے جایا جائے گا تو جب بھی اس کی طبیعت کچھ بہتر ہوگی اور اسے ہوش آئے گا تو اس کا سب سے پہلا سوال اپنے اردگرد موجود لوگوں سے یہی ہوگا کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ اور میں یہاں سے کب واپس جاؤں گا؟

اس مثال سے ظاہر ہے کہ انسان کے ذہن میں اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور وہ ان کا جواب حاصل کرنے کا خواہش مند رہتا ہے لہٰذا پہلی چیز جو ہمیں خدا کی تلاش اور کائنات کے پیدا کرنے والے کی معرفت حاصل کرنے کے لیے ابھارتی ہے وہ ہماری روح کی تشنگی اور جستجو کا جذبہ ہے۔

## شکر گزاری کا احساس

فرض کیجیے آپ کو ایک دعوت میں مدعو کیا جاتا ہے اور آپ کی پذیرائی کے لیے شاندار اہتمام کیا جاتا ہے لیکن چونکہ آپ کو آپ کے بڑے بھائی کے توسط سے مدعو کیا گیا ہے لہٰذا آپ میزبان سے واقف نہیں ہیں۔ اس شایانِ شان اور دل پذیر محفل میں آنے کے بعد یقیناً آپ کی اولین خواہش یہی ہوگی کہ آپ اپنے میزبان سے واقفیت حاصل کریں، تاکہ اس کا شکریہ ادا کر سکیں۔

ہم بھی جب اس وسیع و عریض کائنات پر نظر ڈالتے ہیں اور خالق کائنات کی عطا کردہ انواع و اقسام کی نعمتوں کو دیکھتے ہیں مثلاً دیکھنے کے لیے آنکھیں، سننے کے

لیے کان، سوچنے کے لیے عقل و شعور، مختلف قسم کی جسمانی و ذہنی طاقتیں اور صلاحیتیں، زندگی کی بے شمار سہولتیں اور آسائشیں اور پاک و پاکیزہ روزی تو بے اختیار یہ خیال آتا ہے کہ ان تمام نعمتوں کے عطا کرنے والے کو پہچانیں کہ وہ کون ہے؟ اگرچہ اسے ہمارے شکریہ کی ضرورت نہیں مگر ہم چاہتے ہیں کہ اس کا شکریہ ادا کریں اور جب تک ہم اس کام کو نہیں بجالاتے ہمیں بے چینی کا احساس رہتا ہے اور یہی امر ایک واضح دلیل ہے کہ جو ہمیں خدا کی معرفت حاصل کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

## خدا کی معرفت سے ہمارے نفع ونقصان کا تعلق

فرض کیجیے آپ دورانِ سفر ایک ایسے چوراہے پر پہنچتے ہیں کہ جہاں پر بہت ہنگامہ اور فساد برپا ہے۔ وہاں موجود تمام لوگ آپ سے کہتے ہیں کہ اس چوراہے پر نہ رُکیے، یہاں پر رُکنا خطرناک ہے لیکن ہر گروہ آپ کو ایک الگ سمت جانے کا مشورہ دیتا ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ بہتر ہوگا آپ مشرقی راستے سے جائیں۔ دوسرا مغربی راستے کو محفوظ راستہ بتاتا ہے جبکہ تیسرا گروہ ان دونوں کے درمیانی راستے کو محفوظ ترین راستہ قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ خطرے سے بچنے اور پُرامن مقام تک پہنچنے کا واحد ذریعہ کہ جہاں تمام اسباب سعادت مہیا ہوں یہی راستہ ہے۔

کیا ہم غور و فکر کیے بغیر کسی ایک راستے کا انتخاب کرلیں گے؟ کیا ہماری عقل اس بات کی اجازت دے گی کہ ہم وہیں پر رُک جائیں اور کسی بھی راستے کا انتخاب نہ کریں؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا۔

بلکہ ہماری عقل ہمیں اس بات پر آمادہ کرے گی کہ ہم فوراً حالات کا جائزہ لیں اور ہر گروہ کی بات غور سے سنیں اور ان میں سے جس گروہ کی بات صحیح، صداقت پر مبنی اور قانع کرنے والی دلیل کے ساتھ ہو اس کو مان لیں اور پھر پورا اطمینان حاصل کرنے کے بعد ایک راستے کو انتخاب کر کے آگے بڑھ جائیں۔

اس دنیاوی زندگی میں بھی ہمیں ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مذاہب اور مکاتبِ فکر ہمیں اپنی طرف دعوت دیتے ہیں لیکن چونکہ ہمارا مستقبل، ہماری نیک بختی اور بدبختی اور ہماری ترقی اور ہماری پستی کا دارومدار بہترین اور صحیح راہ کے انتخاب کرنے پر ہے، لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے بارے میں غوروفکر سے کام لیں اور ایک ایسی راہ کا انتخاب کریں جو ہماری ترقی اور تکامل کا باعث ہو اور ایسی راہ سے اجتناب کریں جو ہمارے لیے بدبختی اور تنزلی کا سبب بن رہی ہو۔

یہ امر بھی ایک بہترین دلیل ہے جو ہمیں اس کائنات کے خالق کے بارے میں غوروفکر کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

خداوند متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے:

فَبَشِّرْ عِبَادِ ○ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ

"پس میرے بندوں کو بشارت دے دو (یہ) وہ لوگ ہیں جو باتوں کو (غور سے) سنتے ہیں اور ان میں سے سب سے اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں"۔ (سورۂ زمر: آیت ۱۷-۱۸)

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ اب تک آپ نے خدا کی معرفت کے بارے میں جو کچھ اپنے والدین سے سنا ہے کیا اس کے علاوہ کبھی آپ نے خود بھی اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کیا ہے؟

۲ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ خدا کی تلاش اور خدا کی معرفت میں کیا فرق ہے؟

۳ کیا آپ نے خدا سے راز و نیاز کے وقت ایک خاص قسم کا کیف اور روحانی لذت محسوس کی ہے؟

maablib.org

## دوسرا سبق

# ہماری روزمرہ زندگی میں خدا کے وجود کی نشانیاں

### خدا کی معرفت اور علوم کی ترقی

فرض کیجیے آپ کا ایک دوست سفر سے واپس آتا ہے اور آپ کے لیے ایک کتاب بطور تحفہ لاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کتاب نہایت اعلیٰ درجے کی تحریر ہے کیونکہ اس کا مصنف بہت بڑا عالم، صاحب مطالعہ، باریک بین، ماہر اور اپنے فن میں نابغہ اور کامل استاد ہے۔ یقیناً آپ اس کتاب کا سرسری مطالعہ نہیں کریں گے بلکہ اس کی ہر ہر سطر یہاں تک کہ اس کا ہر ہر لفظ نہایت غور سے پڑھیں گے اور اگر اس کا کوئی لفظ یا جملہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا تو گھنٹوں بلکہ اگر موقع ملے تو کئی دن تک اس کے بارے میں غور وفکر کریں گے تاکہ اُس کا معنی و مفہوم آپ کی سمجھ میں آجائے کیونکہ اس کتاب کا مصنف کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ ایک عظیم دانشور ہے کہ جس کا لکھا ہوا ایک جملہ بھی بے معنی نہیں ہوگا۔

لیکن اس کے برعکس اگر کہا جائے کہ یہ کتاب اگرچہ بظاہر بہت پرکشش اور جاذب نظر آتی ہے لیکن اس کے مصنف کی علمی استعداد کم ہے اور وہ کوئی اعلیٰ علمی مقام نہیں رکھتا اور اس کی تصنیف میں بھی کوئی جان نہیں ہے تو ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ آپ کتاب پر فقط سرسری نظر ڈالیں گے اور جہاں پر بھی مفہوم واضح نہیں ہوگا آپ اسے مصنف کی کم علمی کا سبب قرار دیں گے اور اس کتاب کے مطالعہ کو وقت کا ضائع قرار دیں گے۔ یہ کائنات بھی ایک بڑی کتاب کی طرح ہے اور اس کائنات کا

ہر ہر موجود اس عظیم کتاب کے ایک کلمہ یا جملہ کو تشکیل دیتا ہے۔ ایک خدا پرست انسان کے نقطۂ نظر سے اس جہان کا ذرہ ذرہ ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ ایک باایمان انسان خدا پرستی کے نُور کی نورانیت میں تخلیق کے اَسرار و رموز کو سمجھنے کے لیے خاص جستجو کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے (اور یہی چیز سائنس اور انسانی علوم کی ترقی میں مددگار ثابت ہوتی ہے) کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس مشینری کا خالق لامتناہی علم و قدرت کا مالک ہے اور اس کے ہر ہر کام میں حکمت و فلسفہ مضمر ہے۔ اسی لیے وہ بہت باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے اور نہایت گہرائی کے ساتھ غور وفکر کرتا ہے تاکہ قدرت کے اَسرار و رموز کو بہتر طریقے سے سمجھ سکے۔

لیکن ایک عام مادہ پرست انسان میں تخلیق کے اَسرار و رُموز کو سمجھنے اور اس کا مطالعہ کرنے کا جذبہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ ان چیزوں کا خالق ''بے حس و حرکت مادہ'' کو سمجھتا ہے اور اگر ہمیں سائنسی علوم کے انکشاف کرنے والے دانش وروں کی صف میں بعض مادہ پرست دکھائی دیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ غالباً وہ خدا کے تو قائل ہیں البتہ اس کا نام انھوں نے مادہ رکھ دیا ہے کیونکہ مادہ کے کاموں میں وہ نظم وضبط اور منصوبہ بندی کے قائل ہیں۔

مختصر یہ کہ خدا کی پرستش ہی علوم و دانش کی ترقی کا سبب بنتی ہے۔

## خدا کی معرفت، تلاش اور اُمید

جب انسان سخت مصیبتوں اور پریشانیوں میں گرفتار ہوجاتا ہے اور رہائی کے سارے راستے مسدود ہوجاتے ہیں اور ان مشکلات کے مقابلے میں وہ اپنی ناتوانی اور بے بسی کا احساس کرتا ہے تو ایسے مواقع پر صرف خدا پر ایمان اس کی مدد کرتا ہے اور اسے ان مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے قوت مہیا کرتا ہے۔

جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں • تو وہ خود کو تنہا ا بے سہارا محسوس کرتے

ہیں اور نہ ہی وہ مایوسی اور نااُمیدی کا شکار ہوتے ہیں۔ انھیں کبھی بے بسی اور ناتوانی کا احساس نہیں ہوتا، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ خدا کی قدرت تمام مشکلات پر غالب ہے اور اس کی قدرت کے سامنے سب مشکلات آسان اور سہل ہو جاتی ہیں۔

خدا پر ایمان رکھنے والے اپنے پروردگار کی حمایت، لطف اور مہربانی کی اُمید کے ساتھ، مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اپنی تمام طاقتوں کو بروئے کار لاکر اور خدا سے اُمید لگا کر اپنی کوشش کو جاری رکھتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ مصائب اور سختیوں کے مقابلہ میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

جی ہاں!

خدا پر ایمان ـــــ انسانوں کی سب سے بڑی تکیہ گاہ ہے۔

خدا پر ایمان ـــــ استقامت اور ثابت قدمی کا سرمایہ ہوتا ہے۔

خدا پر ایمان دلوں کو ہمیشہ اُمید کے نُور سے منور رکھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ باایمان افراد کبھی خودکشی کے مرتکب نہیں ہوتے، کیونکہ خودکشی مایوسی و نااُمیدی اور شکست کی دلیل ہے لیکن باایمان لوگ نہ تو نااُمیدی کا شکار ہوتے ہیں اور نہ شکست کا احساس کرتے ہیں۔

## خدا کی معرفت اور ذمہ داری کا احساس

ہم بہت سے ایسے طبیبوں کو جانتے ہیں کہ جب ان کے پاس کوئی تنگ دست مریض آتا ہے تو نا صرف یہ کہ وہ اپنی فیس نہیں لیتے بلکہ اس کو دوا کے لیے پیسے بھی دیتے ہیں اور اگر مریض کی حالت نازک ہو تو اس کے چھوٹے سے مکان میں رات بھر اس کے سرہانے بھی بیٹھے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ ہی خداپرست اور باایمان ہوتے ہیں۔

لیکن ہم ایسے طبیبوں کو بھی جانتے ہیں کہ جو پیسے لیے بغیر بیمار پر ایک نظر

ڈالنا بھی پسند نہیں کرتے کیونکہ ان کا ایمان پختہ نہیں ہوتا۔

باایمان خواہ کسی بھی پیشہ سے منسلک ہو اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہے۔ وہ فرض شناس، نیک اور عفو و درگزر کرنے والا ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ اس کے جسم و جان میں ایک نگران موجود ہے کہ جو ہر وقت اس کے کاموں کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔

اس کے برعکس بے ایمان افراد خود پسند، خودغرض اور خطرناک ہوتے ہیں اور وہ اپنے لیے کسی بھی قسم کی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتے۔ ظلم وستم اور دوسروں کی حق تلفی کرنا ان کے لیے معمولی بات ہے اور وہ نیکی کے کام کرنے کے لیے بھی بہت ہی کم آمادہ ہوتے ہیں۔

## خدا کی معرفت اور سکونِ قلب

علمِ نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ موجودہ زمانے میں نفسیاتی بیماریاں اور ذہنی پریشانیاں پہلے کی نسبت بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ اور ان کا کہنا ہے کہ ان بیماریوں کا ایک سبب تشویش اور پریشانی ہے، یعنی مستقبل کی فکر، موت کا خوف، جنگ کا ڈر، فقر اور شکست کی تشویش!

وہ کہتے ہیں کہ انسان کی روح کو ان تمام پریشانیوں اور فکروں سے ''خدا پر ایمان'' کے ذریعے محفوظ کیا جا سکتا ہے کیونکہ جب بھی پریشانیاں اور فاسد فکریں پیدا کرنے والے عوامل اس کی روح میں اثر انداز ہونا چاہیں تو ''خدا پر ایمان'' انھیں اثر انداز ہونے سے روک دیتا ہے۔

وہ خدا کہ جو مہربان ہے! وہ خدا کہ جو روزی عطا کرتا ہے! وہ خدا کہ جو اپنے بندوں کے حالات سے بخوبی آگاہ ہے اور جب بھی اس کے بندے اس سے لَو لگاتے ہیں تو وہ ان کو کبھی مایوس نہیں کرتا اور ان کو پریشانیوں سے نجات دلاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سچے مومن ہمیشہ سکون و اطمینان کا احساس کرتے ہیں اور انھیں کبھی کوئی ذہنی پریشانی لاحق نہیں ہوتی، کیونکہ ان کا ہر کام خدا کے لیے ہوتا ہے اور اگر انھیں کوئی نقصان بھی پہنچ جائے تو اس کی تلافی کے لیے بھی وہ اسی کا آسرا تلاش کرتے ہیں یہاں تک کہ میدانِ جنگ میں بھی ان کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھری رہتی ہے۔

قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ (سورۂ انعام، آیت ۸۲)

"وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا، سکون اور امن انھی کے لیے ہے"۔

maablib.org

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ آپ کو کوئی ایسا تاریخی واقعہ یاد ہے کہ جس کے ذریعے مذکورہ ایمان افروز باتوں پر مزید روشنی ڈالی جاسکے؟

۲ کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ وہ لوگ جو خدا پر ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود غیر اخلاقی حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں ان میں مذکورہ چار خصوصیات کیوں نہیں پائی جاتیں؟

maablib.org

تیسرا سبق

# خدا کو معرفت کے لیے دو اطمینان بخش راستے

خدا کی معرفت کے موضوع پر قدیم زمانے سے آج تک متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور صاحبانِ علم وغیر علم کے درمیان بہت سی گفتگو اور بحث ہوئی ہے۔
ہر ایک نے اس حقیقت کو جاننے کے لیے مخصوص راستہ اختیار کیا ہے لیکن ان تمام راستوں میں سے بہترین راستے کہ جن کے ذریعے کائنات کے عظیم خالق کی معرفت جلدی حاصل کی جا سکتی ہے وہ دو ہیں:

① اندرونی راستہ (سب سے قریبی راستہ)

② بیرونی راستہ (سب سے واضح راستہ)

اندرونی راستے میں ہم اپنے وجود کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھتے ہیں اور اپنی روح و جان کی گہرائیوں میں توحید کی آواز کو سنتے ہیں۔
اور بیرونی راستہ میں جب ہم اس وسیع و عریض کائنات کی مخلوق پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں تمام موجودات کی پیشانی پر اور ہر ذرہ کے دل میں خدا کی نشانیوں کے جلوے نظر آتے ہیں۔
چونکہ ان دونوں راستوں سے متعلق گفتگو بہت طولانی ہے، لہٰذا ہم ایک مختصر بحث کے ذریعے ان دونوں راستوں کا اجمالی جائزہ لیتے ہیں:

اَ: اندرونی راستہ

ہمیں چاہیے ان چند اُمور پر صحیح معنوں میں غور وفکر کریں:

① دانش وروں کا کہنا ہے کہ جس انسان کے بارے میں توجہ کریں خواہ وہ کسی نسل یا کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو اگر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور کوئی مخصوص تعلیم نہ دی جائے یہاں تک کہ اس نے نہ تو خدا پرستوں کی بات سنی ہو اور نہ مادہ پرستوں کی، پھر بھی وہ خودبخود ایک توانا اور صاحب قدرت طاقت کا احساس کرے گا جو اس مادی دنیا سے بالاتر ہے اور ساری کائنات پر حاکم ہے۔

وہ اپنی جان و روح کی گہرائیوں اور قلب کے تمام گوشوں میں محسوس کرے گا کہ ایک لطیف و مہربان آواز جو نہایت واضح اور محکم بھی ہے، اسے علم و قدرت کے ایک عظیم مبدا کی جانب کہ جسے ہم خدا کہتے ہیں بلا رہی ہے۔ یہ اسی انسانی فطرت کی پاک و پاکیزہ آواز ہے۔

② ممکن ہے انسان مادی دنیا کی ہنگامہ آرائیوں اور زندگی کی چمک دمک میں اتنا مگن ہو جائے کہ وقتی طور پر اس آواز کو سننے سے غافل ہو جائے لیکن جس وقت وہ اپنے آپ کو مشکلات اور پریشانیوں میں گھرا ہوا پاتا ہے، جس وقت آفات ارضی و سماوی مثلاً سیلاب، زلزلے اور طوفان یا جب خطرناک اور ناسازگار موسم میں اس کا ہوائی جہاز گھر جاتا ہے اور اضطرابی لمحات اس پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ہاں ایسے وقت میں کہ جب مشکلات پر قابو پانے کے لیے تمام مادی وسائل کے راستے بند ہو جاتے ہیں اور کوئی جائے پناہ نظر نہیں آتی تو اس وقت اس کی روح کی گہرائیوں میں یہ آواز ابھرتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے وجود کے اندر سے ایک خاص قسم کی قدرت اسے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ ایک ایسی قدرت جو کہ تمام طاقتوں سے برتر ہے۔ ایک پوشیدہ طاقت کہ جس کے سامنے تمام مشکلات بہت آسان و سہل ہیں۔ آپ کو ایسے لوگ بہت ہی کم ملیں گے کہ جنھیں زندگی کے کٹھن وقت میں ایسی توجہ حاصل نہ ہو اور بے اختیار خدا کی یاد نہ آئے۔ یہ چیز اس امر کی

نشان دہی کرتی ہے کہ ہم اس کے اور وہ ہمارے کس قدر نزدیک ہے۔ وہ تو ہماری جان و روح میں موجود ہے۔

فطرت کی یہ آواز انسانی روح میں ہمیشہ رہتی ہے البتہ ایسے لمحات میں زیادہ شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

③ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایسے طاقت ور افراد جو عام حالات اور عیش و آرام کے وقت خدا کا نام تک لینا گوارا نہیں کرتے لیکن جب ان کی طاقت کی بنیادیں متزلزل ہونے لگتی ہیں اور موت سامنے منڈلانے لگتی ہے تو اس وقت عظیم خالق کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں اور فطرت کی آواز انھیں اچھی طرح سنائی دینے لگتی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب فرعون نے اپنی کشتیٔ حیات کو دریا کی بپھری ہوئی موجوں میں گھرا ہوا پایا اور دیکھا کہ وہی پانی جو اس کی زندگی اور اس کے زیر تسلط ملک کی آبادی کا سرمایہ اور اس کی مادی زندگی کی تمام طاقتوں کا سرچشمہ تھا اب اس کے سامنے موت کا پیام بن کر آیا ہے اور چھوٹی چھوٹی لہروں نے اس کو مجبور و لاچار کر دیا ہے اور ہر طرف سے نجات کی اُمید منقطع ہو چکی ہے تو اس نے بآواز بلند کہا: (اب میں اعتراف کرتا ہوں کہ موسیٰ کے بزرگ و برتر خدا کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں)۔ دراصل یہ آواز اس کی فطرت اور روح کے اندر سے اُبھری تھی۔ نہ صرف فرعون بلکہ اس جیسے دوسرے لوگ بھی اس آواز کو سنتے ہیں۔

④ آپ بھی جب اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھیں تو آپ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس میں ایک ایسا نُور چمک رہا ہے جو آپ کو خدا کی جانب بلا رہا ہے۔ شاید آپ کی زندگی میں بارہا ایسے سخت اور مشکل مواقع آئے ہوں گے جب مشکلات سے نجات حاصل کرنے کے لیے تمام مادی وسائل کے

راستے بند ہو گئے ہوں گے۔ ان لمحات میں یقیناً آپ کو اس حقیقت کا احساس ہوا ہوگا کہ اس عالمِ ہستی میں ایک ایسی قادرِ مطلق طاقت موجود ہے جو ان مشکلات کو آسانی سے حل کر سکتی ہے۔

ایسے لمحات میں اس خالق کے عشق سے لبریز اُمید کی ایک کرن نظر آتی ہے جو مایوسی و نااُمیدی کے تیرہ و تاریک بادلوں کو آپ کے دل سے صاف کر دیتی ہے۔

جی ہاں! یہ نزدیک ترین راستہ ہے کہ ہر شخص اپنی روح کی گہرائیوں سے اس کائنات کے سب سے بڑے خالق تک پہنچ سکتا ہے۔

صرف ایک سوال ممکن ہے کہ آپ میں سے کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ آیا اس بات کا امکان نہیں ہے کہ ہم نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے اور ماں باپ سے ہمیں جو تعلیم ملی ہے اسی کے زیرِ اثر حساس مواقع پر ہمارے دل میں یہ خیال آتا ہے اور خدا کے آگے دستِ حاجت دراز کرتے ہیں؟

آپ کو یہ سوال کرنے کا حق ہے مگر ہمارے پاس اس کا دلیل کے ساتھ اور دلچسپ جواب بھی موجود ہے جسے ہم آیندہ سبق میں پیش کریں گے۔

قرآنِ مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ (سورۂ عنکبوت: آیت ۶۵)

"پس جب وہ کشتی پر سوار ہوں (اور طوفانی موجوں سے موت کا ڈر پیدا ہو تو) اللہ کو اخلاص سے پکارتے ہیں۔ پس جب اللہ انھیں (ساحل کی) خشکی کی طرف نجات دیتا ہے (تو) وہ (اسے بھول کر) شرک کرنے لگ جاتے ہیں"۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

١ مندرجہ بالا آیت کو اس کے ترجمہ، آیت نمبر اور سورہ کے نام سمیت یاد کرنے کی کوشش کریں، تاکہ بتدریج قرآن سے آشنائی حاصل ہو سکے۔

٢ کبھی آپ کی زندگی میں ایسا کوئی حادثہ رُونما ہوا ہے کہ جب آپ کی اُمید ہر طرف سے منقطع ہو چکی ہو اور صرف خدا کے لطف و کرم کا آسرا باقی رہ گیا ہو؟ (ایک مختصر تقریر یا مضمون اس موضوع پر تیار کریں)

٣ اس راستے کو نزدیک ترین راستہ کیوں کہا گیا ہے؟

## چوتھا سبق

# ایک اہم سوال کا جواب

**سوال:** گذشتہ اسباق میں ہماری گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ توحید اور خدا کی پرستش کی ایک آواز ہم ہمیشہ اپنے دل و روح کی گہرائیوں سے سنتے ہیں، خاص طور پر مشکلات اور پریشانیوں کے وقت یہ آواز موثر اور قوی ہو جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر ہمیں بے اختیار خدا کی یاد آتی ہے اور ہم اس کی لازوال طاقت اور اَبدی لطف و کرم سے مدد مانگتے ہیں۔

یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اندرونی آواز کہ جسے ہم ایک فطری آواز بھی کہہ سکتے ہیں ممکن ہے کہ یہ ہمیں اپنے معاشرے، اپنے اسکول کے ماحول اور اپنے ماں باپ کی تعلیم و تربیت کے اثرات کی وجہ سے سنائی دیتی ہو؟ اور ہمیں اس کی عادت پڑ گئی ہو؟

**جواب:** اس شک و شبہہ کا جواب ہم ایک مختصر سی تمہید سے واضح کرتے ہیں۔ عادات و رسومات غیر پائیدار چیزیں ہیں اور ان میں تغیر و تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ یعنی کوئی بھی عادت اور رسم و رواج جو کہ پوری انسانی تاریخ میں تمام اقوام کے درمیان ایک ہی شکل میں اور ایک ہی حالت میں باقی رہ گئی ہوں، ہمیں نظر نہیں آتیں۔ اگر کہیں آج کوئی عادت یا رسم رائج ہے تو ممکن ہے کل اس میں

تبدیلی پیدا ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک قوم کی عادات و رسومات ممکن ہے دوسری اقوام میں نہ پائی جائیں۔

اسی بنا پر اگر ہم دیکھیں کہ کوئی رسم یا عادت بلا امتیاز ہر قوم و ملت اور ہر دور میں رہی ہے تو وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کی جڑیں فطری اور انسان کی جان و روح میں مضبوطی سے پیوست ہیں مثلاً اولاد سے ماں کی محبت کسی نصیحت و تبلیغ یا عادت اور رسم کی بنا پر نہیں ہوتی کیونکہ کسی قوم اور ملت میں کسی بھی زمانے میں یہ بات نہیں دیکھی گئی کہ کوئی ماں اپنی اولاد سے محبت نہ کرتی ہو اور اس پر مہربان نہ ہو۔

البتہ اس بات کا امکان ہے کہ کسی نفسیاتی مرض کی وجہ سے ماں کی محبت زائل ہو جائے یا زمانہ جاہلیت میں غلط اور خرافات پر مبنی افکار کے زیر اثر بعض باپ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے لیکن ایسے حالات شاذ و نادر اور وقتی ہوتے ہیں جو بہت سرعت سے ختم ہو جاتے ہیں اور اپنی اصلی حالت یعنی اولاد سے محبت کی شکل میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

اس تمہید کی روشنی میں گذشتہ اور موجودہ زمانے کے انسانوں میں خدا کی پرستش پر نظر ڈالتے ہیں (چونکہ یہ بحث کچھ پیچیدہ ہے لہٰذا زیادہ توجہ اور دقت کی ضرورت ہے):

(۱) سماجی اُمور کے ماہرین اور نامور مؤرخین کی تصدیق کے مطابق ہم کسی بھی دور اور کسی بھی زمانے میں نہیں پائیں گے کہ انسانوں کے درمیان مذہب اور مذہبی رجحان کا وجود نہ رہا ہو بلکہ ہر دور اور زمانے میں دنیا کے ہر گوشے میں کسی نہ کسی شکل میں مذہب کا وجود رہا ہے۔

یہ چیز بذاتِ خود اس بات کی روشن دلیل ہے کہ خدا کی پرستش کا تعلق انسان کی فطرت اور روح کے ساتھ ہے نہ کہ نصیحت، رسم و رواج یا عادت کا نتیجہ ہے کیونکہ

اگر یہ محض رسم و رواج یا نصیحت و تبلیغ کا نتیجہ ہوتی تو اس قدر عام اور جاودانی شکل میں نظر نہ آتی۔

ہمارے پاس ایسے قرائن بھی موجود ہیں کہ جن سے پتا چلتا ہے کہ قبل از تاریخ کے دور میں جو قومیں موجود تھیں وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں ایک مذہب کی پیرو تھیں (قبل از تاریخ کا دور اس زمانے کو کہتے ہیں کہ جب رسم الخط ایجاد نہیں ہوا تھا جس کی وجہ سے انسان اپنی یادگاروں کو تحریری شکل میں محفوظ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا)۔

البتہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ چونکہ ابتدائی اقوام نے خدا کو ایک مافوق الفطرت ہستی کے طور پر نہیں پہچانا تھا اور فطری موجودات ومخلوقات میں اس کو تلاش کیا تھا لہٰذا خدا کی تخلیق کردہ مخلوقات میں سے ہی انھوں نے اپنے لیے کچھ بت بطور معبود بنا لیے تھے لیکن انسان نے اپنے ذہنی ارتقا کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ حق کو پہچاننا شروع کیا اور مادی چیزوں نے اپنے لیے جو بت تراش لیے تھے ان سے کنارہ کشی اختیار کر کے اس جہانِ مادی سے ماورا خداوند بزرگ و برتر کی قدرت و طاقت سے آشنا ہوا۔

۲ کچھ بڑے نامور ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ آدمی کی روح میں دراصل چار قسم کی حس پائی جاتی ہے:

۱ سمجھنے کی حس: جو انسان کو علم و دانش کے حصول کے لیے آمادہ کرتی ہے اور اس کی روح میں علم کی پیاس پیدا کرتی ہے، خواہ اس علم میں مادی فائدہ ہو یا نہ ہو۔

۲ نیکی کی حس: یہ انسان میں اخلاق و انسانیت کا سرچشمہ ہے۔

۳ ذوق لطیف کی حس: جس کے ذریعے شعر و ادب اور فنون وجود میں آتے ہیں۔

۴ مذہبی حس: جو انسان کو خدا کی معرفت اور اس کے احکام کو انجام دینے

کی دعوت دیتی ہے۔ اور یہ بات ہمارے مشاہدے میں ہے کہ مذہبی حس انسانی روح کی اصلی و بنیادی حس ہے، یعنی کبھی اس سے الگ تھی اور نہ کبھی الگ ہوگی۔

۳ آیندہ ابحاث میں ہم پڑھیں گے کہ خدا کے وجود کا انکار کرنے والے بہت سے مادہ پرست بھی خدا کے وجود کا کسی نہ کسی شکل میں اعتراف کرتے ہیں۔ اگرچہ زبان سے اقرار نہیں کرتے لیکن اسے طبیعت یا دوسرے ناموں سے ضرور پکارتے ہیں اور طبیعت کے لیے ایسی صفات کے قائل ہوتے ہیں جو صفات خدا میں پائی جاتی ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ طبیعت نے انسان کو دو گردے اس لیے دیے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک گردہ کام کرنا بند کردے تو دوسرا گردہ زندگی کی مشینری کو جاری رکھے اور اسی طرح کی دیگر بہت سی باتیں۔

لیکن کیا بے شعور طبیعت یا مادہ کے بس کی یہ بات ہوسکتی ہے؟ کیا یہ اسی خداوند کی طرف اشارہ نہیں ہے کہ جس کا علم و قدرت لازوال ہے اگرچہ اس کا نام انھوں نے طبیعت رکھ دیا ہے۔

## نتیجۂ بحث

خدا سے عشق ہمیشہ سے ہماری روح میں تھا اور رہے گا۔ خدا پر ایمان ایک ایسا جاودانی شعلہ ہے جو ہمارے قلب و روح کو گرم رکھتا ہے۔

خدا کو پہچاننے کے لیے ہمیں طویل راستے طے کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اگر ہم اپنے وجود کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھیں تو اس میں ایمان کی چنگاریاں نظر آتی ہیں۔ قرآن مجید میں خداوند متعال فرماتا ہے:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (سورۂ ق: آیت ۱۶)

"ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں"۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ انسانی عادت اور انسانی فطرت کے متعلق چند مثالیں پیش کریں؟

۲ نادان لوگ بت پرستی کیوں کیا کرتے تھے؟

۳ مادہ پرستوں نے خدا کا نام طبیعت (مادہ) کیوں رکھ دیا ہے؟

maablib.org

## پانچواں سبق

# ایک سچا واقعہ

ہم نے کہا تھا کہ جو لوگ زبان سے خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں دراصل اُن کی روح کی گہرائیوں میں خدا پر ایمان کا جذبہ مضمر ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بہت سی کامیابیاں اکثر غرور پیدا کردیتی ہیں خصوصاً یہ چیز کم ظرف لوگوں میں زیادہ دیکھی جاسکتی ہے اور یہی غرور انھیں یادِ خدا سے غافل کردیتا ہے، حتیٰ کہ کبھی کبھی انسان خود اپنے فطری تقاضے بھی فراموش کردیتا ہے لیکن جس وقت طوفان کے تھپیڑے اس کی زندگی کو درہم برہم کردیتے ہیں اور مشکلات کی تند و تیز آندھیاں چاروں طرف سے اسے گھیر لیتی ہیں تو غرور اور خود پسندی کے سارے پردے اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں اور خدا کی وحدانیت اور خدا کی معرفت کا جذبہ اس کی جگہ لے لیتا ہے۔

انسانی تاریخ میں اس قسم کے افراد کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک داستان پیش کی جاتی ہے: کسی زمانے میں ایک بہت طاقت ور وزیر گزرا جس نے اپنے زمانے میں بہت اثر و رسوخ حاصل کرلیا تھا اور کسی کو اس کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ تھی۔ ایک دن کسی محفل میں کچھ مذہبی علماء بیٹھے ہوئے تھے کہ وہ وزیر وہاں آگیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ تم لوگ کب تک یہ کہتے رہو گے کہ دنیا کا کوئی خدا ہے؟ میرے پاس اس کی نفی کے لیے ہزاروں دلیلیں موجود ہیں۔

اس نے یہ جملہ بڑے غرور و نخوت کے ساتھ کہا تھا۔ اس محفل میں موجود علما

جانتے تھے کہ وہ منطق و استدلال سے بے بہرہ ہے اور طاقت و اثر و رسوخ نے اسے اتنا مغرور بنا دیا ہے کہ کوئی بھی حق بات اس پر اثر نہیں کرے گی لہٰذا بے اعتنائی کے ساتھ اس کی اس بات پر خاموش رہے لیکن علماء کی یہ خاموشی با معنی اور تحقیر آمیز تھی۔ اس واقعہ کے چند روز بعد وزیر پر کچھ الزامات عائد ہوئے اور حکومت وقت نے اس کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔

اس روز کی محفل میں موجود علماء میں سے ایک نے سوچا کہ اس وزیر کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ اب چونکہ اس کا غرور ٹوٹ چکا ہے اور خودغرضی اور تکبر کے تمام پردے اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئے ہیں لہٰذا حق کو قبول کرنے کی حس اس میں بیدار ہو گئی ہو گی۔ چنانچہ اگر اس وقت اسے نصیحت کی جائے تو سودمند ثابت ہو گی۔ چنانچہ وہ عالم ملاقات کی اجازت لے کر وزیر سے ملنے کے لیے قید خانہ میں آیا۔ جب عالم اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سلاخوں کے پیچھے کمرے میں تنہا وزیر ٹہل رہا ہے اور زیر لب کچھ اشعار گنگنا رہا ہے۔ اس نے غور سے سنا تو وزیر یہ مشہور اشعار پڑھ رہا تھا ۔

ما همه شیران ولی شیر علم
حمله مان از باد باشد دم به دم
حمله من پیدا و ناپیدا است باد
جان فدای آن که ناپید است باد

"یعنی ہم ان شیروں کی تصویروں کی مانند ہیں کہ جنھیں پرچم بنا دیا گیا ہے۔ جس وقت ہوا چلتی ہے اور پرچموں میں حرکت پیدا ہوتی ہے تو گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر حملہ آور ہو رہے ہیں لیکن اصل میں خود ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے اور یہ

محض ہوا کی حرکت ہے جو ان کو طاقت عطا کرتی ہے۔ ہم خواہ
کتنے ہی طاقت ور کیوں نہ ہو جائیں۔ ہماری اپنی کوئی حیثیت
نہیں ہے وہ خدا جس نے ہمیں یہ طاقت عطا کی ہے جب بھی
چاہے اسے ہم سے چھین سکتا ہے"۔

عالم دین نے دیکھا کہ نہ صرف یہ کہ اب وزیر خدا کا منکر نہیں رہا بلکہ ایک پُرجوش خداشناس بن چکا ہے۔ فوراً اس کے پاس جا کر احوال پرسی کی اور کہا: کیا آپ کو یاد ہے کہ ایک روز آپ نے کہا تھا کہ خدا کے وجود کی نفی کے لیے میرے پاس ہزاروں دلیلیں موجود ہیں؟ اب میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ ان ہزاروں دلیلوں کا صرف ایک دلیل کے ساتھ جواب دوں اور وہ دلیل یہ ہے کہ خدا وہ ہستی ہے کہ جس نے اتنی آسانی کے ساتھ تم سے وہ عظیم الشان طاقت چھین لی ہے کہ جس پر تُو ناز کیا کرتا تھا۔ وزیر نے شرمندگی سے سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ وہ اپنی غلطی کا معترف ہو چکا تھا اور اپنی روح میں خدا کے نُور کا جلوہ دیکھ رہا تھا۔

قرآنِ مجید میں فرعون کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے:

حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدۡرَکَہُ الۡغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنۡتُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیۡۤ اٰمَنَتۡ بِہٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِیۡلَ (سورۂ یونس: آیت ۹۰)

"(فرعون خدا کا انکار کرتا رہا) یہاں تک کہ (دریا کی امواج میں) غرق ہونے کو تھا (تو اس وقت) کہا کہ میں ایمان لاتا ہوں کوئی معبود نہیں سوائے اس ذات کے کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے"۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ مختصراً بتائیں کہ اس سچی داستان سے آپ نے کیا نتیجہ حاصل کیا ہے؟

۲ بنی اسرائیل کو "بنی اسرائیل" کیوں کہتے ہیں؟

۳ فرعون کون تھا؟ کہاں کا رہنے والا تھا؟ اور اس نے کیا دعویٰ کیا تھا؟

maablib.org

چھٹا سبق

# خدا کی معرفت کے لیے دوسرا راستہ

## بیرونی راستہ

اگر ہم اس جہان پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو ہم پر یہ حقیقت آشکار ہوگی کہ کائنات کا نظام ہرگز درہم برہم نہیں ہے بلکہ تمام مظاہرِ قدرت اپنی معینہ راہ پر گامزن ہیں اور دنیا کی تمام مشینری ایک عظیم الشان لشکر کی مانند انتہائی منظم یونٹوں میں تقسیم ہوکر اپنے معین مقصد کی طرف حرکت میں مصروف ہے۔

اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کو درج ذیل نکات کے ذریعے برطرف کیا جاسکتا ہے:

① ہر زندہ مخلوق کے عالمِ وجود میں آنے اور باقی رہنے کے لیے کچھ خاص قوانین اور حالات کو ایک سلسلے کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہیے۔

مثلاً ایک درخت کے وجود میں آنے کے لیے زرخیز زمین، مناسب آب وہوا اور مخصوص درجۂ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان مخصوص شرائط کے مطابق بیج بویا جائے، وہ اپنی مخصوص غذا اور ہوا سے خوب فائدہ اُٹھائے، سبز ہوجائے اور خوب نشوونما کرے اور درخت کی نشوونما کے لیے ایک مخصوص ماحول اور زمین کا انتخاب کرنے اور دیگر ضروری چیزوں کی فراہمی کے لیے عقل اور علم کی ضرورت ہوتی ہے۔

② تمام موجودات اپنی مخصوص جداگانہ تاثیر رکھتے ہیں۔ آگ اور پانی کی اپنی الگ الگ خاصیت ہے، جس میں تبدیلی وتغیر ممکن نہیں ہے اور ہمیشہ ایک مقررہ

قانون کے مطابق وہ اپنا اپنا کام انجام دے رہے ہیں۔

(۳) زندہ موجودات کے تمام اعضا کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی منظم رابطہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر انسان کے جسم میں ایک پوری دنیا آباد ہے۔ آپریشن کے وقت انسانی بدن کے تمام اعضاء میں ارادی اور غیر ارادی طور پر ایک خاص قسم کی ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے، مثلاً اگر کوئی خطرہ درپیش ہے تو تمام اعضا اس کی مدافعت کے لیے آمادہ ہوجائیں گے۔ یہ قریبی تعلق اور آپس میں ہم آہنگی اور ارتباط، کائنات کے نظم وضبط کی ایک زندہ مثال ہے۔

(۴) نظام کائنات پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت آشکار ہوجاتی ہے کہ نہ صرف زندہ موجودات کے اعضا اور جسم میں بلکہ دنیا کی دوسری مخلوقات میں بھی آپس میں ایک قسم کا ارتباط اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے، مثلاً زندہ ومتحرک مخلوقات کی پرورش اور نشوونما کے لیے سورج اپنی حرارت اور روشنی پہنچاتا ہے، بادل پانی برساتے ہیں، ہوائیں چلتی ہیں اور زمینی ذخیرے بھی اس میں مدد کرتے ہیں۔ یہ چیزیں کائنات میں ایک معین نظام کے وجود کی نشان دہی کرتی ہیں۔

## عقل اور نظم وضبط میں رابطہ

ہم اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ کسی بھی مشینری کے نظم وضبط سے اس کے بنانے والے کی عقل وفہم، منصوبہ بندی اور اس کے مقاصد کی نشان دہی ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان جہاں بھی ایک مکمل نظم وضبط اور مستحکم قوانین کارفرما دیکھتا ہے تو جانتا ہے اس نظام کو خلق کرنے والی عالم وقادر ذات بھی ہے اور اس حقیقت کو درک کرنے پر اپنے اندر کسی دلیل کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

وہ جانتا ہے کہ کبھی ایک نابینا اور جاہل شخص ٹائپنگ مشین سے ایک خوب صورت تحریر یا ایک سماجی وتنقیدی مقالہ نہیں لکھ سکتا اور کبھی ایک دو سالہ بچے کے کاغذ پر

یونہی بے ترتیب قلم چلا دینے سے ایک خوب صورت پینٹنگ تیار نہیں کی جاسکتی بلکہ اگر ہم ایک دلکش تحریر یا اعلیٰ درجے کا مقالہ دیکھیں گے تو سمجھ جائیں گے کہ یہ کسی اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ دانش ور کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ یا اگر کسی عجائب گھر میں انتہائی خوب صورت پینٹنگ دیکھیں گے تو شک نہ کریں گے کہ یہ کسی ماہرِ فن، آرٹسٹ کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ اس مقالے کے مصنف یا پینٹنگ کے آرٹسٹ کو ہم نے دیکھا بھی نہ ہو۔

لہٰذا جہاں کہیں بھی کوئی منظم مشینری کارفرما ہوتی ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ عقل وفہم کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ جس قدر وہ مشینری بڑی ہوگی اسی کے مطابق وہ اتنی ہی پیچیدہ اور قابلِ قدر ہوگی اور اس کا ایجاد کرنے والا بھی اتنا ہی اعلیٰ درجے کی عقل وفراست کا مالک ہوگا۔

اس موضوع کو ثابت کرنے کے لیے کہ ہر منظم مشینری کو عقل وعلم کے مالک کی ضرورت ہوتی ہے۔ ریاضی کے حساب احتمالات Theory of Probability سے مدد لیں گے۔

اس علمِ ریاضی کی مدد سے یہ ثابت کرتے ہیں مثلاً:

ایک جاہل آدمی چاہے کہ ٹائپ کی مشین سے اتفاقیہ طور پر مشین کے بٹنوں کو دبا دبا کر ایک مقالہ یا اشعار کا ایک قطعہ ٹائپ کرے تو حساب احتمالات کے مطابق اس کو کروڑوں برس درکار ہوں گے یہاں تک کہ کرۂ زمین کی پوری عمر بھی اس کام کے لیے ناکافی ہوگی۔

مزید وضاحت اور تفصیلات کے لیے فارسی زبان میں تحریر کتب ''آفریدگار جہان'' اور ''در جستجوی خدا'' کی طرف رجوع فرمائیں۔

قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ

"عنقریب ہم انھیں اپنی نشانیاں آفاق عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی اپنی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر واضح ہوجائے گا کہ یقیناً وہی حق ہے۔ کیا آپ کے رب کا ہر چیز سے واقف وآگاہ ہونا کافی نہیں"۔ (سورۂ فصلت: آیت ۵۳)

maablib.org

## سوچیے اور جواب دیجیے

1. چند ایسی صنعتی مشینوں کے نام بتائیے کہ جن کو دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا بنانے والا ماہر اور ہوشیار ہے۔

2. آفاق اور اَنفس میں کیا فرق ہے؟ آفاق اور اَنفس میں خدا کی نشانیوں میں سے کچھ مثالیں پیش کیجیے۔

maablib.org

ساتواں سبق

# نظامِ کائنات سے چند مثالیں

کائنات کے ذرہ ذرہ سے نظم وضبط، منصوبہ بندی اور اس کی تخلیق کے مقصد کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے لیے ہم یہاں پر بطور مثال کچھ چھوٹے بڑے حقائق کا تذکرہ کرتے ہیں:

خوش قسمتی سے آج سائنسی علوم کی ترقی، عالمِ طبیعت کی نیرنگیوں، انسانوں، حیوانات اور نباتات کے وجود کے اندر چھپی ہزاروں باریکیوں کے اسرار ورموز کے منکشف ہوجانے، ایک ذرہ (cell) اور ایک ایٹم میں چھپی بے پناہ طاقت کا راز معلوم ہوجانے، نیز ستاروں کی حیرت انگیز دنیا کے نظام سے آشنا ہوجانے سے خدا کی معرفت کے دروازے ہم پر کھل گئے ہیں۔

بلاخوف وتردید کہا جاسکتا ہے کہ سائنسی علوم کی ساری کتابیں دراصل توحید اور خدا کی معرفت کی کتابیں ہیں کہ جو ہمیں پروردگار کی عظمت کا درس دیتی ہیں کیونکہ ان کتابوں میں اس کائنات کی مخلوقات کے دلکش نظام کے رازوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا کس قدر عالم و قادر ہے۔

## ہمارے جسم کی مملکت کا مرکز

ہماری کھوپڑی کے اندر خاکستری رنگ کا مادہ بھرا ہوا ہے جسے دماغ کہتے ہیں۔ یہ دماغ ہمارے جسم کی سب سے اہم اور پیچیدہ ترین مشینری کا کام دیتا ہے۔

یہی مشینری ہمارے پورے بدن کی طاقتوں کو کنٹرول کرتی ہے اور دیگر تمام مشینریوں کے نظام کو برقرار رکھتی ہے۔

اس عظیم مرکز کی اہمیت کا اندازہ درج ذیل ایک سچے واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے:

اخبارات میں آیا تھا کہ کار کے ایک حادثہ میں شیراز کے ایک نوجوان طالب علم کو خوزستان کے علاقے میں دماغ میں چوٹ لگ گئی۔ بظاہر اس کے جسم کے تمام أعضاء بالکل صحیح وسالم تھے لیکن دماغ پر چوٹ لگنے کے نتیجے میں حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ وہ اپنی تمام گذشتہ زندگی کو فراموش کر بیٹھا۔ اگرچہ اس کا دماغ صحیح طور پر کام کر رہا تھا اور وہ ہر بات کو سمجھتا بھی تھا مگر اپنے ماں باپ کو نہیں پہچانتا تھا۔ جب اس سے کہا جاتا کہ یہ تمہاری ماں ہے تو وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگتا۔ اسے شیراز میں اس کے گھر لے جایا گیا اور اسے اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی اشیاء جو کہ اس کے کمرے کی دیواروں پر آویزاں تھیں، دکھائی گئیں لیکن وہ سب چیزوں کو حیرت سے دیکھتا رہا اور کہتا رہا کہ میں ان سب چیزوں کو پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوں۔

معلوم یہ ہوا کہ دماغی چوٹ کی وجہ سے وہ خلیے (cells) بیکار ہو گئے تھے جو اس کے سوچنے سمجھنے کی طاقت اور اس کی یادداشت وحافظہ میں ارتباط پیدا کرنے والے تاروں کا کام انجام دے رہے تھے، اور جس طرح بجلی کا فیوز اُڑ جانے سے بجلی منقطع ہوجاتی ہے اور تاریکی چھا جاتی ہے اسی طرح سے اس کی یادداشت پر فراموشی کی تاریکی چھا گئی تھی۔

دماغ کا وہ ایک نقطہ جو معطل اور مفلوج ہو گیا تھا شاید سوئی کی نوک سے زیادہ بڑا نہ تھا لیکن اس نوجوان کی زندگی پر اس نے کتنا زبردست اثر چھوڑا تھا۔ اس واقعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہمارے دماغ کی مشینری کتنی پیچیدہ اور کتنی اہمیت کی حامل ہے۔

دماغ کے اعصابی نظام کا تعلق دو مختلف حصوں سے ہے:

① پہلا حصّہ جو ارادی نظام کو کنٹرول کرتا ہے یعنی ہمارے بدن کی تمام اختیاری حرکات مثلاً چلنا دیکھنا بولنا وغیرہ اسی کے تحت انجام پاتی ہیں۔

② دوسرا حصّہ غیر ارادی نظام یعنی دل اور معدہ کی حرکات اور اسی طرح کی مشینریوں کے نظام کو چلاتا ہے اور دماغ کے اس حصّے کے ایک گوشے کے بیکار ہو جانے سے دل یا دوسری مشینریاں بیکار ہو جاتی ہیں۔

## دماغ کا سب سے عجیب وغریب حصّہ ''مغز''

''مغز'' انسان کے ہوش وحواس، ارادہ وشعور اور حافظہ کا مرکز ہے یا مختصر الفاظ میں یوں کہیں کہ ''مغز'' دماغ کا سب سے اہم اور حساس ترین حصّہ اور ہمارے اندرونی جذبات اور ذہنی ردعمل مثلاً غصہ، خوف اور اسی قسم کی دوسری کیفیات کا تعلق اسی حصّہ سے ہے۔

اگر ایک جاندار کا مغز نکال لیا جائے اور اس کے باقی تمام اعصاب صحیح وسالم رہیں تو وہ زندہ تو رہے گا لیکن اس کے فہم وشعور بالکل ختم ہو جائیں گے۔ ایک کبوتر کا مغز نکال لیا گیا۔ اس کے بعد وہ کچھ دن زندہ رہا لیکن جب اس کے سامنے دانہ ڈالا جاتا تو وہ بھوک کے باوجود اسے منہ نہیں لگاتا تھا اور اگر اس کو پرواز کے لیے آمادہ کیا جاتا تو اس وقت تک پرواز کرتا رہتا جب تک کہ کسی چیز سے ٹکرا کر خود ہی نہ گر جاتا۔

## دماغ کا ایک اور حیرت انگیز حصّہ ''حافظہ''

کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ ہماری یادداشت اور حافظہ کی قوت کس قدر عجیب وغریب ہے؟ اگر ہم سے ایک گھنٹے کے لیے بھی حافظہ (یادداشت) کی قوت چھین لی جائے تو ہم کس مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے؟

حافظے کے مرکز جو کہ ہمارے دماغ کا ایک نہایت چھوٹا سا حصّہ ہے پوری زندگی کی یادوں کو اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ محفوظ کیے رکھتا ہے۔ ہر وہ شخص جس سے ہمارا تعلق ہے اس کی خصوصیات، شکل وصورت، رنگ، لباس، اخلاق و ادب، غرضیکہ ہر چیز کو محفوظ کر کے ہر چیز کی ایک الگ فائل بناتا ہے، لہٰذا اس شخص کا سامنا ہوتے ہی فوراً ہماری فکر ان تمام فائلوں کے انبار سے اس کی فائل باہر نکال لیتی ہے اور فوراً اس فائل پر ایک نظر ڈال کر ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ ہم اس کے ساتھ کیسا رویہ اختیار کریں۔ اگر دوست ہے تو اس کا احترام کیا جائے اور اگر دشمن ہے تو اس سے نفرت کا اظہار کیا جائے لیکن یہ تمام کام چشم زدن میں سُرعت کے ساتھ انجام پا جاتے ہیں۔

مزید تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے حافظے میں موجود ہے اسے اگر ہم چاہیں تو کاغذ پر تصویروں کے ذریعے یا کیسٹ میں محفوظ بھی کر سکتے ہیں۔ بلاشک وشبہ اس کام کے لیے بہت سے اوراق اور کیسٹ درکار ہوں گے کہ جن سے ایک بڑا اسٹور روم بھر سکتا ہے اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز چیز تو یہ ہے کہ اس انبار سے ایک تصویر یا ایک کیسٹ نکالنے کے لیے افراد کی ضرورت ہوگی لیکن ہمارا حافظہ ان تمام کاموں کو انتہائی سادگی اور سُرعت کے ساتھ تنہا ہی انجام دیتا ہے۔

بے شعور طبیعت کس طرح باشعور چیزوں کی تخلیق کر سکتی ہے؟

انسانی دماغ کی حیرت انگیز باریکیوں کے بارے میں ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ان میں سے متعدد کتب اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔

کیا اس بات پر یقین کیا جا سکتا ہے کہ یہ غیر معمولی، عجیب وغریب، پیچیدہ اور پُر اسرار مشینری ایک بے شعور مادہ نے پیدا کی ہے؟ اور کیا یہ اس بات سے بھی

زیادہ حیرت انگیز بات نہیں کہ ہم عقل سے بے بہرہ مادہ کو عقل کا خالق جان لیں؟

قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

وَفِیٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (سورۂ ذاریات: آیت ۲۱)

"تمھارے وجود کے اندر خدا کی عظمت و بزرگی کی عظیم نشانیاں موجود ہیں کیا تم نہیں دیکھتے؟"

## سوچیے اور جواب دیجیے

1. انسانی دماغ کی حیرت انگیز صلاحیتوں کے بارے میں کچھ تحریر کریں۔

2. خداوندعالم نے انسانی دماغ کو گوناگوں حوادث سے بچانے کے لیے کیا تدابیر فرمائی ہیں؟

maablib.org

آٹھواں سبق

# ایک چھوٹے سے پرندے میں عجائبات کی دنیا

## چمگادڑ اور اس کی عجیب و غریب خلقت

اس سبق میں ہم چاہتے ہیں کہ اپنے جسم سے جو ایک بہت بڑے ملک کی مانند ہے اور ابھی ہم نے اس کے مختلف شہروں کی ایک گلی کو بھی نہیں دیکھا۔ باہر آئیں اور کائنات میں ہر جگہ گھومیں اور موجوداتِ عالم کے دیگر حیرت انگیز نظاموں کی چند مثالوں کا جائزہ لیں۔

شب کی تاریکی میں اگر ہم آسمان کی طرف ایک نظر کریں تو وہاں پر ایک خاص قسم کے پرندے کو رات کے سیاہ پردوں میں پُراَسرار سایہ کے مانند اُڑتا ہوا دیکھتے ہیں جو نہایت دلیری کے ساتھ اپنی غذا کے حصول کے لیے اِدھر اُدھر محو پرواز ہوتا ہے۔

یہ پرندہ "چمگادڑ" کہلاتا ہے گو کہ اس کی ہر چیز ہی حیرت انگیز ہے لیکن رات کے اندھیرے میں کسی بھی چیز سے ٹکرائے بغیر اس کا تیزی سے اُڑنا اس قدر تعجب خیز ہے کہ اس سلسلے میں جتنا بھی مطالعہ کیا جائے اس پُراَسرار پرندے کے بارے میں اتنے ہی نئے نئے انکشافات ہوتے چلے جائیں گے۔

یہ پرندہ تاریکی میں اتنی ہی تیزی اور دلیری کے ساتھ حرکت کرتا ہے، جتنی تیزی اور دلیری کے ساتھ ایک تیز رفتار کبوتر دن کی روشنی میں پرواز کرتا ہے اور یہ بات مسلّم ہے کہ اگر اس کے پاس رکاوٹوں کا علم حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا تو وہ اس جرأت سے ہرگز پرواز نہ کرسکتا۔ اگر اس کو ایک نہایت تنگ و تاریک اور

پُر پیچ سرنگ میں کہ جہاں دھواں بھی بھرا ہوا ہو چھوڑ دیا جائے تو وہ تمام پیچ وخم سے بآسانی اور سرنگ کی دیواروں سے ٹکرائے بغیر گزر جائے گا اور اس کے پَروں پر دھوئیں کا ذرا سا بھی اثر نہ ہوگا۔

چمگادڑ کی یہ عجیب وغریب خصوصیت ''راڈار'' کی خصوصیات کے مشابہ ہے (بلکہ حقیقتاً راڈار کی خصوصیت چمگادڑ کی خصوصیات کے مشابہ ہے)۔ پہلے ہم راڈار کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اس پرندے کے چھوٹے سے وجود کی بناوٹ کو جان سکیں۔

علمِ فزکس (Physics) میں ''آواز'' کی بحث کے دوران آواز سے ماوراء لہروں کا ذکر بھی سنتے ہیں۔ یہ لہریں وہی لہریں ہیں کہ جن کی لمبائی، تکرار اور تعداد (یعنی frequence) اتنی زیادہ ہے کہ انسان کے کان انھیں درک کرنے سے قاصر ہیں۔ اسی لیے ان لہروں کا نام ''ماوراء صوت'' رکھا گیا ہے۔

جس وقت ان لہروں کو ایک طاقت ور ٹرانسمیٹر کے ذریعے چھوڑا جاتا ہے تو یہ لہریں چاروں جانب آگے کی طرف بڑھتی ہیں لیکن اگر فضا کے کسی نقطہ میں ایک دیوار یا رکاوٹ (barrier) مثلاً دشمن کا ہوائی جہاز یا کسی دوسری قسم کی رکاوٹ کا سامنا ہوجائے تو اس کا انجام وہی ہوتا ہے جس طرح سے ایک گیند کا دیوار سے ٹکرانے کے بعد انجام ہوتا ہے کہ وہ واپس لوٹ آتا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر ہم ایک پہاڑ یا بلند دیوار کے پاس آواز لگائیں تو چند لمحوں کے بعد اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے تو ممکن ہے ان لہروں کی بازگشت سے اس رکاوٹ کے فاصلہ کا بالکل صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بہت سے ہوائی اور بحری جہاز ''راڈار'' کے ذریعے ہی کنٹرول کیے جاتے ہیں اور اس کی رہنمائی سے ہی اپنے اپنے راستے پر گامزن رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ دشمن

کے طیاروں اور بحری جہازوں کا پتا لگانے کے لیے بھی راڈار سے مدد لی جاتی ہے۔

دانش ور کہتے ہیں کہ اس چھوٹے سے پرندے کے وجود کے اندر بھی راڈار جیسی مشین موجود ہے۔ اگر اس کو ایک کمرے میں اُڑائیں اور اسی لمحے ایک ایسے مائیکروفون کو لگادیں کہ جو ماوراء آواز لہروں کو سننے کے قابل لہروں میں تبدیل کردیتا ہے تو کمرے میں کانوں پر گراں گزرنے والی تیز آواز گونجنے لگے گی۔ اور ہر سیکنڈ میں تیس سے لے کر ساٹھ مرتبہ چمگادڑ کی ماوراء آواز لہریں سنائی دینے لگیں گے۔

البتہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لہریں چمگادڑ کے کس عضو کے ذریعے پیدا ہوتی ہیں یعنی ان لہروں کو بھیجنے والی مشینری (یا Transmitter) کون سی ہے؟ اور انھیں واپس وصول کرنے والی مشینری (یا Receiver) کہاں پر ہے؟

سائنس دان کہتے ہیں کہ یہ آوازیں چمگادڑ کے حنجرہ (Larynx) سے پیدا ہوتی ہیں اور اس کی ناک کے سوراخوں سے باہر فضا میں بھیجی جاتی ہیں۔ جبکہ اس کے بڑے بڑے کان لہروں کو جذب کرنے والی مشین (یا Receiver) کا کام انجام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چمگادڑ اپنی رات کی سیروسیاحت کے لیے اپنے کانوں کی محتاج ہے۔

''ژورین'' نامی ایک روسی سائنس دان نے تجربات کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ اگر چمگادڑ کے کانوں کو کاٹ لیں تو اسے تاریکی میں پرواز کرنے میں مشکل پیش آئے گی لیکن اگر اس کی آنکھوں کو مکمل طور پر نکال دیا جائے تو پھر بھی وہ پوری مہارت کے ساتھ پرواز کرسکتی ہے۔ گویا چمگادڑ اپنے کانوں کی مدد سے دیکھتی ہے نہ کہ اپنی آنکھوں سے! اور یہ عجیب وغریب چیز ہے۔ اس میں غوروفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

اس پرندے کے مختصر اور ناچیز جسم میں یہ حیرت انگیز مشینری کس نے رکھی ہے؟ ذرا سوچئے کہ ان دو مشینوں کو استعمال کرنے کا سبق اس کو کس نے دیا ہے کہ

وہ انتہائی اطمینان بخش وسیلہ کی وجہ سے رات کی تاریکی میں حرکت کرتا ہوا بے شمار خطرات سے محفوظ رہتا ہے۔

## سچ بتائیں کہ وہ ہستی کون ہے؟

آیا یہ ممکن ہے کہ عقل وشعور سے بے بہرہ مادہ ایسا کام انجام دے سکے؟ اور ایک ایسی مشینری (یعنی راڈار) کہ جسے بہت بڑے دانش ور کثیر سرمایہ خرچ کر کے بناتے ہیں۔ اس سادگی کے ساتھ اس کے وجود میں رکھ دے؟

شایسته ستایش آن آفرین گاری است
کارد چنین دلاویز نقشی زماء وطینی

”لائق حمد وثنا ہے وہ ذات کہ جس نے ایسے دلآویز کام انجام دیے اور پانی ومٹی سے ایسے دلکش ونگار تخلیق کیے“۔

## نہج البلاغہ میں چمگادڑ کی خلقت کا تذکرہ

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں چمگادڑ کی خلقت کے بارے ایک مفصل خطبے کے ضمن میں فرماتے ہیں:

فلا یردا ابصارھا اسداف ظلمته ولا تمتنع من المضی فیه لغسق دجنته..... فسبحن البارلکل شیء علی غیر مثال (خطبہ نمبر ۱۵۳)

”رات کی تاریکیاں چمگادڑ کو دیکھنے سے نہیں روکتیں اور نہ ہی اس کے گھٹاٹوپ اندھیرے اسے چلنے سے باز رکھتے ہیں......

پاک وپاکیزہ اور بزرگ وبرتر ہے وہ ذات کہ جس نے پہلے سے موجود کسی نمونے اور مثال کے بغیر تمام چیزوں کی تخلیق کی ہے“۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

١ کیا چمگادڑ کی خلقت کے بارے آپ مزید دلچسپ باتیں جانتے ہیں؟

٢ کیا آپ جانتے ہیں کہ چمگادڑ ایک عدیم المثال پرندہ ہے، یعنی اس کے بال و پَر اور اس کے بچہ جننے بلکہ اس کے سونے کا انداز بھی دوسرے حیوانات سے مختلف اور جداگانہ ہے؟

maablib.org

نواں سبق

# حشرات اور پھولوں کی باہمی دوستی

موسم بہار کی کسی خوشگوار صبح کو کہ جب موسم گرما کی آمد آمد ہو، آپ باغات یا سرسبز و شاداب کھیتوں کی سیر پر نکلیں تو سیکڑوں قسم کے چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے، شہد کی مکھیاں، بھنورے، تتلیاں اور ننھے ننھے پتنگے آپ کو بغیر کسی شوروغل کے ہر طرف اڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ جو ایک پھول سے اڑ کر دوسرے پھول پر بیٹھ رہے ہیں اور اس شاخ سے اس شاخ کی طرف پرواز کر رہے ہیں۔

یہ سب اپنے اپنے کام میں اتنی سرگرمی کے ساتھ مشغول ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی غیر مرئی اور خفیہ طاقت ایک سنجیدہ حاکم کے مانند ان کے سر پر کھڑی برابر ان کو حکم دے رہی ہے۔

پھولوں کے ریشوں کے زرد رنگ میں لتھڑے ہوئے ان کے پاؤں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے باوردی مزدور اپنے کارخانے میں انتہائی دلچسپی اور انہماک کے ساتھ اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں مشغول ہیں۔

بے شک ان کو ایک بہت بڑی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ یہ ذمہ داری اتنی اہم اور بڑی ہے کہ اس کے بارے میں پروفیسر لیون برٹین (Leon Briton) کہتا ہے: ”بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں کہ اگر یہ حشرات نہ ہوتے تو ہمارے پھلوں کی ٹوکریاں خالی رہ جاتیں“۔

ہم اس کی اس بات کو اس جملے کے اضافے سے آگے بڑھاتے ہیں کہ

"ہمارے باغات اور کھیتوں میں جو سبزہ، شادابی اور طراوت نظر آتی ہے وہ چند برسوں کے بعد مکمل طور پر ختم ہو جاتی" کیونکہ یہ حشرات درحقیقت پھلوں کی پرورش کرتے ہیں اور پھولوں کے بیجوں کو تیار کرتے ہیں۔ یقیناً آپ اس کی حقیقت جاننے کے خواہش مند ہوں گے۔

اس بات کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ نباتات کا اہم ترین حیاتی عمل یعنی تخلیق و تلقیح (Fecundatin) ان حشرات کی مدد سے ہی انجام پاتا ہے۔ یقیناً آپ کے علم میں ہوگا کہ حیوانات کی طرح پھولوں میں بھی نر اور مادہ پائے جاتے ہیں اور جب تک ان کے درمیان جنسی ملاپ کا عمل وقوع پذیر نہ ہو ان میں بیج، پھول اور پھل پیدا نہیں ہوتے۔

لیکن کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ مختلف اقسام کے پیڑ اور پودے جو بے حس و حرکت ہوتے ہیں ان میں ملاپ اور اختلاط کا عمل کس طرح انجام پاتا ہے؟ اور نر پودے اور درخت کے تخم مادہ درختوں اور پودوں کے تخم تک کیسے رسائی حاصل کرتے ہیں اور ان کے درمیان ازدواجی تعلقات کیسے قائم ہوتے ہیں؟

ان تعلقات کے لیے سب سے موثر رابطے کے ذریعہ حشرات ہیں جب کہ بعض حالات میں ہوا کی مدد سے بھی یہ عمل انجام پاتا ہے۔ لیکن یہ کام ایسا بھی آسان نہیں ہے جیسا کہ ہم خیال کر رہے ہیں بلکہ یہ مبارک اور پُر برکت شادی جو حشرات یا ہوا کے ذریعے انجام پاتی ہے اس کے لیے بھی باقاعدہ تیاریاں کی جاتی ہیں، وقت اور تاریخیں مقرر کی جاتی ہیں اور ان سب کاموں کی انجام دہی میں طویل اور دلچسپ داستان عمل میں آتی ہے۔ اس کا کچھ حصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

### دو قدیمی اور مخلص دوست

علوم طبیعیات کے ماہرین نے طویل مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ

نباتات اور پھول، علمِ جمادات کے دوسرے دور کے دوسرے نصف میں عالمِ وجود میں آئے ہیں اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اسی دوران حشرات بھی پیدا ہوئے ہیں. اور خلقت عالم کی طویل تاریخ میں یہ دونوں وفادار اور گہرے دوستوں کے مانند رہتے چلے آرہے ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے کے وجود کی تکمیل کرتے رہے ہیں۔

پھول اپنے دوستوں کا منہ میٹھا کرنے اور انھیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہمیشہ بے حد مٹھاس اپنے اندر ذخیرہ کرکے رکھتے ہیں اور جس وقت حشرات، نر کے تخم کو مادہ میں منتقل کرنے کے لیے پھولوں کے اندر داخل ہوتے ہیں تو پھول یہ مٹھاس ان کو پیش کرتے ہیں اور یہ خوش ذائقہ رس حشرات کے لیے اس قدر مرغوب ہے کہ وہ بے اختیار اس کی طرف کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔

بعض ماہرین نباتات (Botanists) کا کہنا ہے کہ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اور دلکش رنگ و روپ بھی حشرات کو اپنی طرف جذب کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ شہد کی مکھیوں پر ہونے والے مختلف تجربات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ یہ پھولوں کے رنگوں میں فرق کو سمجھتی ہیں اور ان کی خوشبو بھی سونگھتی ہیں۔

درحقیقت یہ پھول حشرات کے لیے اپنے آپ کو اس طرح سے سجاتے بناتے اور خوشبو میں اس طرح سے بساتے ہیں کہ باذوق بھنورے اور خوش سلیقہ شہد کی مکھیاں ان کی دلکشی کو دیکھ کر ان کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں اور پھولوں کی دعوت کو قبول کرکے فوراً ہی اس مرحلے کی ابتدائی کارروائیوں کا آغاز کرتے ہوئے ان کی شیرینی کو بھی کھا جاتی ہیں، اور یہی مخصوص قسم کا شیریں رس حشرات کی بہترین غذا مانا جاتا ہے اور جب شہد کی مکھیاں اس مٹھاس کو ایک جگہ جمع کرلیتی ہیں تو شہد تیار ہوجاتا ہے کیونکہ جس وقت یہ حشرات پھولوں کے پاس آتے ہیں تو اس میں سے تھوڑی سی مٹھاس کھاتے ہیں اور ایک بڑی مقدار اپنے چھتے میں لاکر جمع کرلیتے ہیں۔

محبت اور دوستی کا یہ رشتہ کہ جس میں دونوں کا فائدہ مضمر ہے ہمیشہ سے حشرات اور پھولوں کے درمیان قائم ہے اور قائم رہے گا۔

## توحید کا ایک درس

جب انسان پھولوں اور حشرات کی زندگی کے ان دل کش اور حیرت انگیز نکات کا مطالعہ کرتا ہے تو بے اختیار اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ پھولوں اور حشرات کے درمیان محبت و دوستی کا یہ رشتہ کس نے قائم کیا ہے؟ پھولوں کو یہ مخصوص مٹھاس اور خوش ذائقہ غذا کس نے دی ہے؟

پھولوں کو یہ دلکش رنگ و رُوپ اور خوشبو کس نے عطا کی ہے کہ جس کی وجہ سے حشرات ان کی طرف بے اختیار کھنچے چلے آتے ہیں؟

کیڑوں، بھنوروں، شہد کی مکھیوں اور تتلیوں کو یہ دلکشی و رعنائی اور نازک پاؤں کس نے عطا کیے ہیں کہ وہ پھولوں کے تخموں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا کام انجام دیتے ہیں؟

شہد کی مکھیاں ایک مدت تک کسی خاص قسم کے پھولوں کی طرف ہی کیوں متوجہ رہتی ہیں؟ اور اس کائنات میں حشرات اور پھولوں کی تاریخ کا آغاز ایک ساتھ کیوں ہوا ہے؟

آیا کوئی بھی انسان خواہ وہ کتنا ہی ہٹ دھرم کیوں نہ ہو اس بات پر یقین کرسکتا ہے کہ یہ تمام واقعات پہلے سے کوئی اسکیم اور پروگرام بنائے بغیر ظہور میں آئے ہیں اور بے حس و حرکت مادہ ان حیرت انگیز واقعات کو خود بخود وجود میں لے آیا ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا۔

قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

وَ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ○ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا (سورۂ نحل: آیت ۶۸-۶۹)

"تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کے دل میں یہ بات ڈالی کہ تو پہاڑوں، درختوں میں اور ان میں جو چھتیں لوگ بناتے ہیں، ان میں اپنے چھتے بنا۔ پھر ہر طرح کے پھولوں سے ان کا عرق چوس، پھر اپنے پروردگار کی راہوں پر تابعداری سے چلی جا"۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ پھولوں کی مٹھاس اور ان کے رنگ و بو کے کیا فوائد ہیں؟

۲ شہد کی مکھیوں کی دلچسپ زندگی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

maablib.org

دسواں سبق

# چھوٹی مخلوقات کے بے انتہا وسیع جہان میں

چونکہ ہم اس کائنات کی گونا گوں نیرنگیوں کے درمیان پرورش پارہے ہیں اس لیے ہمیں ان کی ایک طرح سے عادت سی ہوگئی ہے لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ ہم بہت سے حیرت انگیز موجودات کی اہمیت سے ہی بے خبر ہوں۔ مثال کے طور پر:

① ہمارے اردگرد ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے اور جانور زندگی گزار رہے ہیں کہ جن میں سے بعض شاید ایک دو ملی میٹر سے بھی چھوٹے ہوں لیکن اس کے باوجود وہ کسی بڑے جانور کی طرح ہاتھ، پاؤں، آنکھیں، کان، حتیٰ کہ دماغ، سمجھ، اعصاب اور ہاضمہ کا نظام تک رکھتے ہیں۔ اگر ایک چیونٹی کے دماغ کو مائیکروسکوپ سے دیکھیں اور اس کی حیرت انگیز بناوٹ پر غور کریں تو پتا چلے گا کہ اس کی ساخت انتہائی عجیب و غریب اور دلچسپ ہے۔ اس کے مختلف حصے ہیں جن میں سے ہر ایک چیونٹی کے چھوٹے سے جسم کے مخصوص حصے کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ حصے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چپکے ہوئے ہیں اور ان کی وضع میں ذرا سی تبدیلی چیونٹی کے بدن کے کسی حصے کو ناکارہ بنا دیتی ہے۔

اس سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کے مختصر دماغ میں کہ جو پن (Pin) کی نوک سے بھی چھوٹا ہے ہوش و خرد، تمدن، ذوق و ہنر کی ایک دنیا پنہاں ہے اور سائنس دانوں کے بڑے بڑے گروہوں نے اپنی زندگیوں کا ایک طویل عرصہ اس جاندار کی زندگی کے مطالعہ میں صرف کر کے اس کے بارے میں حیرت انگیز اور

دلچسپ نکات کا انکشاف اپنی کتابوں میں کیا ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ مادہ ایک چھوٹی سی مخلوق کے اندر یہ تمام ہوش و خرد اور ہنر و ذوق جمع کر سکے؟ حالانکہ خود مادہ کا یہ حال ہے کہ وہ ایک سوئی (Pin) کی نوک کے برابر بھی عقل و شعور نہیں رکھتا۔

## ایٹم کی حیرت انگیز دنیا

اب تک سب سے چھوٹی جس چیز کا انکشاف ہوا ہے وہ ایٹم (Atom) اور اس کے اجزاء ہیں۔ ایٹم اس قدر چھوٹا ذرہ ہے کہ طاقتور ترین مائیکروسکوپ کہ جس سے ایک تنکا پہاڑ نظر آتا ہے، اس کو دیکھنے سے قاصر ہے۔

اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ایٹم کس قدر چھوٹا ہے؟ تو جان لیجیے کہ تمام روئے زمین پر موجود انسانوں سے زیادہ ایٹم پانی کے ایک قطرے میں ہوتے ہیں اور اگر ایک سینٹی میٹر لمبے باریک تار کے پروٹون (Protons) شمار کرنا چاہیں اور اس کام کے لیے ہزاروں افراد کی مدد لیں اور ان میں سے ہر شخص ایک سیکنڈ میں ایک پروٹون جدا کرے تو ان سب کو شمار کرنے کے لیے ۳۰ سے لے کر ۳۰۰ برس تک کے شب و روز درکار ہوں گے۔

جب ایک سینٹی میٹر لمبے باریک تار میں اس قدر ایٹم (اور ایٹمی ذرات) موجود ہیں تو ذرا اندازہ لگائیں کہ ہمارے آسمان، زمین، آب و ہوا، ستاروں اور نظام شمسی میں کس قدر ایٹم موجود ہوں گے؟ کیا انسانی فکر اس قسم کے تصور ہی سے تھک نہیں جائے گی؟ اور سوائے خالق کائنات کے کون ان کا حساب لگا سکتا ہے؟

## ایٹم توحید کا درس دیتے ہیں

آج کی دنیا میں ایٹم ایک بہت ہی اہم اور دلچسپ علمی بحث ہے۔ یہ ننھے منے

ذرات ہمیں توحید کا درس دیتے ہیں کیونکہ ایٹم کی دنیا میں سب سے زیادہ چار چیزیں قابل توجہ ہیں:

❶ غیر معمولی نظم وضبط: ایک سو سے زیادہ ایسے عناصر کا انکشاف ہو چکا ہے کہ جن کے الیکٹرون (Electron) کی تعداد بتدریج ایک سے شروع ہو کر ایک سو سے زیادہ پر ختم ہوتی ہے۔ کیا ایک بے شعور مادہ کے ذریعے یہ عجیب وغریب نظام اس نظم وضبط سے وقوع پذیر ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

❷ طاقتوں کا اعتدال: ہم جانتے ہیں کہ بجلی کی دو قسمیں (Negative) منفی اور مثبت (Positive) ایک دوسرے کی جانب جھکاؤ رکھتی ہیں۔ درحقیقت وہ الیکٹرون جو بجلی کے منفی چارج رکھتے ہیں اور وہ نیوکلیس (Nucleus) جو مثبت چارج رکھتے ہیں آپس میں ایک دوسرے کی طرف کھنچتے ہیں۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ نیوکلیس کے گرد الیکٹرون کے دائروں میں گردش کرنے سے مرکز سے دُور کرنے والی طاقت (قوت دافعہ) وجود میں آتی ہے اور مرکز سے دُور ہٹانے والی طاقت چاہتی ہے کہ الیکٹرون کو ایٹم کے آس پاس سے دُور ہٹا دے اور ایٹم کے اجزاء کو الگ کر دے جبکہ قوت جاذبہ چاہتی ہے کہ الیکٹرون کو جذب کرے اور ایٹم کو ختم کر دے۔

یہاں پر دیکھنا چاہیے کہ کس طرح نہایت باریکی اور مہارت کے ساتھ قوت جاذبہ اور قوت دافعہ بیک وقت ایٹم میں شامل ہیں کہ جن کی وجہ سے نہ تو الیکٹرون فرار ہو سکتے ہیں اور نہ ہی جذب ہو سکتے ہیں بلکہ ہمیشہ حالت اعتدال میں اپنی حرکت کو جاری رکھتے ہیں کیا یہ ممکن ہے کہ اندھا اور بہرا مادہ اس طرح کا توازن اور اعتدال وجود میں لا سکے؟

❸ ہر مخلوق اپنے معین راستے پر گامزن ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ

بعض ایٹموں میں متعدد الیکٹرون ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ تمام الیکٹرون ایک ہی مدار میں حرکت کریں بلکہ یہ الیکٹرون کروڑوں سال سے متعدد مداروں میں معین فاصلوں پر اور اپنے اپنے راستوں پر (یعنی اپنی اپنی سرحدوں کے اندر رہتے ہوئے) تیزی کے ساتھ حرکت کر رہے ہیں اور اس میں کوئی تغیر یا تبدیلی بھی واقع نہیں ہوتی۔ کیا ان میں سے ہر ایک کا معین مداروں میں رہنا اور گردش کا یہ حیرت انگیز نظام کوئی معمولی اور سادہ بات ہے؟

❹ ایٹم کی عظیم طاقت: اس کا اندازہ لگانے کے لیے صرف یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ۱۹۴۵ء میں میکسیکو (Mexico) کے بے آب وگیاہ صحرا میں ایک ایٹمی تجربہ کیا گیا۔ ایک بہت چھوٹے سے ایٹم بم کو ایک فولادی مینار سے چھوڑا گیا۔ دھماکہ ہوا اور فولادی مینار پگھل کر بھاپ بن گیا اور ایک خوف ناک آواز اور بجلی پیدا ہوئی جب اس کو دیکھنے کے لیے سائنس دان وہاں پہنچے تو وہاں پر فولادی مینار کا نام و نشان تک نہ تھا۔

اسی سال امریکا نے جاپان کے دو شہروں ناگاساکی اور ہیروشیما پر دو چھوٹے ایٹم بم پھینکے۔ ناگاساکی میں ۷۰ ہزار افراد مارے گئے اور اتنی ہی تعداد میں مجروح ہوئے۔ جبکہ ہیروشیما میں تیس ہزار سے چالیس ہزار کے درمیان افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اتنے ہی زخمی بھی ہوئے جس کی وجہ سے جاپان نے امریکا کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔

کیا ایک چھوٹے سے ایٹمی ذرّے کے اَسرار و رُموز کا مطالعہ اس امر کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ ہمیں اس کے خالق سے آشنا کردے؟

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے وجود پر ہمارے پاس اتنی ہی دلیلیں موجود ہیں کہ جتنی تعداد میں ایٹم دنیا میں موجود ہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہو رہا ہے:

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ (سورۂ لقمان: آیت ۲۷)

"اگر روئے زمین پر موجود تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر اس کی سیاہی بنے جس کے بعد سات سمندر اور سیاہی بنیں تب بھی خدا کے کلمات (مخلوقات) تمام نہیں ہوں گے"۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ ہماری بتائی گئی باتوں کے علاوہ چیونٹی کی پر اسرار زندگی کے بارے میں آپ کیا کچھ جانتے ہیں؟

۲ کیا آپ تختہ سیاہ پر ایک ایٹم کی ساخت کا نقشہ کھینچ سکتے ہیں؟

# دسویں سبق کے لیے ایک تکمیلی بحث

## خداوند عالم کی شان دار صفات

کیا خدا کی صفات کو پہچاننا آسان ہے؟ جہاں خلقت کے اُسرار و رُموز کے مطالعہ کے ذریعے خدا کے وجود کو پہچاننا جس قدر آسان ہے اسی قدر خدا کی صفات کو پہچاننا مشکل ہے اور اس کے لیے شدید غور و فکر اور بے حد احتیاط کی ضرورت ہے۔

یقیناً آپ اس کا سبب دریافت کرنا چاہیں گے؟ اس کا سبب بہت واضح ہے کیونکہ ہماری کسی بھی چیز سے اور جو کچھ ہم اس وسیع کائنات میں دیکھ اور سن رہے ہیں خدا اس سے مشابہت نہیں رکھتا، لہٰذا خداوند متعال کی صفات کو پہچاننے کی پہلی شرط اس کی مقدس ذات سے تمام مخلوقات کی صفات کی نفی کرنا ہے یعنی عالمِ مادہ میں سے کسی ایک سے بھی اس کو تشبیہ نہ دینا، اس مقام پر نہایت احتیاط کی ضرورت ہوگی کیونکہ ہم مادی جہان میں پلے بڑھے ہیں، ہمارا ہر وقت مادی چیزوں سے تعلق رہا ہے اور اسی سے مانوس ہیں لہٰذا ہم اپنے مادی رجحان کی وجہ سے تمام چیزوں کو اسی کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔

بالفاظ دیگر: ہم نے اس دنیا میں جو کچھ بھی دیکھا ہے وہ جسم اور جسمانی خصوصیات کا حامل ہے یعنی تمام موجودات ہر معین زمان و مکان میں مخصوص شکل و صورت رکھتے ہیں۔ ان حالات میں ایک ایسی ہستی کا تصور کرنا کہ جو نہ جسم رکھتی ہے اور نہ ہی زمان و مکان، مگر اس کے باوجود تمام زمان و مکان کا احاطہ کیے ہوئے ہو، نہایت ہی مشکل امر ہے لہٰذا یہ بات بہت ضروری ہے کہ نہایت غور و فکر کے ساتھ

اس راہ پر قدم رکھا جائے۔

البتہ اس نکتہ کی یاد آوری بہت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہم خدا کی ذات کی حقیقت کبھی درک نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس کی اُمید رکھنی چاہیے کیونکہ یہ اُمید اور خیال ایسے ہی خام ہے جیسے سمندر کو کوزے میں بند کرنا یا ماں کے شکم میں موجود بچے کا بیرونی دنیا سے باخبر ہو جانا، کیا یہ چیزیں ممکن ہیں؟

اور یہی وہ مقام ہے جہاں ایک چھوٹی سی لغزش انسان کو خدا کی معرفت کے حقیقی راستے سے کوسوں دُور کر دیتی ہے جس کے نتیجے میں وہ بت پرستی اور مخلوق پرستی کی سنگلاخ راہوں میں بھٹکتا پھرتا ہے (غور وفکر کیجیے)۔

مختصر یہ کہ ہمیں انتہائی ہوشیار رہنا چاہیے اور ہرگز خداوندعالم کی صفات کا مخلوقات عالم کی صفات کے ساتھ مقابلہ و مقایسہ نہیں کرنا چاہیے۔

## صفات جمال وجلال

عموماً خداوندعالم کی صفات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

① صفات ثبوتیہ: یعنی وہ صفات جو خدا میں پائی جاتی ہیں۔

② صفات سلبیہ: یعنی جن چیزوں سے اس کی ذات منزہ و مبرّا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی ذات میں کون کون سی صفات پائی جاتی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک لحاظ سے خدا کی صفات بے پایاں اور لامحدود ہیں جب کہ ایک لحاظ سے فقط ایک ہی صفت میں تمام صفات کا خلاصہ بیان کیا جا سکتا ہے کیونکہ تمام صفات ثبوتیہ کو مختصر طور پر ایک جملے میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ خدا کی ذات ایک لامتناہی ذات ہے جو ہر لحاظ سے تمام کمالات کی حامل ہے۔

اور صفات سلبیہ کو مختصراً یوں بیان کر سکتے ہیں کہ خدا کی ذات ہر قسم کے نقص سے پاک ہے۔

دوسرے نقطۂ نظر سے چونکہ کمالات اور نقائص کے درجات ہوتے ہیں یعنی بے انتہا کمال اور بے انتہا نقص کا تصور کیا جاسکتا ہے لہٰذا یوں کہا جاسکتا ہے کہ خداوندعالم میں انتہا درجے کی صفات ثبوتی اور انتہا درجے کی صفات سلبی پائی جاتی ہیں کیونکہ جس اعلیٰ درجے کے کمال کا تصور کیا جاسکتا ہے وہ اس کی ذات میں موجود ہے اور جتنے بھی نقائص تصور ہوسکتے ہیں وہ ان سے پاک و منزّا ہے۔ پس خداوندعالم کی صفات ثبوتی اور صفات سلبی لامحدود ہیں۔

## خداوندعالم کی مشہورترین صفات

مشہورترین صفاتِ ثبوتیہ کو (فارسی کے) اس شعر میں ادا کیا گیا ہے:

عالم و قادر وحی است و مرید و مدرک

ہم قدیم و ازلی پس متکلم و صادق

① خدا ''عالم'' ہے یعنی تمام چیزوں کو جانتا ہے۔

② خدا ''قادر'' ہے یعنی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

③ خدا ''حی'' ہے، یعنی زندہ ہے اور زندہ اسے کہا جاسکتا ہے جو علم بھی رکھتا ہو اور قدرت بھی اور چونکہ خدا ''عالم'' بھی ہے اور ''قادر'' بھی۔ اس بنا پر وہ زندہ بھی ہے۔

④ خدا ''مرید'' ہے یعنی صاحبِ ارادہ ہے۔ اپنے کاموں میں مجبور نہیں ہے اور جو کام بھی انجام دیتا ہے اس میں مقصد اور حکمت مضمر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات میں کوئی بھی چیز اس نے بلا مقصد اور بغیر کسی فلسفے کے نہیں بنائی۔

⑤ خدا ''مدرک'' ہے یعنی تمام چیزوں کو جانتا ہے اور سمجھتا ہے سب کو دیکھتا ہے، تمام آوازوں کو سنتا اور ہر بات سے آگاہ و باخبر ہے۔

⑥ خدا ''قدیم'' اور ''ازلی'' ہے، یعنی ہمیشہ سے ہے اور اس کے وجود کا کوئی آغاز نہیں کیونکہ اس کی ہستی اس کی ذات سے جلوہ گر ہوئی ہے اور یہی سبب ہے کہ

وہ اَبدی اور جاودانی ہے، یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ کیونکہ جس ذات کی ہستی خود اس کی ذات سے ہے اس کے لیے فنا اور عدم کوئی معنی نہیں رکھتے۔

⑦ خدا ''متکلم'' ہے یعنی چاہے تو ہوا میں آواز کی لہریں پیدا کر کے اپنے پیامبروں سے کلام کرسکتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ خدا ''زبان، ہونٹ اور حنجرہ رکھتا ہو''۔

⑧ خدا ''صادق'' ہے، یعنی جو کچھ کہتا ہے سچ اور عین حقیقت ہوتا ہے، کیونکہ جھوٹ عموماً دو سبب سے بولا جاتا ہے: ① جہالت اور نادانی کی وجہ سے ② یا کمزوری اور ناتوانی کے سبب سے، چونکہ خدا دانا اور توانا ہے لہٰذا جھوٹ اس کی ذات سے محال ہے۔

خداوند عالم کی صفات سلبیہ کو (فارسی کے) اس شعر میں جمع کیا گیا ہے:

نه مركب بود و جسم ، نه مرئی نه محل

بی شریك است و معانی تو غنی دان خالق

① خدا ''مرکب'' نہیں ہے، یعنی اجزائے ترکیبی سے مل کر نہیں بنا، کیونکہ ایسی صورت میں اسے اپنے اجزا کی احتیاج ہوتی ہے جبکہ وہ کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔

② خدا ''جسم'' نہیں رکھتا کیونکہ جسم محدود کیا جاسکتا ہے، اس میں تغیر و تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور وہ فنا پذیر ہوتا ہے۔

③ خدا ''مرئی'' نہیں یعنی دکھائی نہیں دیتا کیونکہ اگر نظر آتا تو جسم ہوتا اور جسم ہونے کی صورت میں محدود اور فنا پذیر ہوجاتا۔

④ خدا ''محل'' نہیں رکھتا کیونکہ اس کا جسم نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے وہ مکان کا محتاج ہو۔

⑤ خدا کا کوئی ''شریک'' نہیں ہے، کیونکہ اگر اس کا کوئی شریک ہوتا تو وہ ایک محدود وجود ہوتا چونکہ دو لامحدود موجودات کا وجود کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اس کائنات کے قوانین میں وحدت اس کے بے مثل و یگانہ ہونے کی دلیل ہے۔

⑥ خدا ''معانی'' نہیں رکھتا یعنی اس کی صفات اس کی عین ذات ہیں۔

⑦ خدا ''محتاج'' اور ضرورت مند نہیں ہے بلکہ غنی اور بے نیاز ہے کیونکہ علم و قدرت کے لحاظ سے ایک بے پناہ وجود کو کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (سورۂ شوریٰ: آیت ۱۱)

''کوئی بھی چیز اس کے مانند نہیں ہے''۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

1. خدا کی وحدانیت اور اس کے لاشریک ہونے پر اور دلیلیں پیش کریں؟
2. کیا آپ جانتے ہیں کہ بعض مذاہب تین خداؤں کے قائل ہیں اور بعض مذاہب کے ہاں دو خداؤں کا تصور موجود ہے؟ بتایئے وہ کون سے مذاہب ہیں؟

maablib.org

# عدل

پہلا سبق

# عدل کیا ہے؟

① خداوند عالم کی تمام صفات میں سے عدل کو جداگانہ اُصول دین میں سے کیوں شمار کیا جاتا ہے؟

② عدالت اور مساوات کے درمیان فرق۔

## خداوند عالم کی تمام صفات میں سے "عدل" کو کیوں منتخب کیا گیا ہے؟

قبل اس کے کہ بحث کا آغاز کریں ایک نکتے کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ بزرگ علماء نے خداوند عالم کی تمام صفات میں سے صرف عدل کو اُصول دین کی ایک اصل کے طور پر کیوں متعارف کروایا ہے؟

خدا عالم و قادر ہے، عادل و حکیم ہے، رحمٰن و رحیم ہے، خالق و رازق ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ان تمام صفات کے ہوتے ہوئے صفتِ عدل کو اُصول دین کی ایک جداگانہ علیحدہ اصل کے طور پر کیوں ذکر کیا گیا ہے؟

اس اہم سوال کے جواب کے لیے چند باتیں توجہ طلب ہیں:

① عدل کی اہمیت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ بہت سی صفات خدا کی بازگشت اسی صفت "عدل" کی طرف ہے، کیونکہ کلمہ عدالت کا صحیح اور وسیع تر معنی "ہر چیز کو اس کے مقام پر قرار دیتا ہے" لہٰذا اس معنی کے اعتبار سے تمام صفات مثلاً حکیم، رزاق، رحمٰن ورحیم وغیرہ کا اطلاق و انطباق درحقیقت عدالت پر ہی ہوتا ہے۔

② قیامت و معاد کا مسئلہ ہو یا پیغمبروںؑ کی رسالت اور ائمہ کی ذمہ داریوں

کا مسئلہ ان سب کا خدا کی عدالت کے مسئلہ کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔

۲ پروردگار کی عدالت کا مسئلہ آغاز اسلام سے ہی اختلاف کا شکار رہا ہے کیونکہ:

اہلِ سنت کا ایک گروہ جو "اَشاعرہ" کہلایا خداوند عالم کی عدالت کا سرے سے ہی منکر ہے، ان کا کہنا ہے کہ خداوند عالم کی نسبت "عدالت اور ظلم" کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ تمام کائنات چونکہ اس کی ملکیت ہے لہٰذا وہ جو کام بھی کرے عینِ عدالت ہے حتیٰ کہ اَشاعرہ حُسنِ عقلی اور قبح عقلی کے بھی قائل نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری عقل اچھے اور بُرے کے درمیان تمیز نہیں کرسکتی، حتیٰ کہ ہماری عقل نیک کاموں کی اچھائی اور ظلم کے بُرا ہونے کا حکم لگانے سے بھی قاصر ہے (اور اس قسم کے دیگر بہت سے اشتباہات بھی اَشاعرہ کے عقائد کا حصّہ ہیں)۔

اہلِ سنت کا ایک دوسرا گروہ جو "معتزلہ" کہلاتا ہے اس کا اور تمام اہلِ تشیع کا یہ متفقہ اعتقاد ہے کہ خداوند عالم "عادل" ہے اور اس سے ظلم وستم کا صدور محال ہے۔

ان دونوں گروہوں کو آپس میں ایک دوسرے سے جدا کرنے کے لیے پہلے گروہ یعنی "اَشاعرہ" کو غیر عدلیہ جب کہ دوسرے گروہ کو "عدلیہ" کہا جاتا ہے، کیونکہ دوسرا گروہ عدل کو اپنے مکتب کی علامت کے طور پر اُصول دین میں شمار کرتا ہے۔ اہلِ تشیع کا شمار بھی "عدلیہ" میں کیا جاتا ہے۔

اہلِ تشیع نے دوسرے عدلیہ گروہ سے اپنے مکتب کے تشخص اور امتیاز کے لیے "امامت" کو بھی اُصول دین کا جز قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں پر بھی "عدل اور امامت" دونوں کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے وہاں پر مراد "شیعہ امامیہ" ہوتے ہیں۔

۳ فروعِ دین ہمیشہ سے اُصول دین کے ہمراہ ہیں۔ پروردگار عالم کی

عدالت کی شعاعیں انسانی معاشرہ میں بہت زیادہ موثر ہیں اور یہ عدالت اجتماعی ہی ہے کہ جس کی وجہ سے بہترین انسانی معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عدالت کو اُصول دین کی ایک اصل کے طور پر اس لیے منتخب کیا گیا ہے تاکہ انسانوں میں عدل کو ہمیشہ زندہ رکھا جا سکے اور ہر قسم کے ظلم و ستم کے خلاف جنگ جاری رہ سکے۔

جس طرح کہ پروردگار عالم کی ذات و صفات میں وحدانیت اور اس کا بطور معبود یکتا و تنہا ہونا انسانی معاشرے کے اتحاد و یگانگت کے لیے ایک نور وحدت اور ان کی صفوں میں تقویت کا باعث ہے۔

خدا کے پیغمبروںؑ اور آئمہ اطہار علیہم السلام کی رہبری کا مسئلہ ہمیں بتاتا ہے کہ معاشرے کے لیے سچے اور حقیقی رہنما کتنی اہمیت رکھتے ہیں لہٰذا تمام کائنات کے حاکم پروردگار کی تمام صفات میں سے صرف صفتِ عدالت کو علیحدہ ایک اصل کے طور پر ذکر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسانی معاشرے کے تمام ابعاد میں عدالت کا ہونا کتنا لازم و ضروری ہے۔

اس عظیم کائنات کی خلقت اور قیامت ''عدالت'' سے ہے اور انسانی معاشر بھی عدالت کے بغیر کبھی استحکام اور دوام نہیں پا سکتا۔

## عدالت کیا ہے؟ عدالت کے دو مختلف معانی ذکر کیے گئے ہیں؟

① عدالت کا وسیع تر معنی تو وہی ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں، یعنی ''ہر چیز کو اس کے مناسب اور لائق مقام پر رکھنا'' بالفاظ دیگر ''ہم پلہ'' اور ''متوازن ہونا''۔

عدالت کا یہ معنی تمام عالمِ خلقت، شمسی نظام میں، ایٹم کے باطن میں، وجود انسان کی عمارت میں اور تمام نباتات اور حیوانات میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ اس بات کی طرف پیغمبر اسلام کی ایک مشہور و معروف حدیث میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

آپؐ نے فرمایا:

بِالْعَدْلِ قَامَتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

"عدل ہی کی وجہ سے آسمان اور زمین قائم ہیں"۔

مثال کے طور پر اگر کرۂ ارض کی قوت "جاذبہ" اور "دافعہ" میں تعادل و برابری قائم نہ رہے بلکہ ان میں سے ایک قوت دوسری پر حاوی آجائے یا کمزور پڑ جائے تو یا زمین سورج کے اتنی قریب ہوجائے گی کہ جل کر راکھ ہوجائے گی یا پھر اپنے مدار سے ہی باہر نکل جائے گی اور کائنات کی وسعتوں میں بھٹک کر نیست ونابود ہوجائے گی۔

عدالت کے اس معنی کو شاعر نے بھی اپنے معروف اشعار میں ذکر کیا ہے۔

عدل چه بود؟ وضع اندر موضعش

ظلم چه بود؟ وضع در ناموضعش

عدل چه بود؟ آب ده اشجار را

ظلم چه بود؟ آب دادن خار را!

"عدل کیا ہے؟ کسی چیز کو اس کی حیثیت کے مطابق مقام دینا۔

ظلم کیا ہے؟ کسی چیز کو اس کے شایانِ شان مقام سے دُور کرنا۔

ثمر آور درختوں کو پانی لگانا عینِ عدل اور کانٹوں کو پانی دینا عینِ ظلم ہے"۔

یہ بات واضح ہے کہ اگر پھولوں کے پودوں یا پھلوں کے درختوں کو پانی لگایا جائے تو اسے عین عدالت کہا جائے گا لیکن اگر یہی پانی بے فائدہ گھاس پھوس اور کانٹوں کو لگایا جائے تو چونکہ پانی کو غیر ضروری طور پر صرف کیا گیا ہے لہٰذا عین ظلم کہلائے گا۔

۲ عدالت کا دوسرا معنی "لوگوں کے حقوق کی حفاظت ورعایت" کرنا ہے۔ اس معنی کے خلاف کوئی کام "ظلم" کہلائے گا یعنی کسی کا حق تلف کرکے خود فائدہ

اٹھانا یا کسی کے حق کو چھین کر دوسرے کو دے دینا، حتیٰ کہ اگر کسی کو اس کا پورا حق نہ دیا جائے بلکہ کچھ حق دینا اور کچھ نہ دینا بھی ظلم کہلائے گا۔

عدل کے ان دونوں معانی میں سے پہلا معنی ''عمومیت'' رکھتا ہے جبکہ دوسرا معنی ''خاص'' ہے۔ ہماری اس بحث ''عدل الٰہی'' کا محور اگرچہ دوسرا معنی ہے لیکن دونوں معانی خداوندعالم کی ذات سے صد در صد تعلق رکھتے ہیں۔

''عدالتِ خدا'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ کسی کے حق کو غصب کرتا ہے اور نہ کسی کا حق کسی دوسرے کو تفویض کرتا ہے، اور نہ ہی لوگوں کے درمیان تبعیض اور عدم مساوات کا قائل ہوتا ہے۔ وہ ذات متعال تمام معانی کے اعتبار سے ''عادل'' ہے اور اس کی عدالت کے دلائل آیندہ بحث میں ذکر کریں گے، ان شاء اللہ!

''ظلم'' کا معنی چاہے کسی کا حق غصب کرنا ہو یا کسی کے حق کو ناحق کسی دوسرے کے سپرد کرنا ہو، کسی کو تکلیف پہنچانا ہو یا ناحق کسی کو برتری دینی ہو یہ تمام معانی ذات خداوندمتعال سے کسی بھی قسم کا کوئی ربط نہیں رکھتے۔

وہ ذاتِ پاک کبھی نیک کاموں کے کرنے والوں کی نیکی کو ضائع نہیں ہونے دیتی اور نہ ہی برے لوگوں کو کسی اجر کا مستحق قرار دیتی ہے۔ کسی کے گناہ کا مواخذہ بے گناہ سے نہیں کرتی اور نہ ہی خشک وتر پر ایک ہی حکم لگاتی ہے۔

حتیٰ کہ اگر ایک قوم یا معاشرے میں ایک شخص کے علاوہ تمام افراد بدکار و گناہ گار ہوں تب بھی خدا اس ایک فرد کا حساب تمام قوم سے جدا رکھتا ہے اور اسے پوری قوم کے گناہوں کی سزا میں ہرگز شریک نہیں کرتا۔

''اشاعرہ'' کا یہ عقیدہ کہ ''اگر خداوندعالم تمام پیغمبروںؑ کو دوزخ میں ڈال دے اور تمام بدکاروں، جنایت کاروں اور گناہ گاروں کو جنت میں داخل کردے تو یہ ظلم نہیں ہوگا''۔

یہ انتہائی بے ہودہ، شرم آور اور بے سروپا بات ہے۔ اگر کسی شخص کی عقل تعصب وخرافات کی غلاظت سے پاک ہو تو اس بات کی گواہی دے گی کہ اشاعرہ کا یہ عقیدہ انتہائی برا اور باعث ننگ وعار ہے۔

## مساوات اور عدالت کے درمیان فرق

ایک ضروری بات کہ جس کا تذکرہ یہاں پر ضروری ہے، یہ ہے کہ بعض اوقات ہم ''عدالت'' اور ''مساوات'' کے درمیان فرق قائم نہیں کر پاتے اور خیال کرتے ہیں کہ عدالت کا مطلب یہ ہے کہ مساوات کا خیال رکھا جائے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ عدالت میں مساوات کا ہونا ہرگز شرط نہیں ہے بلکہ عدالت کے لیے ہمیشہ استحقاق اور اولویت کا خیال رکھنا ضروری ہے مثلاً عدالت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ایک کلاس کے تمام شاگردوں کو برابر نمبر دیے جائیں یا ایک دفتر کے دو کارکنوں کو برابر تنخواہ دی جائے بلکہ عدالت کا مطلب یہ ہے کہ ہر شاگرد کو اس کی معلومات اور استعداد کے مطابق نمبر دیے جائیں اور ہر کارکن کو اس کے کام اور فعالیت کے مطابق تنخواہ دی جائے۔

اس عالم طبیعت میں عدالت سے مراد یہی وسیع تر معنی ہے۔ اگر ایک ہیل مچھلی ''کہ جس کا وزن تقریباً ایک ٹن ہوتا ہے![1]'' کا دل ایک چڑیا ''کہ جو بمشکل چند گرام کی ہوتی ہے'' کے دل کے برابر ہوتا تو یہ مساوات تو کہلا سکتی تھی مگر اسے عدالت نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اسی طرح ایک بہت بڑے تناور درخت کی جڑ ایک معمولی پودے کی جڑ کے برابر ہوتی تو یہ عدالت نہ ہوتی بلکہ عین ظلم ہوتا۔

ہر چیز کو اس کی صلاحیت، استعداد اور لیاقت کے مطابق اس کا حق ملنا عدالت کہلاتا ہے۔

---

[1] ایک ٹن (Ton) ۲۸ من ۰۰ ۱۱۲ سیر اور ۲۲۵۰ پونڈ (Pound) کے برابر ہوتا ہے۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

1. خدا کی تمام صفات میں سے صرف عدالت کو اُصولِ دین کی ایک اصل کیوں قرار دیا گیا ہے؟
2. ''اَشاعرہ'' کون ہیں؟ اور آپ ان کے متعلق کیا جانتے ہیں؟
3. ''عدلِ الٰہی'' کا عقیدہ انسانی معاشرے کے لیے کیا فوائد رکھتا ہے؟
4. عدالت کے کتنے معنی ہیں؟ ہر ایک کی وضاحت کریں۔
5. کیا عدالت کا معنی ''مساوات'' ہے؟

maablib.org

دوسرا سبق

# پروردگار کے عدل پر دلائل

## حُسن و قبح عقلی

اس اہم مسئلہ کو جاننے سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ہماری عقل مختلف اشیاء کی اچھائی اور برائی کو ایک قابل توجہ حد تک جاننے اور درک کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے (یہ وہی چیز ہے جسے دانش مند لوگ ''حُسن و قبح عقلی'' کے عنوان کے تحت ذکر کرتے ہیں) مثلاً ہم جانتے ہیں کہ عدل و انصاف اور احسان کرنا اچھی چیزوں میں سے ہے جب کہ ظلم اور کنجوسی کرنا برائی میں سے شمار ہوتے ہیں حتیٰ کہ دین اور مذہب کے مذکورہ بالا اُمور سے متعلق کوئی حکم دینے سے پہلے ہی ہمارے لیے یہ چیزیں روشن تھیں۔ ان بدیہی چیزوں کے علاوہ وہ باتیں کہ جن کے درک کے لیے ہماری عقل کافی نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ ہم الٰہی پیغمبروں و رہنماؤں کی طرف رجوع کریں۔

اسی لیے مسلمانوں کے اشاعرہ نامی گروہ کا ''حُسن و قبح عقلی'' کا منکر ہونا اور تمام خوبیوں یا برائیوں کی شناخت کے لیے یہاں تک کہ عدل و ظلم کے حوالے سے بھی فقط مذہب کو مرکز و محور قرار دینا ایک بہت بڑی خطا ہے۔

اگر ہماری عقل ''خوبی'' اور ''بدی'' کے اِدراک پر بھی قادر نہ ہو تو ہمیں کیسے علم ہوگا کہ خداوند عالم کسی جھوٹے شخص کو معجزہ دکھانے کی صلاحیت نہیں دیتا؟

لیکن اگر ہمیں معلوم ہو کہ دروغ گوئی ایک بری اور قابل نفرت چیز ہے اور

خدا سے اس کا صادر ہونا محال ہے تو پھر واضح ہو جائے گا کہ خدا کے تمام وعدے سچے اور حق ہیں اور وہ کبھی جھوٹے کی حمایت یا کاذب کو معجزہ دکھانے کی قدرت نہیں دے سکتا۔ اس حکمِ عقلی کے بعد ہم شریعت و مذہب کے احکام پر پورے اعتماد سے عمل کر سکتے ہیں۔

نتیجہ: حُسن اور قبح کے عقلی ہونے کا عقیدہ دین اور مذہب کی بنیاد ہے (زیادہ دقت فرمائیں)۔

اب ہم عدالتِ خدا سے متعلق اَدلّہ پر بحث شروع کرتے ہیں لہٰذا درج ذیل اُمور پیش نظر رہیں:

## سرچشمۂ ظلم کیا ہے؟

درج ذیل اُمور ظلم کے آغاز کا موجب بنتے ہیں:

① جہل: بعض اوقات ظالم آدمی کو واقعاً معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ وہ نہیں جانتا کہ کسی کے حق کو پامال کر رہا ہے، وہ اپنے اس فعل سے بے خبر ہے۔ پس جہالت کی وجہ سے انسان ظالم بن سکتا ہے۔

② احتیاج: کبھی دوسروں کے پاس موجود چیزوں کی ضرورت اسے اس شیطانی کام پر اُبھارتی ہے حالانکہ اگر اسے ضرورت نہ ہوتی تو وہ ان مواقع پر ظلم کا ارتکاب نہ کرتا۔

③ عجز و ناتوانی: کبھی انسان چاہتا ہے کہ وہ دوسرے کے حق کو ادا کر دے مگر وہ اس حق کو ادا کرنے کی قدرت و طاقت نہیں رکھتا جس کے نتیجے میں وہ دل سے نہ چاہتے ہوئے بھی ظلم کا ارتکاب کرتا ہے۔

④ تکبر، کینہ و بُغض کا اظہار اور انتقام کی خواہش: کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا تینوں عوامل موجود نہیں ہوتے مگر تکبر اور خودخواہی اس بات کا باعث بنتے

ہیں کہ انسان دوسروں کے حقوق کو پامال کرتا ہے، اس کی انتقام پسند اور حاسدانہ طبیعت اسے ظلم وستم پر آمادہ کرتی ہے اور اس کی روح میں مخفی "انحصار طلبی" کی خواہش اسے جور و جفا اور ناانصافی کی طرف مائل کرتی ہے...... وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ تمام بری صفات، کمزوریاں اور نواقص خداوند متعال کی ذات مقدس میں امکان پذیر نہیں ہیں۔ وہ ہر چیز کا عالم، ہر شے سے بے نیاز، قادر مطلق اور ہر ایک پر مہربان ہے، لہٰذا کبھی ظلم کا ارتکاب اس سے ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ ایک ایسا وجود ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ایک ایسا کمال ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ ایسے باکمال و پُرعظمت وجود سے صرف اور صرف خیر وعدل اور رافت و رحمت کا صدور ہی ممکن ہے۔

وہ اگر بدکاروں کو سزا دیتا ہے تو حقیقتاً یہ ان کے ہاتھوں سے کیے گئے برے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جیسے اگر کوئی شخص منشیات اور شراب کے استعمال کرنے کے نتیجے میں مختلف خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہو جائے۔

قرآنِ مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (سورۂ نمل: آیت ۹۰)

"کیا جو کام تم انجام دیتے ہو اس کے علاوہ بھی تمھیں جزا ملے گی؟"

۳ قرآن اور پروردگار کی عدالت کا مسئلہ: قرآنِ مجید کی آیات میں اس مسئلہ کو بہت تاکید کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (سورۂ یونس: آیت ۴۴)

"اللہ انسانوں پر بالکل ظلم نہیں کرتا لیکن انسان ہی ہیں جو اپنے

آپ پر ظلم کرتے ہیں"۔

سورۂ نساء میں ارشاد ہوا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ــــ (سورۂ نساء: آیت ۴۰)

"یقیناً خداوند ایک چھوٹے ذرے کے برابر بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا"۔

قرآن مجید میں حساب و کتاب اور جزا و سزا کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے خداوند متعال فرماتا ہے:

وَ نَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا ــــ (سورۂ انبیاء: آیت ۴۷)

"قیامت کے دن ہم عدل کے ترازو نصب کریں گے لہٰذا کسی بھی شخص پر ذرا سی بھی زیادتی نہیں ہوگی"۔

(اس آیۂ مجیدہ میں "میزان" سے مراد "نیک و بد کو جدا کرنے کا پیمانہ" ہے نہ وہ ترازو کہ جو اس جہان میں ہمارے ہاں رائج ہیں)۔

۲ عدل و انصاف کی طرف دعوت: ہم کہہ چکے ہیں کہ انسان کی صفات خدائی صفات کا پرتو اور عکس ہونی چاہییں اور انسانی معاشرہ میں صفات الٰہی کی شعاعیں پھیلی ہوں، اسی لیے جس طرح قرآن عدالت الٰہی کو بنیاد قرار دیتا ہے، اسی طرح انسانی معاشرہ میں اجتماعی اور ہر ہر فرد میں فردی عدالت کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ قرآن مجید بار بار ظلم کو معاشروں کی تباہی و بربادی کی بنیاد قرار دیتا ہے اور ظالموں کے انجام بدترین انجام قرار دیتا ہے۔

قرآن مجید بارہا جب بھی گذشتہ اقوام کا تذکرہ کرتا ہے تو اس بات کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ "دیکھو گذشتہ اقوام اپنے ظلم و فساد کی وجہ سے کس طرح

عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئیں اور صفحۂ ہستی سے ان کا نام و نشان مٹ گیا، لہٰذا اپنے آپ کو ظلم و ستم سے دُور رکھو ورنہ تم بھی ان کی طرح عذاب میں گرفتار ہو سکتے ہو۔

قرآن مجید صراحت اور واضح انداز سے عدالت کو ایک اساسی بنیاد قرار دیتے ہوئے کہتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ (سورۂ نحل: آیت ۹۰)

"یقیناً خدا عدل و احسان اور قرابت داروں سے نیک سلوک کا حکم دیتا ہے اور بُرے کاموں، نافرمانیوں اور ظلم و تجاوز سے منع کرتا ہے"۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جیسے ظلم کرنا ایک بُرا اور قبیح کام ہے اسی طرح قرآن اور اسلام کی نظر میں ظلم کو قبول کرنا اور اسے برداشت کرنا بھی غلط کام ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۷۹)

"نہ خود ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا"۔

اُصولی طور پر ظالم و ستم گر کے سامنے خاموشی ظلم و ستم میں اضافے اور ظالم کی اعانت کا موجب بنتی ہے۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

١ کیا ہماری عقل مستقل طور پر بغیر کسی شرعی حکم کے نیکی اور برائی کا ادراک رکھتی ہے؟

٢ ظلم کا سرچشمہ کون سے اُمور ہیں؟ نیز خدا کے عادل ہونے پر دلیلِ عقلی ذکر کریں؟

٣ قرآن مجید خداوند عالم کے عادل ہونے اور ظالم نہ ہونے کے بارے میں کیا کہتا ہے؟

۴ عدل اور ظلم کے مقابل انسان کا کیا وظیفہ ہے؟

۵ کیا ظلم کو برداشت کرنا اور ستم پر خاموش رہنا بھی گناہ ہے؟

maablib.org

تیسرا سبق

# آفات وتکالیف کا فلسفہ

زمانۂ قدیم سے آج تک بعض ناسمجھ اور کم فہم لوگ عدالتِ خدا پر بہت سے اعتراض کر رہے ہیں اور بہت سے ایسے مسائل کو مورد بحث قرار دیتے ہیں جو ان کے خیال وعقیدہ کے مطابق عدالتِ خدا سے متصادم ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات وہ خدا کی عدالت کی نفی کے لیے ایسے دلائل پیش کرتے ہیں جو وجود خدا کے انکار پر ختم ہوتے ہیں۔ ان میں سے چند دلائل درج ذیل ہیں:

بڑے بڑے حوادث مثلاً طوفان، زلزلے اور دیگر آفاتِ سماوی ومصائب کہ نا صرف انسانوں بلکہ نباتات، جمادات اور دیگر موجودات کو بھی تباہ و برباد کردیتی ہیں اسی طرح افراد کے درمیان فرق اور تفاوت (کوئی امیر ہے کوئی غریب، کوئی کامل الجسم ہے تو کوئی ناقص وغیرہ)۔

اگر بحث میں ہمارے مقابل مادی لوگ ہوں تو پھر "فلسفۂ آفات" کی بحث کو "خداشناسی" کی بحث کے ضمن میں ذکر کیا جاتا ہے اور کبھی اس بحث کو "عدل پروردگار" کی بحث کے ضمن میں ذکر کیا جاتا ہے۔ ہم اس بحث کو یہاں پر ذکر کر رہے ہیں۔

اس بات کو جاننے کے لیے کہ یہ باطل گمان کس حد تک مضحکہ خیز اور خلاف عقل ہے۔ آیندہ چند اسباق میں اس کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیں گے۔

## محدود معلومات اور اردگرد کے حالات کے زیر اثر فیصلے

عام طور پر ہم سب جب کوئی فیصلہ کرنے لگتے ہیں تو ان اشیاء پر زیادہ

بھروسہ کرتے ہیں جو ہمارے ساتھ مربوط ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں چیز دُور ہے یا نزدیک ہے تو اس سے مراد عموماً یہ ہوتی ہے کہ ہم سے دُور یا ہم سے نزدیک۔

یا فلاں شخص طاقتور یا کمزور ہے یعنی ہماری نسبت سے جسمانی یا روحانی طور پر قوی ہے یا ضعیف ہے۔ اسی طرح وہ مسائل جن کا تعلق خیر و شر یا آفات و مصائب سے ہے ان کے متعلق بھی اکثر لوگ اپنی نسبت سے ہی حکم لگاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر بارانِ رحمت کا نزول ہو تو ہمیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ مجموعی طور پر اس بارش سے کیا اثرات پیدا ہوئے ہیں بلکہ ہم صرف اپنی زندگی، گھر، کھیت، کھلیان یا زیادہ سے زیادہ اپنے شہر اور علاقے کو دیکھ کر اپنا فیصلہ صادر کردیتے ہیں۔ اگر بارش کے اثرات اچھے اور پُرثمر ہوں تو اسے نعمتِ الٰہی قرار دیتے ہیں لیکن اگر اس کے اثرات مثبت نہ ہوں تو اسے مصیبت و آفت قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی پرانی فرسودہ عمارت کو تعمیرِ نو کی غرض سے گرا دیا جائے اور اس کی گرد و غبار ہم تک پہنچ جائے تو ہم اسے مصیبت اور باعثِ پریشانی قرار دیتے ہیں اگرچہ اس عمارت کو گرا کر وہاں ایک ہسپتال ہی کیوں نہ تعمیر کیا جا رہا ہو اور یہ کام بہت سے افراد کے مفاد میں ہو۔

ظاہری طور پر جب ہم سانپ کے زہر کو انتہائی مضر قرار دیتے ہیں تو اس بات کی طرف متوجہ نہیں ہوتے کہ یہی زہر نا صرف سانپ کا انتہائی موثر دفاعی ذریعہ ہے بلکہ اس زہر سے ایسی حیات بخش ادویات تیار کی جاتی ہیں کہ جن سے ہزاروں انسانوں کی جان بچائی جاتی ہے۔

لہٰذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو اشتباہات و نقصانات سے بچائیں تو ضروری ہے کہ اپنی محدود معلومات پر بھروسہ نہ کریں اور کوئی بھی فیصلہ کرنے کے

لیے اپنے اردگرد پائی جانے والی اشیاء پر تکیہ نہ کریں بلکہ تمام جوانب کو مدنظر رکھتے ہوئے کامل معلومات کے بعد ہی کوئی حکم صادر کریں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس جہان کے حوادث زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ وہ طوفان جو آج ہمارے شہروں کو گھیرے ہوئے ہیں اور مسلسل آنے والی سیلابی بارشیں یہ سب اسی لمبی زنجیر کی کڑیاں ہیں اسی طرح وہ حوادث جو ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں ان کا بھی اسی زنجیر سے تعلق ہے۔

پس ایک معمولی اور چھوٹی سی چیز کو دیکھ کر تمام چیزوں کے متعلق ایک کلی حکم لگانا اور یہ کہنا کہ ہر جگہ قطعاً ایسا ہی ہوگا۔ یہ عقل ومنطق کے خلاف ہے۔

اس کائنات کی کسی خلقت کو صد در صد برائی اور شر قرار دینا قطعی طور پر ناقابل قبول ہے۔ البتہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ایک لحاظ سے اچھی اور ایک لحاظ سے بری ہو اور اس کی اچھائی اُس کی برائی اور نقصان پر غالب ہو، مثلاً ممکن ہے کہ آپریشن کچھ جہات سے انتہائی تکلیف دہ ہو لیکن چونکہ اس کے فوائد بہت زیادہ ہیں تو اسے بلاشبہ باعث خیر وسلامتی قرار دیا جاتا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے ہم زلزلے کی مثال میں دقت کرتے ہیں کہ یہ درست ہے کہ بعض اوقات زلزلہ کچھ علاقے کو برباد کر دیتا ہے لیکن اگر ہم اس زنجیر کی کڑیوں کو آپس میں ملائیں تو یہ بھی عین ممکن ہے کہ ہمیں اپنا یہ فیصلہ تبدیل کرنا پڑے۔

کیا زلزلے کا تعلق صرف اس حرارت اور ان بخارات سے ہے جو زمین کے اندر ہوتے ہیں؟ یا اس کا تعلق چاند کی اس قوت جاذبہ کے ساتھ ہے جو خشک وجامد زمین کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور بعض اوقات اسے جگہ جگہ سے پھاڑ دیتی ہے؟ یا اس کا تعلق دونوں کے ساتھ ہے؟ ماہرین ارضیات (Geologist) نے یہاں مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔

وجہ جو بھی ہو وہ مثبت فوائد کا حامل ضرور ہے یعنی اگر ہم اس بات کو تسلیم کرلیں کہ زمین کی حرارت ہی زلزلے کا موجب ہے تو اس حرارت کے فوائد بھی بہت ہیں مثلاً یہی حرارت باعث بنتی ہے کہ زمین میں تیل اور پٹرول ''جو کہ موجودہ دور میں انرجی کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے'' کے ذخیرے وجود میں آتے ہیں اور اسی حرارت کی برکت سے زمین میں کوئلہ پیدا ہوتا ہے، لہٰذا اس اعتبار سے زمین کی حرارت کثیر فوائد کی حامل ہے۔

اسی طرح مدوجزر جو کہ چاند کی قوت جاذبہ کا نتیجہ ہے نہ صرف سمندر کے پانی کو ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے بلکہ اس میں موجود آبی حیات اور سمندروں کے خشک ساحل بھی بہت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں کہ وہ اس سے سیراب ہوتے ہیں۔ پھر اس میں میٹھا پانی گرتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ محض خیر ہے۔ اب ہمیں یہ بات بالآخر معلوم ہوجانی چاہیے کہ محدود معلومات اور مخصوص ماحول کے مطابق کیے گئے ہمارے فیصلے اور خیالات ان اہم حقائق کو کس طرح سے مخفی کردیتے ہیں اور ہم کیوں نظام کائنات میں ظاہری طور پر صرف منفی پہلوؤں سے متعلق ہی فیصلے کرتے رہتے ہیں؟ لہٰذا ہم جتنا ان اُمور کے باہمی ارتباط اور ان حوادث کے آپس میں قریبی تعلق پر غور کریں گے تو ان کے فوائد وثمرات سے اتنے ہی آگاہ ہوتے چلے جائیں گے۔

قرآن مجید ہمیں کہہ رہا ہے:

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (سورۂ اسراء: آیت ۸۵)

''اور تمھیں تو بہت کم ہی علم دیا گیا ہے''۔

ان تھوڑی سی معلومات کے ساتھ ہمیں اتنے عجولانہ فیصلے نہیں کرنے چاہییں:

۲۔ مغموم اور خبردار کرنے والے حوادث

تقریباً ہم سب ایسے بہت سے افراد کو جانتے ہیں جو نعمتوں کی فراوانی کے باعث تکبر اور خود بینی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ بہت سے اہم مسائل اور اپنی ذمہ داریوں کو فراموش کر دیتے ہیں اور یہ بات بھی ہمارے مشاہدے میں ہے کہ جب ہم پرسکون اور آرام دہ زندگی کی آسائشوں سے بہرہ مند ہو رہے ہوتے ہیں تو ایک حد تک بے پروا اور خواب غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور اگر یہ حالت برقرار رہے تو انسان کو بدقسمتی اور مشکلات گھیر لیتی ہیں۔

بلا شک وشبہ کچھ زندگی کے حوادث انسان کے تکبر کو ختم کرنے اور اسے خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔

آپ نے یقیناً سنا ہوگا کہ تجربہ کار ڈرائیور، بالکل صاف ستھرے، پیچ وخم سے پاک اور نشیب وفراز سے خالی راستوں کی شکایت کرتے ہیں اور ان سڑکوں کو خطرناک قرار دیتے ہیں کیونکہ یکساں طور پر ہموار اور سیدھے راستے باعث بنتے ہیں کہ دورانِ سفر ڈرائیور سست پڑ جائے اور اس پر نیند کا غلبہ ہو جائے جس کے نتیجے میں زبردست حادثہ پیش آسکتا ہے۔

ان عوامل کے پیش نظر بعض ممالک میں اس قسم کی سڑکوں پر مصنوعی رکاوٹیں اور نشیب وفراز بنائے جاتے ہیں تاکہ ان خطرات کا تدارک کیا جاسکے۔

انسان کی شاہراہ زندگی بھی اسی طرح ہے، اگر انسان کی زندگی حوادث ومشکلات اور نشیب وفراز سے پاک ہو تو وہ خدا ورسولؐ اور اپنے وظائف اور ذمہ داریوں سے یقیناً غافل ہو جائے گا۔

ہماری اس گفتگو کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان خود ہی اپنے لیے مشکلات وحوادث تشکیل دے کیونکہ ایسی چیزیں ہمیشہ سے انسان کی زندگی میں ہیں بلکہ ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انسان کی زندگی میں پیش آنے والے بہت سے حوادث کا فلسفہ یہ

ہے کہ وہ غفلت اور غرور کا شکار نہ ہو جو کہ خوش قسمتی اور سعادت کے ازلی دشمن ہیں اور یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ تمام حوادث اور مشکلات کا فلسفہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ جو ہم نے بیان کیا بلکہ بعض حوادث اور مشکلات اس قسم کا فلسفہ رکھتے ہیں جبکہ دیگر حوادث اور مشکلات کے متعلق ہم آیندہ اسباق میں گفتگو کریں گے ان شاء اللہ۔

عظیم آسمانی کتاب قرآنِ مجید بھی اس فلسفہ حوادث کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ (سورۂ انعام: آیت ۴۲)

"ہم نے انھیں دردناک حادثات اور رنج میں مبتلا کیا تاکہ وہ درگاہ خداوندی کی طرف آئیں"۔

maablib.org

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ کن لوگوں نے آفات و تکالیف کے مسئلے کو اعتقادی مباحث میں مورد بحث قرار دیا ہے؟

۲ آفات و تکالیف کے نمونے اور مثالیں شمار کریں۔ کیا آپ کو زندگی میں ان مثالوں میں سے کسی کا سامنا کرنا پڑا ہے؟

۳ اردگرد کے حالات کے زیر اثر فیصلے سے کیا مراد ہے؟ نیز تمام اطراف کا لحاظ "شر مطلق" اور "نسبتاً باعث خیر" کی وضاحت کریں؟

۴ آیا طوفان اور زلزلے ہمیشہ باعث ضرر و نقصان ہوتے ہیں؟

۵ زندگی کے ناخوش گوار واقعات انسان کے لیے کون سے ممکنہ مثبت اثرات کے حامل ہوتے ہیں؟

maablib.org

چوتھا سبق

# زندگی کے ناخوشگوار حادثات کا فلسفہ

ہم گذشتہ سبق میں کہہ چکے ہیں کہ بعض ظاہر بین اور نکتہ چین افراد انسانی زندگی میں پیش آنے والے ناگوار حادثات، تباہ کن آفات، مشکلات اور ناکامیوں کو پروردگار عالم کی عدالت کے انکار یا پھر بعض اوقات خود ذات خدا کے وجود مقدس کے انکار کے لیے بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔

گذشتہ بحث میں ان حوادث میں سے بعض کا جائزہ لیتے ہوئے دو موضوعات کے زیرعنوان ہم نے ان کا فلسفہ پیش کیا تھا۔ اس بحث کو اب آگے بڑھاتے ہیں۔

## انسان مشکلات کی آغوش میں پرورش پاتا ہے

قطعاً مشکلات پیدا نہیں کرنی چاہیے لیکن اس کے باوجود اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے سخت اور ناگوار حادثات ہمارے ارادے کو قوی اور ہماری توانائی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے لوہا بھٹی میں پگھلنے کے بعد مضبوط ہوجاتا ہے اسی طرح انسان بھی حادثات کا سامنا کرنے کے بعد مضبوط اور قوی ارادے کا مالک بن جاتا ہے۔

جنگ ایک بری چیز ہے، لیکن بعض اوقات ایک طویل اور گھمسان کی جنگ کسی ملت کی صلاحیتوں میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ ان کے تفرقہ کو وحدت میں تبدیل کرتی ہے اور ان کی پس ماندگی کا بڑی تیزی کے ساتھ خاتمہ کرتی ہے۔

ایک معروف مغربی مورخ کہتا ہے کہ تاریخی طور پر دنیا کے کسی بھی نقطہ میں

اگر کوئی روشن تمدن پایا جاتا ہے تو در حقیقت اس ملت اور ملک پر کوئی نہ کوئی بہت بڑی استعماری طاقت حملہ آور ہوتی ہے کہ جس کے نتیجے میں وہ مملکت اور اس کے سوئے ہوئے افراد بیدار ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ اور تیار کر لیتے ہیں۔

البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ زندگی کے تلخ حوادث کے مقابلے میں تمام افراد اور ہر ملت کا عکس العمل ایک جیسا ہو۔ بہت سے گروہ صرف اس لیے مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو کمزور اور ناتواں سمجھنے لگتے ہیں۔

لیکن وہ افراد جن کے لیے حالات سازگار ہوتے ہیں وہ اس قسم کے حوادث کا مقابلہ کرنے کے لیے حرکت میں آجاتے ہیں اور انتہائی جوش و خروش کے ساتھ ان مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی کمزوری اور کم ہمتی کی تیزی کے ساتھ اصلاح کر لیتے ہیں۔

پس کیونکہ لوگ اس قسم کے حوادث اور مشکلات کی گہرائی تک نہیں پہنچ پاتے لہٰذا وہ ان کے منفی اور تلخ آثار کو تو درک کرتے ہیں لیکن مثبت اور موافق آثار کو نہیں دیکھ پاتے۔ ہم یہ دعویٰ ہرگز نہیں کر رہے کہ انسانی زندگی کے تمام تلخ حادثات اس قسم کے آثار رکھتے ہیں لیکن بہت سے حادثات مثبت آثار بھی رکھتے ہیں۔

اگر آپ دنیا کے باکمال لوگوں کی زندگی کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تقریباً یہ تمام لوگ مشکلات اور تکالیف سے گزر کر ہی باکمال بنے ہیں جب کہ ایسے افراد کم نظر آئیں گے کہ جنھوں نے آرام و ناز میں پرورش پائی ہو اور کسی بڑے مقام تک پہنچ کر باکمال لوگوں کی صف میں شامل ہوئے ہوں۔

فوج کے سپہ سالار وہ ہوتے ہیں کہ جنھوں نے طویل اور سخت جنگوں کے میدان دیکھے ہوں، اقتصادیات کے ماہر وہ لوگ ہوتے ہیں جو اقتصادی بحرانوں کا

سامنا کر چکے ہوں اور بڑے سیاست دان ان لوگوں کو سمجھا جاتا ہے کہ جو مشکل اور سخت سیاسی مسائل کا سامنا کرنے میں کامیاب ہوئے ہوں۔ خلاصہ کلام یہ کہ مشکلات اور تکالیف اپنی آغوش میں انسان کی پرورش کرتی ہیں۔

قرآنِ مجید میں ہم پڑھتے ہیں کہ:

فَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّ یَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا کَثِیْرًا

(سورۂ نساء: آیت ۱۹)

"ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں تو پسند نہ ہو مگر اللہ اس میں بہت سی خوبیاں پیدا کردے"۔

## مشکلات خدا کی طرف رجوع کا ذریعہ ہیں

گذشتہ ابحاث میں ہم نے مطالعہ کیا ہے کہ ہمارے وجود کا ہر جز ایک مقصد اور غرض رکھتا ہے۔ ہماری آنکھیں، کان، دل، دماغ اور اعصاب کسی نہ کسی خاص مقصد اور غرض کے تحت بنائے گئے ہیں، حتیٰ کہ ہمارے ہاتھوں کی لکیریں اور ہماری انگلیوں کے خطوط بھی ایک خاص فلسفہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارا تمام وجود بغیر کسی مقصد اور فلسفہ کے بنایا گیا ہو۔ اس کے علاوہ گذشتہ ابحاث میں ہم یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ یہ تمام اغراض و مقاصد صرف اور صرف ایک انسان کامل بنانے کے لیے ہیں۔ پس اس تکامل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دقیق قسم کے تعلیمی اور تربیتی پروگرام تشکیل دیے جائیں کہ جو پورے انسانی وجود کو شامل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے انسان کو پاک توحید پرست فطرت دین کے ساتھ ساتھ اس کی رہنمائی کے لیے عظیم الشان پیغمبروںؑ کو آسمانی کتابوں سمیت بھیجا ہے۔

اسی مقصد کی تکمیل کے لیے کبھی کبھی اسے اس کے گناہوں اور سرکشی کے

بُرے نتائج سے دوچار کرتا ہے کہ وہ فرامین پروردگار کی مخالفت کی وجہ سے زندگی کی مشکلات کا سامنا کرے اور ان بُرے نتائج سے آشنا ہونے کے بعد اپنا رُخ خدا کی طرف موڑے۔ اس مقام پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت سی مشکلات و تکالیف اور ناگوار حادثات درحقیقت خدا کی طرف سے رحمت اور نعمت کا باعث بنتے ہیں۔

جیسا کہ قرآن مجید بھی فرماتا ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (سورۂ روم، آیت ۴۱)

"خود لوگوں کے اپنے اعمال کے باعث خشکی اور تری میں فساد برپا ہوگیا تاکہ انھیں ان کے بعض اعمال کا ذائقہ چکھایا جائے شاید یہ لوگ پلٹ آئیں"۔

اس تمام گفتگو کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصائب و مشکلات اور حوادث و تکالیف کو محض برائی سمجھنا اور اسے آفت و آسیب قرار دیتے ہوئے عدالت الٰہی کے خلاف شمار کرنا عقل کی منطق اور دلیل سے دُور ہے کیونکہ ہم اس مسئلے میں جتنی بھی گہری فکر کریں گے اور اس کی باریکیوں میں جائیں گے تو ہمیں اس کے فلسفہ اور حکمت کے متعلق زیادہ معلومات حاصل ہوں گی۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ ہماری خلقت کا مقصد کیا ہے اور ہم کس طریقے سے اس مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں؟

۲ انسان کس طرح مشکلات کی وجہ سے قوی اور باہمت ہوتا ہے؟

۳ کیا آپ نے ایسے افراد کو دیکھا ہے یا ان کے متعلق تاریخ میں پڑھا ہے کہ جنھوں نے مشکلات اور تکالیف کی آغوش میں پرورش پائی ہو اور کسی بلند و بالا مقام پر پہنچے ہوں؟ مکمل وضاحت کیجیے؟

۴ قرآن مجید ہمارے گناہوں کے عکس العمل کے بارے میں کیا کہتا ہے؟

۵ وہ کون سے افراد ہیں جو تلخ اور ناگوار حادثات کے نتیجے ہیں۔ مثبت رائے قائم کرتے ہیں اور وہ کون سے افراد ہیں جو منفی رائے اختیار کرتے ہیں؟

پانچواں سبق

# آفات ومشکلات کے فلسفہ کے بارے میں

جہاں تک ناگوار حادثات اور آفات کی مشکل کا تعلق ہے یہ بہت سے بحث توحید کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے قابل غور مشکل ہے لہٰذا ہم مجبور ہیں کہ دوبارہ ایک اور انداز سے اس کا تجزیہ کریں اور اسی آفات کی بحث کو آگے بڑھائیں۔

## مشکلات اور نشیب وفراز زندگی کو روح عطا کرتے ہیں

شاید بعض افراد کے لیے اس مسئلے کا اِدراک مشکل ہو کہ اگر خدا کی عنایات اور نعمتیں دائمی اور پے در پے ہوں تو اپنی قدر وقیمت اور اہمیت کھودیتی ہیں۔

آج یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اگر ایک چیز کو ایک کمرے کے درمیان میں رکھ دیا جائے اور اس کے چاروں طرف سے اس پر طاقتور قسم کے آلات کے ذریعے روشنی ڈالی جائے اور وہ چیز اور کمرہ بھی مکمل طور پر صاف اور دائرے کی شکل میں ہوں تو اس چیز کا ہرگز مشاہدہ نہیں ہوسکتا۔

کیونکہ ہمیشہ جسم کا مشاہدہ اس وقت کیا جاسکتا ہے کہ جب روشنی کی وجہ سے اس کا سایہ پیدا ہو ورنہ سایہ کی عدم موجودگی میں اس کا مشاہدہ ممکن نہیں ہے۔

زندگی کی نعمتوں کی قدر وقیمت بھی مشکلات کی کمی اور زیادتی کے سایوں کے بغیر قابل مشاہدہ نہیں ہے، اگر تمام عمر انسان امراض سے بچا رہے تو وہ صحت وسلامتی کی لذت کا احساس نہیں کرسکتا۔ صرف ایک رات کے سخت بخار اور شدید سردرد کے بعد جب انسان صحت یاب ہوکر سلامتی کا شیریں ذائقہ چکھتا ہے کہ پھر جب بھی

اسے اپنی وہ بیماری والی رات یاد آتی ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ صحت سلامتی جیسا کیا گوہرِ بے مثال اس کے پاس ہے۔

درحقیقت زندگی میں یکسانیت "حتیٰ کہ معیارِ زندگی کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو" انسان کو تھکاوٹ کا احساس دیتے ہوئے بے روح کردینے والی ہے۔ بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ جو افراد ایک اعلیٰ، معیاری اور ہر قسم کے رنج و مشکلات سے خالی زندگی گزارتے ہیں وہ یا تو خودکشی کرلیتے ہیں یا ہمیشہ اپنی زندگی سے شاکی رہتے ہیں۔ آپ کو کوئی بھی ایسا معمار نہیں ملے گا جو باذوق ہوتے ہوئے ایک بہت بڑے اور خوب صورت ہال کی دیواروں کو جیل کی دیواروں کی طرح صاف اور ایک جیسی بنا دے بلکہ وہ ہال کی دیوار کو نشیب و فراز اور پیچ و خم کے ساتھ ایک خوب صورت شکل میں تعمیر کرے گا۔

یہ دنیا اتنی خوب صورت کیوں ہے؟ پہاڑوں کے دامن میں پھیلے ہوئے جنگل اور سانپ کے مانند بل کھاتے ہوئے چھوٹے بڑے درختوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی نہروں کا منظر اس قدر دلکش اور خوش نما کیوں ہے؟ اس کی سب سے بڑی دلیل یکسانیت کا نہ ہونا ہے۔

نظامِ شمسی اور شب و روز کی آمد و رفت کہ جس کا تذکرہ قرآنِ مجید کی مختلف آیات میں ہوا ہے۔ انسانی زندگی سے یکسانیت کو دُور کرنے کے لیے ہے کیونکہ اگر سورج آسمان کے ایک ہی گوشے میں رہے اور ہمیشہ زمین کے ایک ہی حصّہ پر اپنی ضوفشانی کرتا رہے اور اس میں کوئی بھی تبدیلی واقع نہ ہو اور نہ ہی اس خطے پر رات کا طلائی پردہ آئے تو ایسی صورت میں دیگر اشکالات کے علاوہ تمام انسان بہت کم مدت میں اُکتا جائیں گے۔

لہٰذا ان تمام باتوں کے پیشِ نظر ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا چاہیے کہ کم از کم

زندگی کی مشکلات اور حوادث کے ایک حصے کا فلسفہ یہ ہے کہ وہ باقی زندگی کو نہ صرف روح عطا کرتا ہے بلکہ اسے شیریں اور قابل تحمل بھی بنا دیتا ہے۔ نعمتوں کی قدر و قیمت کو آشکار کرتا ہے اور انسان کے لیے یہ امکان پیدا کرتا ہے کہ وہ ان نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ بہرہ مند ہو سکے۔

## خود ساختہ مشکلات

ہم اس بحث کے آخری مرحلہ میں جس نکتے کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ بہت سے افراد مصائب و مشکلات اور ناگوار حادثات کا تجزیہ کرتے وقت غلطی کرتے ہیں۔ ظالم و ستم گر انسانوں کے ہاتھوں واقع ہونے والے ظلم اور زیادتیوں کو نظام کائنات کی بے عدالتی سمجھتے ہیں اور انسانی کاموں میں بے نظمی کو کائنات کی بے نظمی کی طرف نسبت دیتے ہیں۔

مثلاً کبھی اعتراض کرتے ہیں کہ "چرا ہر چہ سنگ است برای پای لنگ است؟ (یعنی جو بھی پتھر ہے وہ لنگڑے کے پاؤں کے لیے ہے) اور کیوں زلزلہ شہروں میں کم نقصان کرتا ہے جب کہ دیہاتوں میں زیادہ لوگوں کی ہلاکت کا باعث بنتا ہے اور بہت سے لوگ بے گھر ہو جاتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے اور یہ کون سی عدالت ہے؟ اگر مصیبت کو تقسیم کرنا مقصود ہے تو پھر کیوں برابر تقسیم نہیں ہوتی؟ دردناک او سخت قسم کے حوادث کا شکار ہمیشہ کمزور و ناتواں لوگ ہی کیوں ہوتے ہیں؟ متعدی بیماریوں کا شکار بھی یہی لوگ کیوں بنتے ہیں؟

یہ لوگ اس بات سے غافل ہوتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں خدا کی خلقت او عدالت سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں بلکہ انسانوں کے ہی ایک دوسرے پر کیے جانے والے ظلم و زیادتیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

اگر دیہاتی لوگ شہریوں ...کے ظلم اور زیادتیوں کی وجہ سے نعمتوں اور

آسائشوں سے محروم اور فقر و فاقہ کا شکار نہ ہوتے تو وہ بھی اپنے لیے محکم اور مضبوط مکان بنا سکتے تھے اور زلزلے کی تباہیوں سے بچ سکتے تھے۔

جب دیہاتیوں کے گھر گارے یا پتھر اور لکڑی اور بعض اوقات گچ اور سیمنٹ کے بغیر انتہائی سادہ طریقے سے تعمیر کیے جاتے ہیں تو نتیجہ میں وہ شدید آندھی اور طوفان یا پھر زمین کی ہلکی سی لرزش کی وجہ سے گر جاتے ہیں۔ پھر ان غرباء کی حالت کے بہتر ہونے کی اُمید کیسے کی جا سکتی ہے لیکن اس چیز کا خدا کے کاموں سے کیا تعلق ہے؟

ہمیں اس عیب جو شاعر کی طرح یہ نہیں کہنا چاہیے کہ ایک کو ہزاروں نعمتوں سے نوازا ہے اور دوسرے کو ذلّت اور رُسوائی کا نشانہ بنایا ہے، ایک کو محل عطا کیا ہے اور دوسرے کو جھونپڑی!

ضروری ہے کہ اس تنقید کا رُخ معاشرہ کے غیر موضوع اور غلط نظام کی طرف موڑا جائے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس کے خلاف کھڑے ہو جائیں اور اس اجتماعی بے عدالتی کو ختم کر دیں۔ محرومیت اور فقر و تنگدستی کا مقابلہ کریں اور محکوم اور مستضعف لوگوں کو ان کے حقوق دیں تا کہ اس قسم کی برائیاں پیدا ہی نہ ہوں۔

اگر تمام اُفراد کو ضرورت کی حد تک غذا اور صحت کی بنیادی سہولتوں سے بہرہ مند کیا جائے تو وہ متعدی بیماریوں کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور اور قوی ہو جائیں گے۔

لیکن جب اجتماعی نظام کی غلط وضعیت کی وجہ سے ایک حاکم بعض اُفراد کے لیے اتنی سہولتیں اور آسائشیں مہیا کر دے کہ ان کے کتے اور گھر بلیاں بھی ڈاکٹر، ہسپتال اور دوا کی سہولیات رکھتی ہوں لیکن باقی لوگ اپنے نوزائیدہ بچوں کی پرورش کے لیے بنیادی طبی سہولتوں سے بھی محروم ہوں تو پھر کثرت سے اس قسم کے ناگوار مناظر کا مشاہدہ کیا جاتا ہے، لہٰذا اس مقام پر بجائے اس کے کہ ہم خدا پر اعتراض کریں ہمیں اپنی اصلاح کی ضرورت ہے۔

ضروری ہے کہ ظالم سے کہیں ظلم نہ کرو۔ ضروری ہے کہ مظلوم سے کہیں کہ ظلم کو برداشت نہ کرو ۔۔۔ اور ضروری ہے کہ ہم کوشش کریں کہ ایک تہذیب و تمدن کے تمام افراد کم از کم بنیادی صحت کی سہولتوں، ہسپتال، اچھی خوراک، پرسکون گھر، مناسب تعلیم اور ماحول سے بہرہ مند ہو سکیں۔

مختصر یہ کہ ہمیں اپنے گناہوں کا بوجھ نظام خلقت کی گردن پر نہیں ڈالنا چاہیے۔ ہماری اس قسم کی زندگی خودساختہ ہے نا کہ خدا کی عطا کردہ ہے اور خدا نے اس غیر عادلانہ نظام پر عمل کرنے کا ہمیں کب حکم دیا ہے؟ البتہ خدا نے ہمیں آزاد پیدا کیا ہے کیونکہ آزادی ہمارے تکامل اور ترقی کا راز ہے لیکن ہم خود ہی اپنی آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسروں پر ظلم و ستم کرتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرہ ایک نامطلوب صورت اختیار کر جاتا ہے۔

لیکن قابل افسوس بات یہ ہے کہ اس قسم کی غلط فہمی کا شکار بہت زیادہ لوگ ہوئے ہیں حتیٰ کہ بعض معروف شعرا کے اشعار میں بھی اس بات کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔

قرآن مجید ایک بہت ہی مختصر اور پرمعنی جملہ میں فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا وَّ لٰکِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ ○ (سورۂ یونس: آیت ۴۴)

"اللہ یقیناً لوگوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ لوگ ہیں جو اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں"۔

اسی ترتیب کے ساتھ ہم مصائب و مشکلات کی بحث کو تمام کرتے ہیں۔ اگرچہ اس بحث کے متعلق بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں لیکن ایک مختصر اور مشکل بحث کے متعلق اتنی ہی گفتگو کافی ہے۔

# سوچیے اور جواب دیجیے

۱ آفات و مشکلات کے فلسفہ کی بحث کو ہم نے تین درسوں میں کیوں بیان کیا ہے؟

۲ زندگی میں یکسانیت کے کون سے بُرے اثرات ہیں؟ اور کیا آپ نے کوئی ایسا شخص دیکھا ہے جو پُرتعیش زندگی کے باوجود غمگین ہو؟

۳ اس کائنات میں نُور و ظلمت کے نظام کا فلسفہ کیا ہے؟

۴ آیا اس دنیا کے تمام مصائب اور مشکلات کا تعلق نظام خلقت سے ہے یا ہمارا بھی اس میں کوئی نہ کوئی کردار ہے؟

۵ کیا اجتماعی مشکلات کو ختم کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی صحیح راستہ ہے؟ مستضعفین کے بارے میں ہمارا شرعی وظیفہ اور ذمہ داری کیا ہے؟

maablib.org

چھٹا سبق

# مسئلہ جبر واختیار

پروردگار عالم کی عدالت کے مسئلے سے مربوط اور نزدیک ترین مسئلہ "جبر واختیار" ہے کیونکہ جبر کے عقیدہ کے قائل لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انسان اپنے ہر عمل، روش اور گفتگو میں بااختیار نہیں ہے بلکہ اس کے جسم کی تمام حرکات ایک ماشین کے پرزوں کے مانند ہیں۔ جس طرح ایک ماشین کے تمام پرزے جبری طور پر حرکات کرتے ہیں اسی طرح انسان بھی اپنی تمام حرکات میں مجبور ہے۔

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جبر واختیار کا عقیدہ عدل الٰہی کے مسئلے سے کیا مناسبت رکھتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ مذہب اشاعرہ کے پیروکاروں (کہ جن کا تعارف ہم گذشتہ اسباق میں پیش کر چکے ہیں اور وہ حُسن وقبح عقلی کے منکر ہوئے ہیں) نے عقیدہ جبر کو اختیار کیا ہے اور عدالت الٰہی کا انکار کیا ہے کیونکہ جبر کا عقیدہ قبول کرنے کے بعد عدالت الٰہی کے مسئلے کے بارے میں بحث کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اس بحث کو مزید واضح کرنے کے لیے ہم بعض موضوعات کے متعلق دقیق بحث کرتے ہیں۔

عقیدۂ جبر کا سرچشمہ

ہر شخص اپنے وجود کی گہرائیوں میں یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کوئی بھی ارادہ کرنے میں آزاد ہے، مثلاً وہ اپنے فلاں دوست کی مالی مدد کرے یا نہ، یا پیاس کی

حالت میں اپنے سامنے رکھے ہوئے پانی کو پیئے یا نہ پیئے، یا فلاں شخص نے اس کے بارے میں زیادتی کی ہے۔ وہ اگر چاہے تو اس کو معاف کردے یا اسے معاف نہ کرے یا ایک ایسا شخص کہ جس کے ہاتھ بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے کانپتے ہیں اور وہ شخص کہ جس کے ہاتھ ارادہ کے ساتھ حرکت میں آتے ہیں ان دونوں کے درمیان ہی وہ فرق قائم کرسکتا ہے۔

اب جب کہ انسانوں کے درمیان یہ عمومی احساس پایا جاتا ہے کہ وہ ارادہ کرنے میں آزاد ہیں تو پھر لوگوں کے ایک گروہ نے جبر کے عقیدے کو کیوں اختیار کیا ہے؟ البتہ اس مسئلہ کے متعلق مختلف دلائل پیش کیے جاتے ہیں اور ہم بھی ایک اہم دلیل کو یہاں پر پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ انسان دیکھتا ہے کہ ماحول کے لوگوں پر اثرات ہوتے ہیں۔ اسی طرح تربیت، نصیحت، ہدایت و تبلیغ اور عمومی رسم و رواج بھی بلاشبہ انسانی فکر اور روح پر اثرانداز ہوتے ہیں اور بعض اوقات اس کی مالی و اقتصادی حالت بھی اس کی بعض حرکات کا باعث بنتی ہے وراثت کے عامل کا مؤثر ہونا بھی ناقابل انکار ہے۔

یہ تمام اُمور اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ انسان یہ خیال کرتا ہے کہ وہ بااختیار نہیں ہے بلکہ بہت سے اندرونی و بیرونی عوامل اکٹھے ہوکر ہمیں اُبھارتے ہیں کہ ہم کچھ کرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ اگر یہ عوامل نہ ہوتے تو بہت سے کام ہم سے سرزد ہی نہ ہوتے۔ ان تمام اُمور کو ہم ماحول کا جبر، اقتصادی شرائط کا جبر، تعلیم و تربیت کا جبر اور وراثتی جبر کے ناموں سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ ان عوامل میں سے "مکتبِ جبر" فلاسفہ کی زیادہ توجہ کا مرکز بنا ہے۔

## جبر کے معتقد افراد کی غلط فہمی کی اصل وجہ

یہ ہے کہ وہ غور و فکر کرتے وقت ایک بنیادی نکتے کو فراموش کربیٹھے ہیں اور وہ

نکتہ یہ ہے کہ بحث ''مختلف اور ناقص اسباب'' میں نہیں ہے بلکہ بحث ''کامل اسباب'' میں ہے یا ایسے کہہ سکتے ہیں کہ کوئی بھی شخص ''ماحول، رواج'' اور ''اقتصادی عوامل'' کا انسانی افعال اور اس کی فکر میں اثر انداز ہونے کا انکار نہیں کرسکتا۔ اصل بحث اس میں ہے کہ ان تمام اسباب کے باوجود پھر بھی آخری فیصلہ ہمیں ہی کرنا ہوتا ہے۔

کیونکہ ہم واضح طور پر احساس کرتے ہیں حتیٰ کہ ایک غلط اور طاغوتی نظام (جیسے شہنشاہی نظام) میں انحراف کے بہت سے مواقع موجود تھے مگر ہم مجبور نہیں تھے کہ منحرف ہوجائیں، اسی نظام و معاشرے میں ہمارے لیے یہ ممکن تھا کہ ہم ''رشوت'' نہ لیں، فساد اور فحاشی کے مراکز کا رُخ نہ کریں اور بے قید و بند اور لاأبالی نہ ہوں۔

لہٰذا ان مواقع کو ''علت تامہ'' سے الگ کرنا ضروری ہے۔ یہی دلیل ہے کہ بہت سے افراد ''غیر مہذب خاندان'' یا ''پست ماحول'' میں پرورش پاتے ہیں یا وراثت کے اعتبار سے غیر مناسب مسائل کا سامنا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اپنے لیے الگ اور صحیح راہ کا انتخاب کرتے ہیں یہاں تک کہ بہت سے یہی افراد اس قسم کے ماحول اور معاشرے کے خلاف کام کرتے ہوئے اسے بدل کر رکھ دیتے ہیں، ورنہ اگر یہ ضروری ہو کہ ''تمام انسان ماحول، کلچر اور زمانے کی ہوا کے تابع ہوتے تو دنیا میں کبھی کوئی انقلاب برپا نہ ہوسکتا اور تمام افراد ماحول کی اتباع کرتے ہوئے نیا اور جدید ماحول پیدا کرنے سے قاصر ہوتے۔

مذکورہ بالا تمام گفتگو سے واضح ہوتا ہے کہ تمام مذکورہ عوامل میں سے کوئی بھی عامل ''تقدیر ساز'' نہیں ہے بلکہ صرف مواقع فراہم کرتا ہے۔ اپنا نصیب دراصل انسان کا اپنا ارادہ اور مستحکم عزم بناتا ہے۔

اور یہ بات ایسے ہی ہے کہ ہم ایک انتہائی گرم موسم میں حکم خدا کی اطاعت

کرتے ہوئے روزہ رکھنے کا عزم کریں جبکہ ہمارے وجود کے تمام ذرات پانی کی تمنا رکھتے ہوں لیکن ہم اطاعتِ خدا میں ان کی پرواہ تک نہ کریں جبکہ دوسرا شخص ممکن ہے کہ حکمِ خدا کو سننے کے باوجود روزہ نہ رکھے۔

نتیجہ یہ کہ ان تمام "اسباب" کے باوجود انسان کے پاس عزم و ارادہ جیسی چیزیں ہیں کہ وہ ان کے ذریعے اپنا مقدر خود بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ "جبر واختیار کا مسئلہ" روز اوّل سے آج تک کثرت سے غلط فائدہ اُٹھانے کا باعث بنتا رہا ہے۔ اطراف کے اور قسم کے اسباب کا سلسلہ "جبر" اور انسان کے ارادے کی آزادی کی "نفی" کے عقیدہ کی تقویت کے لیے موثر کردار ادا کرتا رہا ہے۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

الف: سیاسی اسباب

بہت سے جابر و ستم گر حکام، ضروریات سے محروم اور مظلوم لوگوں کے دلوں سے انقلاب کے شعلے کو محو کرنے اور اپنی ناپسندیدہ اور قابل نفرت حکومت کو دوام بخشنے کے لیے ہمیشہ اس فکر کو اُجاگر کرنے کی کوشش میں مصروف رہے ہیں کہ ہم بے اختیار ہیں، ہماری تقدیر ہماری قسمت کا تاریخی جبر ہمارے حال کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ اگر کوئی امیر ہے یا کوئی غربت کی چکی میں پس رہا ہے تو یہ قضا وقدر کے حکم یا تاریخ کے جبر کی وجہ سے ہے۔

واضح رہے کہ اس قسم کا طرز فکر کس حد تک انقلابی افکار کو بے حس کرسکتا ہے؟ اور ان کی آمرانہ سیاست میں ان کی مدد کرسکتا ہے؟ حالانکہ عقلی و شرعی طور پر ہماری "تقدیر" خود ہمارے ہاتھوں میں ہے اور وہ قضا وقدر جس کا معنی "جبر" کیا جاتا ہے اس کا بالکل وجود نہیں ہے۔ الٰہی قضا وقدر ہماری حرکات، خواہشات، ارادہ، ایمان، جستجو اور کوشش کے عین مطابق ہے۔

## ب: نفسیاتی اسباب

اکثر سست، بے کار اور نکمے لوگ اپنی زندگی میں ناکام و نامراد رہتے ہیں، اور ہرگز اس بات کو قبول نہیں کرتے کہ ان کی سستی اور خطائیں ان کی ناکامی و شکست کا باعث بنی ہیں، لہٰذا اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیتے ہوئے "مکتب جبر" کے دامن کو پکڑ لیتے ہیں اور اپنی قسمت کو اپنی ناکامیوں کی وجہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں: "ہم کیا کریں ہماری قسمت تو روز اوّل سے ہی سیاہی کے ساتھ لکھی گئی ہے اور اسے زم زم یا حوضِ کوثر کے پانی سے بھی سفیدی میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ ہم بااستعداد بھی ہیں اور ہم نے کوشش بھی کی ہے مگر افسوس کہ ہماری قسمت نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔

## اجتماعی اسباب

بعض افراد چاہتے ہیں کہ وہ آزادی کے ساتھ ہوا و ہوس کی راہوں پر چلیں اور ہر وہ گناہ جو ان کی حیوانی خواہشات کے مطابق ہو اس کا ارتکاب کریں۔ اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو قانع رکھتے ہیں کہ وہ گناہ گار نہیں ہیں اور معاشرے میں بھی اس قسم کا تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ بے گناہ ہیں۔

لہٰذا وہ "عقیدۂ جبر" کی پناہ تلاش کرتے ہیں اور اپنی ہوس بازی کی توجیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تمام کام ہم سے اس وجہ سے صادر ہوئے ہیں کہ ہم اپنے کاموں میں بااختیار نہیں ہیں۔

لیکن ہم بخوبی جانتے ہیں کہ ان کا یہ عقیدہ جھوٹ کے علاوہ کچھ نہیں ہے، حتیٰ کہ اس قسم کی باتیں کرنے والے لوگ خود بھی جانتے ہیں کہ ان کی تمام باتیں اور یہ عذر بے بنیاد ہیں لیکن "عارضی لذت" اور جلد ختم ہونے والے منافع ان کی عقل پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور ان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ اس

حقیقت کا برسرِ عام اقرار کرسکیں۔

پس ضروری ہے کہ معاشرے کو اس جبری طرزِ تفکر اور قسمت و تقدیر کو جبر کا نتیجہ قرار دینے کے عقیدے سے پاک کرنے کے لیے زبردست کوشش کی جائے کیونکہ (درحقیقت) اس قسم کا عقیدہ سامراجی قوتوں کا بہت بڑا معاون، جھوٹی شکستوں کے لیے مختلف بہانوں کا وسیلہ اور معاشرے کی آلودگی بڑھانے کا بہت بڑا سبب ہے۔

maablib.org

# سوچیے اور جواب دیجیے

۱. ”جبر“ اور ”اختیار“ کے نظریہ کا فرق بیان کریں؟

۲. جبر کا عقیدہ رکھنے والے افراد کس دلیل پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں؟

۳. ماحول، کلچر اور وراثت کے اثرات کا جواب کیا ہے؟

۴. سیاسی، نفسیاتی اور اجتماعی عوامل جو کہ عقیدۂ جبر کے مطابق انسان کو درپیش ہیں، ان کی وضاحت کریں؟

۵. ان عوامل کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

ساتواں سبق

# ارادہ اور اختیار کی آزادی پر واضح ترین دلیل

انسان کا ضمیر (عقیدہ) جبر کی نفی کرتا ہے۔ اگرچہ فلاسفہ اور ماہرین علمِ کلام نے انسان کے ارادے میں آزاد ہونے کے مسئلے میں بہت سے مختلف دلائل پیش کیے ہیں مگر ہم اختصار کے پیش نظر ان دلائل میں سے صرف ایک واضح ترین دلیل "انسان کا عموی ضمیر" (وہ باطنی قوت جو اچھائی اور برائی میں بخوبی تمیز کرتی ہے) کو پیش کرتے ہیں۔

ہم ہر چیز کا انکار کر سکتے ہیں مگر اس بات کا انکار نہیں کر سکتے کہ ہر معاشرے میں (چاہے وہ خدا پرستوں کا معاشرہ ہو یا مادہ پرستوں کا، مشرقی ہو یا مغربی، قدیم ہو یا جدید، ثروت مند ہو یا غریب، ترقی یافتہ ہو یا غیر ترقی یافتہ اور ہر قسم کی تہذیب وتمدن کے افراد اس بات پر متفق ہیں) ایک ایسے "قانون" کا ہونا ضروری ہے کہ جو معاشرے پر حاکم ہو اور لوگ اس قانون کی پیروی میں اپنی ذمہ داری کا احساس کریں اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والے افراد کو سزا دی جا سکے۔

مختصر یہ کہ قانون کی حاکمیت، لوگوں کی طرف سے قانون کا احترام اور خلاف ورزی کرنے والوں کو اس کی سزا جیسے مسائل پر تمام جہان کے عقلا متفق ہیں البتہ صرف وحشی اور تہذیب سے دور اقوام ان تینوں باتوں کو قبول نہیں کرتیں۔

یہ دلیل کہ جسے ہم نے "تمام دنیا کے افراد کا عموی ضمیر" کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ انسان کے اپنے ارادہ میں آزاد ہونے پر سب سے واضح دلیل ہے۔

یہ کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ انسان اپنے ارادے اور اعمال میں تو کسی بھی قسم کا اختیار نہیں رکھتا لیکن قوانین کا احترام اس کے لیے ضروری ہے، اور قوانین کی خلاف ورزی پر اس سے جواب طلبی بھی ضروری ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اور ایسا کیوں نہیں کیا؟ اور خلاف ورزی ثابت ہونے پر کبھی اس کو جیل کی سزا اور کبھی پھانسی کی سزا کا سامنا بھی کرنا پڑے۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے پہاڑوں سے پھسل کر پتھر سڑک پر آجائے اور سفر کرنے والوں کی ہلاکت کا باعث بن جائے اور ہم اس پتھر کو عدالت میں لاکر اس کے خلاف مقدمہ قائم کردیں۔

یہ درست ہے کہ ظاہری طور پر ایک انسان اور پتھر کے ٹکڑے کے درمیان فرق ہے لیکن اگر ہم کہیں کہ انسان اپنے ارادہ میں آزاد نہیں ہے تو پھر یہ فرق بالکل ختم ہوجاتا ہے جس کے نتیجے میں انسان اور پتھر جبری عوامل کے تابع ہوجاتے ہیں۔ پتھر قانونِ جاذبہ کے تحت سڑک کے وسط میں آگرتا ہے، اور انسان جبری عوامل کی وجہ سے جنایت کار، قاتل اور قانون کا مخالف بن جاتا ہے۔

عقیدۂ جبر کے قائل ہونے کی صورت میں ان کے درمیان کسی بھی قسم کا فرق نہیں ہے اور چونکہ کسی نے بھی اپنے ارادے سے فعل انجام نہیں دیا۔ لہٰذا ایک کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرنا اور دوسرے کو چھوڑ دینا کیسے جائز ہوگا؟

ہم دوراہے پر کھڑے ہیں یا تو تمام افراد کے عمومی وجدان کو غلط اور خطا قرار دیں اور تمام قوانین، عدالتوں، مجرمین کو دی جانے والی سزاؤں کو عبث اور بیہودہ بلکہ ظالمانہ کام قرار دیں یا پھر "عقیدۂ جبر" کا انکار کریں۔

بلاشبہ دوسری بات کو ترجیح حاصل ہے۔ قابل ذکر بات تو یہ ہے کہ جبر کا عقیدہ رکھنے والے افراد و مفکرین جب عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو عملی طور پر وہ

"ارادہ کی آزادی" کے عقیدہ پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

کیونکہ اگر کوئی شخص ان کے حقوق کو پامال کرتا ہے یا ان کو تکلیف پہنچاتا ہے تو اس کو سزا کا مستحق تصور کرتے ہیں اور اس کی شکایت عدالت میں جا کر کرتے ہیں اور جب تک اس کو کوئی سزا نہ دی جائے، آرام و چین سے نہیں بیٹھتے۔ پس اگر انسان اپنے ارادے میں آزاد نہیں ہے تو پھر یہ شور و غوغا اور داد و فریاد کیوں کرتے ہیں؟

بہرحال عقلائی جہان کا عمومی ضمیر اس بات پر زندہ دلیل ہے کہ اس حقیقت (آزادی ارادہ) کا اقرار تمام انسان اپنے دل کی گہرائیوں سے کرتے ہیں اور ہمیشہ اسی کے طرف دار ہوتے ہیں اور زندگی کا ایک دن بھی اس عقیدہ کے بغیر نہیں گزار سکتے اور نہ اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی گاڑی اس کے بغیر چلا سکتے ہیں۔

عظیم فلسفی اور علمِ کلام کے ماہر خواجہ نصیرالدین طوسیؒ اپنی کتاب "تجرید الاعتقاد" میں جبر و اختیار کی بحث کرتے ہوئے مختصر مگر جامع الفاظ میں فرماتے ہیں:

والضرورة قاضية باستناد افعلنا الينا

"ہماری عقل و ضمیر اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہمارے تمام افعال و اعمال کی نسبت خود ہماری طرف ہو"۔

## منطق "جبر" کا "مذہب" کی منطق سے تضاد

اب تک ہماری بیان کردہ گفتگو کا تعلق اس بات سے تھا کہ "مکتبِ جبر جہان کے عقلا کے عمومی ضمیر رکھتا" سے تضاد ہے چاہے ان عقلائے عالم میں مذہب کو قبول کرنے والے ہوں یا انکار کرنے والے ہوں۔

ہم مذہبی اعتبار سے بھی ایسے قطعی اور یقینی دلائل رکھتے ہیں کہ جو "عقیدۂ جبر" کے باطل ہونے پر دلالت کرتے ہیں، کیونکہ مذہبی فکر کے مطابق بھی "عقیدۂ جبر" بالکل ناقابل قبول نہیں ہے اور عقیدہ جبر کو قبول کرنے کی صورت میں مذہبی افکار و پروگرام

بھی متاثر بلکہ مخدوش ہو جاتے ہیں کیونکہ ہم خداوند عالم کی عدالت کے مسئلے کو (کہ جس کا مفصل ذکر گذشتہ بحث میں ہو چکا ہے) ''مکتب وعقیدہ جبر'' کی موجودگی میں کیسے ثابت کریں گے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ خداوند عالم پہلے کسی کو غلط کام پر مجبور کرے اور پھر اس سے باز پرس کرے کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟ یہ کسی طور پر بھی منطقی بات نہیں ہے۔

لہٰذا عقیدۂ جبر کو قبول کرنے کی صورت میں ''ثواب وعقاب''، ''جزا وسزا''، ''جنت ودوزخ'' بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اسی طرح وہ تمام مفاہیم بھی جو آیاتِ قرآن میں نامۂ اعمال، الٰہی سوال وحساب، بدکاروں کی مذمت اور صالحین کی ستائش میں ذکر ہوئے ہیں۔ غیر اہم وبے معنی ہو جاتے ہیں کیونکہ اس عقیدے کی بنیاد پر نیکی اور بدی غیر اختیاری طور پر صادر ہوئی ہیں۔

ان تمام حقائق کے علاوہ ہم مذہب میں سب سے پہلے انسان کی تکلیف اور ذمہ داریوں سے متعلق رہنمائی دیکھتے ہیں اور اگر انسان مجبور ہو تو پھر اس بحث اور رہنمائی کا آیا کوئی مطلب ہے؟!

کیا کسی رعشہ کے مریض کو کہہ سکتے ہیں کہ وہ حرکت نہ کرے؟ یا پاؤں سے معذور کو کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے؟

یہی وجہ ہے کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ایک معروف روایت میں مکتبِ جبر کو بت پرستوں کا مکتب اور شیطان کی جماعت قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

> تلك مقالة أخوان عبدة الاوثان وخصماء الرحمٰن وحزب الشيطان (اُصول کافی، ج۱، ص۱۱۹، باب الجبر والقدر)
>
> ''یہ بت پرستوں کے بھائیوں، دشمنانِ خدا اور شیطان کے گروہ کی باتیں ہیں''۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

1. عقیدۂ جبر کے بطلان پر روشن ترین دلیل ذکر کریں؟
2. تمام دنیا کے افراد کا ضمیر "ارادہ کی آزادی" کا اظہار کرتا ہے، اس کی وضاحت کریں؟
3. کیا عقیدۂ جبر کے قائلین عملی طور پر بھی "جبر" کے مطابق عمل کرتے ہیں؟
4. کیا "عقیدۂ جبر"، "خدا کی عدالت" کے موافق ہے؟ اگر نہیں تو کیوں؟
5. ہر قسم کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے لیے انسان کو ارادہ میں آزاد ہونا چاہیے۔ یہ بات کیسے اور کیونکر صحیح ہے؟

اٹھواں سبق

# اَمرُ بَینَ الاَمرَین (یا وسطی مکتب) کیا ہے؟

## جبر کے مقابلہ میں "عقیدۂ تفویض"

عقیدۂ جبر جو کہ "افراط پر مبنی ہے" کے مقابلے میں دوسرا مکتب وعقیدہ بنام "تفویض" موجود ہے جو کہ تفریط پر مبنی ہے۔

عقیدۂ تفویض کے قائل افراد کہتے ہیں کہ خدا نے ہمیں پیدا کرنے کے بعد تمام کام ہمارے سپرد کردیے ہیں اور اب اس کا ہمارے اعمال و افعال کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، لہٰذا ہم اپنے اعمال کی سلطنت میں مستقل اور ان پر حاکم ہیں۔

بلاشک وشبہ یہ عقیدہ بھی "عقیدۂ توحید" کے بالکل موافق نہیں ہے کیونکہ "توحید" نے ہمیں اس بات کی تعلیم دی ہے کہ یہ تمام جہان خدا کی ملکیت ہے اور کوئی بھی چیز اس کی دسترس سے خارج نہیں ہے، حتیٰ کہ ہمارے اعمال ہمارے ارادہ کی آزادی کے باوجود اس کی دسترس اور قدرت سے ہرگز باہر نہیں ہوسکتے وگرنہ شرک کا عقیدہ لازم آتا ہے۔

مطلب کو زیادہ واضح کرنے کے لیے ہم کہتے ہیں کہ ہم دو خداؤں کے قائل نہیں ہوسکتے کہ ان میں سے ایک بڑا خدا کہ جس نے کائنات کو خلق کیا ہے اور دوسرا چھوٹا خدا یعنی انسان، کہ جو اپنے تمام اعمال وافعال میں اتنا آزاد اور صاحب اختیار ہے کہ اب خداوند تعالیٰ بھی اس کے اعمال وافعال پر اس سے بازپرس نہیں کرسکتا۔

یہ واضح شرک ہے اور دو یا چند خداؤں کی پرستش ہے۔

اصلی اور حقیقی بات یہ ہے کہ ہم انسان کو آزاد اور صاحب اختیار بھی تسلیم کرلیں اور خدا کو اس کا حاکم اور اس کے اعمال کا نگران بھی مانیں۔

## مکتب واسطہ (یا درمیانی راہ کا عقیدہ)

اس بحث میں انتہائی قابل غور نکات ہیں اور ہمیں یہ تصور ہرگز نہیں کرنا چاہیے کہ مذکورہ بالا دو باتیں متضاد ہیں، اس بات میں گہری فکر کی ضرورت ہے کہ ہم نہ صرف خدا کی "عدالت" کو مکمل طور پر تسلیم کریں اور لوگوں کے لیے "آزادی اور ذمہ داری" کے قائل ہوں بلکہ اس کی "توحید" وحدانیت اور تمام جہان پر اس کی حاکیت کو بھی صدق دل سے قبول کریں اور یہی وہ نکتہ ہے کہ جسے "اَمرٌ بَینَ الاَمرَین" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے (یعنی وہ عقیدہ کہ جس میں نہ افراط ہے اور نہ ہی تفریط ہے)۔

چونکہ بحث دقیق ہے لہذا ہم اس کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔

فرض کیجیے کہ آپ ایک ایسی ٹرین میں سفر کر رہے ہیں کہ جس کا انجن بجلی سے چلتا ہے۔ اس ٹرین کے ڈرائیور بھی آپ ہیں۔ ایک بہت ہی طاقتور تار (جو کہ تمام راستے میں لائن کے اوپر لگی ہوئی ہے) سے انجن کی چھت پر لگا ہوا مخصوص پنجرہ ملا ہوا ہے اور اس کے ذریعے بجلی تاروں سے انجن میں منتقل ہو کر اس کی حرکت کا باعث بن رہی ہے۔ اگر ایک لحظہ کے لیے بھی بجلی کی منتقلی منقطع ہو جائے تو گاڑی رُک جائے گی۔

بلاشک آپ آزاد ہیں کہ راستے میں جہاں پر آپ چاہیں گاڑی کو روک سکتے ہیں، اسے آہستہ یا تیز کر سکتے ہیں لیکن اس تمام آزادی کے باوجود وہ شخص جو کہ بجلی کے مرکز (پاور اسٹیشن) میں بیٹھا ہوا ہے جب چاہے بجلی کو بند کر کے آپ کی ٹرین کو روک سکتا ہے کیونکہ آپ کی حرکت بجلی کی مرہونِ منت ہے اور اس کی چابی مرکز میں

بیٹھے ہوئے شخص کے ہاتھ میں ہے۔

جب آپ اس مثال میں غور کریں گے تو واضح ہو جائے گا کہ وہ تمام تر آزادی، اختیار اور ذمہ داری کے باوجود کسی اور کے قبضہ میں ہے اور یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

## دوسری مثال

فرض کیجیے کسی حادثے کی وجہ سے کوئی شخص اعصابی طور پر معذور ہو جاتا ہے اور اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے پر قادر نہیں رہتا۔ اگر اس کے اعصاب سے ایک خفیف اور مناسب برقی رو کو گزارا جائے تو اس کے اعصاب گرم ہوکر دوبارہ حرکت پر قادر ہو سکتے ہیں۔ اب یہ شخص جب بھی کوئی کام کرے گا مثلاً اسی ہاتھ سے کہ جس سے برقی رو کا اتصال ہے کسی پر ظلم کرتا ہے، کسی کے چہرے پر طمانچہ مارتا ہے یا کسی بے گناہ کے سینے میں خنجر گھونپ دیتا ہے تو وہ اپنی اس حرکت پر یقیناً جواب دہ ہوگا کیونکہ اس نے ''قدرت اور اختیار'' سے اس فعل کو انجام دیا ہے، لہٰذا ''قادر و مختار'' شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

لیکن وہ جس نے برقی قوت سے طاقت انسان کے ہاتھ میں دی ہے اس پر حاکمیت بھی رکھتا ہے اور یہ انسان اپنی تمام تر آزادی و اختیار کے باوجود اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔

خدا نے ہمیں ہمت و طاقت عطا کی ہے۔ عقل، ہوش اور جسمانی قدرت سے نوازا ہے اور یہ تمام وسائل و انعامات ہر لحظہ خدا کی طرف سے ہمیں پہنچ رہے ہیں۔ اگر ایک لحظہ کے لیے بھی یہ سلسلہ منقطع ہو جائے اور ہمارا خدا سے رابطہ منقطع ہو جائے تو ہم اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔

ہم ہر کام اس کی طرف سے ہر لحظہ عطا کردہ قوت سے ہی انجام دیتے ہیں

حتیٰ کہ ہماری آزادی اور اختیار بھی اسی کی طرف سے عطا کردہ ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہم آزاد ہوں اور اس کی عظیم نعمات کے سایہ میں اپنے آپ کو منزل کمال تک پہنچا سکیں۔

پس ہم اختیار اور ارادہ کی آزادی کے ساتھ ساتھ اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور اس کی بارگاہ میں سر جھکائے ہوئے ہیں اور اس کی دسترس وحاکمیت سے ہرگز فرار نہیں کر سکتے۔ ہم تمام تر قوت اور توانائی کے باوجود اسی کے مرہونِ منت ہیں اور اس کے بغیر کچھ بھی نہیں ہیں اور یہی "اَمرٌ بَینَ الاَمرَین" کا معنی ہے کیونکہ نہ ہم ان موجودات کو خدا کی مثل قرار دیتے ہیں کہ شرک لازم آئے، اور نہ ہی بندگانِ خدا کو ان کے اعمال میں مجبور مانتے ہیں کہ جس کے نتیجے میں ظلم لازم آئے۔ (غور وفکر فرمائیں)

ہم نے اس بات کا درس مکتب ائمہ اہلِ بیت علیہم السلام سے حاصل کیا ہے کیونکہ جب ان سے سوال کیا جاتا تھا کہ کیا جبر اور تفویض کے درمیان تیسرا راستہ بھی ہے؟ تو وہ فرماتے تھے: "ہاں"۔ تیسرا راستہ بھی موجود ہے جو کہ زمین اور آسمان کے درمیان فاصلے سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ (اُصول کافی، ج۱، ص ۱۲۱، باب الجبر والقدر والامر بین الامرین)

## قرآن اور جبر واختیار کا مسئلہ

قرآنِ مجید واضح طور پر انسان کے ارادہ میں آزاد ہونے کی بات کرتا ہے اور اس مطلب پر قرآنِ مجید میں سیکڑوں آیات ذکر ہوئی ہیں۔

الف: وہ تمام آیات کہ جن میں اوامر ونواہی اور ذمہ داریوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان اپنے ارادہ اور اختیار میں آزاد ہے کیونکہ اگر انسان آزاد نہ ہو تو اس کو بعض کاموں کا حکم دینا اور بعض کاموں سے روکنا عبث، لغو اور بے ہودہ شمار ہوگا (جبکہ قرآن ان نقائص سے پاک ہے)۔

ب: وہ آیات جو بدکاروں کی مذمت اور اچھے لوگوں کی ستائش میں ہیں انسان کے خودمختار ہونے پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ "جبر" کی صورت میں ملامت یا مدح وستائش بے معنی ہوں گے۔

ج: وہ تمام آیات "جن میں قیامت سے متعلق سوال، اور اس خوف ناک دن کے "فیصلے کا دن" ہونے اور پھر اس کے نتیجے میں عتاب یا انعام اور دوزخ یا جنت کا ذکر ہے"۔ انسان کے بااختیار ہونے پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ "جبر" کی صورت میں ان آیات کا کوئی مفہوم نہیں ہوگا اور سوال و جواب، روز قیامت کی عدالت میں پیشی اور بدکاروں کو سزا "ظلم محض" شمار ہوں گے۔

د: وہ آیات جو انسان کو اس کے اعمال کا مرہونِ منت قرار دیتی ہیں، جیسے:

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (سورۂ مدثر، آیت ۳۸)

"ہر شخص اپنے عمل کا گروی ہے"۔

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ (سورۂ طور: آیت ۲۱)

"ہر شخص اپنے عمل کا گروی ہے"۔

واضح طور پر انسان کے صاحب اختیار ہونے کو ثابت کرتی ہیں۔

ھ: إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (سورۂ دہر: آیت ۳)

"ہم نے اسے راستے کی ہدایت کردی خواہ شکرگزار بنے یا ناشکرا"۔

اور اس جیسی دیگر آیات بھی ہمارے مدعا کو ثابت کرتی ہیں۔

قرآن مجید میں بعض ایسی تعبیرات کا ذکر ہوا ہے کہ جو عقیدہ أمرٌ بَيْنَ الْأَمْرَيْن پر دلالت کرتی ہیں مگر بعض ناآگاہ قسم کے افراد نے ان آیات کو عقیدۂ جبر کے حق میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً:

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا

(سورۂ دہر: آیت ۳۰)

"اور تم لوگ صرف وہی چاہ سکتے ہو جو اللہ چاہتا ہے"۔

یہ آیت اور اس جیسی دیگر آیات واضح طور پر دلالت کرتی ہیں کہ (خدا) انسان سے اس کے ارادہ و اختیار کو سلب نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ آیات اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے ہیں کہ تم تمام اختیارات اور آزادی کے باوجود قبضۂ قدرت خدا میں ہو۔

maablib.org

## سوچیے اور جواب دیجیے

١ ''تفویض'' سے کیا مراد ہے؟ اور اس عقیدہ میں کیا عیب ہے؟

٢ مکتب ''اَمرٌ بَینَ الاَمرَین'' کی تعلیم ہم نے ائمہ اہل بیتؑ سے حاصل کی ہے۔ اس مطلب کو مثال کے ساتھ واضح کریں؟

٣ ''جبر'' اور ''اختیار'' کے بارے میں آیات قرآنی کیا کہتی ہیں؟

٤ اگر ہم ''عقیدۂ جبر'' کو صحیح تسلیم کرلیں تو پھر روز قیامت، جنت وجہنم اور سوال و جواب کے عقیدہ پر کیا نقص لازم آتا ہے؟

٥ کیا وَمَا تَشَآءُونَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ اور اس جیسی دیگر آیات ''جبر'' پر دلالت کرتی ہیں؟

maablib.org

نواں سبق

# ہدایت اور گمراہی خدا کے ہاتھ میں!

## ہدایت اور گمراہی کی اقسام

ایک مسافر آپ کے پاس ایک ایڈریس لے کر آتا ہے اور آپ سے رہنمائی کا طلب گار ہے۔ آپ کے پاس اس کی رہنمائی کے دو طریقے ہیں:

● اول: آپ اس کے ہمراہ روانہ ہوتے ہیں اور تمام تر نیکی و حُسنِ سلوک کے ساتھ اسے اس کی مطلوبہ جگہ تک پہنچا کر واپس آجاتے ہیں۔

● دوم: آپ ہاتھ کے اشارے یا مختلف نشانیوں کے ذریعے اسے مطلوبہ جگہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

بے شک آپ نے دونوں صورتوں میں اس کو "ہدایت" کی ہے تاکہ وہ اپنی مطلوبہ جگہ تک پہنچ سکے، لیکن ان دونوں میں ایک واضح فرق ہے۔ دوسرا طریقہ صرف (ارائۂ طریق یعنی) راستے کا دکھاتا ہے جب کہ پہلا طریقہ (ایصال بہ مطلوب یعنی) مطلوبہ جگہ یا شخص تک پہنچاتا ہے۔ قرآنِ مجید اور اسلامی روایات میں ہدایت کے ان دونوں معانی کا ذکر کیا گیا ہے۔

ایک اور اعتبار سے کبھی ہدایت صرف "تشریعی" جنبہ کی حامل ہوتی ہے، یعنی مختلف قوانین اور دستورات کے نتیجے میں واقع ہوتی ہے اور کبھی "تکوینی" جنبہ اس میں کارفرما ہوتا ہے۔ یعنی خلقت کی راہوں سے ہدایت کی جاتی ہے جیسے ایک انسان کامل بننے کی طرف ایک نطفہ کے مراحل میں ہدایت، یہ دونوں معانی (جنبہ تشریعی و

جنبہ تکوینی) بھی قرآن مجید اور روایات اسلامی میں ذکر ہوئے ہیں۔

اب جب کہ ہدایت کی اقسام واضح ہو چکی ہیں تو اصل مطلب کو شروع کرتے ہیں (یاد رہے کہ ہدایت کے مقابلہ میں گمراہی ہے)۔

ہم بہت سی آیات میں پڑھتے ہیں کہ ہدایت اور گمراہی خدا کے کام ہیں۔ بلاشبہ ''ارائۂ طریق'' کا تعلق خدا سے ہے کیونکہ اس نے اپنے نمایندے (پیغمبرانؑ) بھیجے اور آسمانی کتب کو نازل کیا تاکہ وہ انسانوں کی صحیح راستے کی طرف رہنمائی کریں۔

لیکن جہاں تک زبردستی ''اِیصَالٌ اِلَی المَطلُوب'' یا جبراً صحیح مقصد تک ہاتھ پکڑ کر پہنچانے کا تعلق ہے تو یہ چیز یقیناً ''ارادہ و اختیار کی آزادی'' کے خلاف ہے لیکن چونکہ خداوند عالم نے منزل مقصود تک پہنچانے کی تمام قوتیں ہمارے حوالے کردی ہیں اور وہی وہ ذات ہے کہ جو ہمیں اس چیز کی توفیق بھی دیتی ہے لہٰذا ہدایت کا دوسرا معنی بھی خداوند متعال کی طرف سے ہے یعنی تمام اسباب اور مقدمات کو انسان کے اختیار میں دے دیا گیا ہے گویا اسے منزل مقصود پر ہاتھ سے پکڑ کر پہنچا دیا گیا ہے۔

## ایک اہم سوال

یہ ہے کہ ہم قرآنی آیات میں پڑھتے ہیں کہ خدا جسے چاہے ہدایت کرتا ہے اور جسے چاہے گمراہ کرتا ہے جیسے یہ آیت مجیدہ:

فَیُضِلُّ اللّٰہُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ وَ ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (سورۂ ابراہیم، آیت ۴)

''(پھر اس کے بعد) اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہی بڑا غالب آنے والا اور حکمت والا ہے''۔

بعض سادہ لوح افراد قرآن کی دوسری آیات اور ان آیات کی تفسیر کو دیکھے بغیر فوراً یہ سوال کرتے ہیں کہ خدا جسے چاہے ہدایت دے اور جسے چاہے گمراہ کردے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ پس ہم نے کیا گناہ کیا ہے کہ خدا ہمیں بلاوجہ گمراہ کردے؟!

لہٰذا ضروری ہے کہ ہمیشہ آیات قرآن کا تجزیہ وتفسیر کرتے وقت ان کا دوسری آیات سے باہمی رابطہ مدنظر رکھنا چاہیے تاکہ ان کے اصلی وحقیقی مفہوم کو سمجھا جاسکے۔

ہم یہاں پر کچھ مزید آیات کو پیش کرتے ہیں جو ہدایت اور گمراہی کے متعلق ہیں تاکہ مذکورہ بالا آیت کے ساتھ ملا کر ایک صحیح واصلی نتیجہ حاصل کیا جاسکے۔

سورۂ ابراہیم کی آیت نمبر ۲۷ میں ہے:

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ○

''اللہ ظالموں کو گمراہ کردیتا ہے''۔

سورۂ غافر کی آیت نمبر ۳۴ میں ہے:

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ

''اس طرح اللہ ان لوگوں کو گمراہ کردیتا ہے جو تجاویز کرنے والے (اور) شک کرنے والے ہوتے ہیں''۔

سورۂ عنکبوت کی آیت نمبر ۶۹ میں ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

''اور جو ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انھیں ضرور اپنے راستے کی ہدایت کریں گے''۔

جیسا کہ ہم مشاہدہ کررہے ہیں کہ خدا کی مشیت اور ارادہ بلاوجہ نہیں ہے۔ نہ

تو خدا کسی کو بلاوجہ ہدایت دیتا ہے اور نہ ہی کسی کو بغیر کسی وجہ کے گمراہ کرتا ہے اور اس سے توفیقات کو سلب کر لیتا ہے۔

وہ لوگ جو اس کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، جنگ کی مشکلات کو برداشت کرتے ہیں، نفسانی خواہشات کا مقابلہ کرتے ہیں اور خدا کے دشمنوں کے خلاف ثابت قدم رہتے ہیں خدا نے ان کو ہدایت کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور یہ وعدہ عدالت کے عین مطابق ہے۔

لیکن وہ لوگ جو ظلم وستم کی بنیاد رکھتے ہیں اور ہمیشہ تجاوز، شک، تردید اور شیطانی وسوسہ کو لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، خداوندعالم ان سے ہدایت کی توفیق چھین لیتا ہے اور ان کے ان برے اعمال کی وجہ سے ان کے دل تاریک ہوجاتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ سعادت کی منازل تک پہنچنے سے قاصر رہتے ہیں اور خدا کی طرف سے گمراہ کردینے کا مطلب یہی ہے، یعنی پروردگار ہمارے برے اعمال کا نتیجہ خود ہمارے اختیار میں دے دیتا ہے اور یہ بھی عین عدالت ہے (دقت فرمائیں)۔

## خدا کا ازلی علم گناہ کرنے کی وجہ ہے؟!

جبر واختیار کی بحث میں آخری بات کہ جس کا ذکر ضروری ہے، یہ ہے کہ بعض عقیدہ جبر رکھنے والے افراد نے اپنے گناہوں کی پردہ پوشی کرنے کے لیے "خدا کے علم ازلی" کو بطور بہانہ پیش کیا ہے۔

وہ کہتے ہیں: کیا خدا جانتا ہے کہ فلاں شخص فلاں وقت کسی دوسرے شخص کو قتل کردے گا یا شراب پینے کا ارتکاب کرے گا؟ اور ہم کہیں کہ خدا نہیں جانتا تھا تو ہم خدا کے علم کا انکار کرتے ہیں۔ اور اگر کہیں کہ جانتا تھا تو ضروری ہے کہ اس کام کو (اگرچہ برا ہی ہو) انجام دیا جائے تاکہ خدا کے علم میں کوئی نقص لازم نہ آئے۔

لہٰذا علم خدا کے صحیح اور سچا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ گناہ گار مجبوراً گناہ کو انجام دیں اور اطاعت گزار مجبوراً اس کی اطاعت کریں۔

لیکن اس قسم کے افراد جو کہ اپنے گناہوں اور خطاؤں پر پردہ ڈالنے کے لیے اس قسم کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔ اس حقیقت سے غافل ہوتے ہیں کہ "ہم کہتے ہیں خدا روز اوّل سے ہی جانتا ہے کہ ہم اپنے ارادے، اختیار اور طبیعت کے میلان کی وجہ سے اطاعت یا گناہ کریں گے" یعنی ہمارا اختیار اور ارادہ بھی خدا کے علم میں ہے۔ پس اگر ہم مجبور ہوں تو خدا کا علم جہالت میں تبدیل ہو جائے گا (دقت فرمائیں)۔

اس بات کو مزید واضح کرنے کے لیے ہم کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں:

فرض کریں کہ ایک استاد کو اس بات کا علم ہے کہ اس کی کلاس کا فلاں شاگرد اپنی سستی اور نالائقی کی وجہ سے فیل ہو جائے گا۔ اس کا یہ علم سو فی صد صحیح ہے کیونکہ اس کے سالہا سال کے تجربات پر مبنی ہے۔

کیا فیل ہونے کے بعد وہ شاگرد اپنے اُستاد کے گریبان کو پکڑ کر کہہ سکتا ہے کہ تمھاری پیشین گوئی نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں فیل ہو جاؤں؟!

اس سے بھی بہتر مثال یہ کہ فرض کریں ایک نیک سیرت اور بے خطا انسان ایک بڑے حادثے کے وقوع سے قبل اس سے آگاہ ہو جاتا ہے اور کسی مصلحت کی وجہ سے اس معاملے میں دخل اندازی نہیں کرتا، کیا اس نیک سیرت شخص کا علم اس مجرم کے جرم اور ذمہ داری کو ختم کر دے گا اور اس مجرم کو جرم کرنے کے لیے مجبور کرے گا؟! (دقت فرمائیں)

یا فرض کریں ایک ایسے جدید ترین کمپیوٹر کی ایجاد ہوتی ہے جو آیندہ ہونے والے حوادث کی خبر کچھ گھنٹے پہلے ہمیں بتا دیتا ہے۔ اب ہمیں وہ کمپیوٹر دقیق اطلاع

دیتا ہے کہ فلاں شخص اپنے مکمل اختیار اور ارادے سے فلاں کام فلاں وقت کرے گا۔ کیا یہ پیشین گوئی کسی پر جبر وزبردستی کہلائے گی؟! کہ وہ خواہ مخواہ اب اس کام کو انجام دے؟

خلاصۂ کلام یہ کہ علم خدا کسی کو بھی ہرگز کسی کام پر مجبور نہیں کرتا۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱. ہدایت کی کتنی اقسام ہیں؟ وضاحت کریں۔

۲. کچھ ایسی آیات کی وضاحت کریں جن میں ہدایت اور گمراہی کی نسبت خداوند متعال کی طرف دی گئی ہے؟

۳. ہدایت الٰہی اور ضلالت الٰہی سے کیا مراد ہے؟

۴. "خدا کے ازلی علم" سے کیا مراد ہے؟

۵. کیا خدا کا ازلی علم ہمارے اختیار اور ذمہ داریوں کو ختم کر دیتا ہے؟ مثال دے کر اس بات کی وضاحت کریں۔

maablib.org

دسواں سبق

# خدا کا عدل اور مسئلہ "خلود"

اور ہم جانتے ہیں کہ قرآنِ مجید واضح طور پر گناہگاروں اور کفار کے ایک گروہ سے متعلق کہتا ہے کہ ان کی سزا دائمی ہمیشہ ہے، یعنی بالفاظ دیگر "خلود" پر مبنی ہوگی۔

سورۂ توبہ کی آیت ۶۸ میں ارشادِ خداوندی ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا

"اللہ نے منافق مردوں اور منافقہ عورتوں اور کافروں سے آتشِ جہنم کا وعدہ کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔

اسی طرح آیت نمبر ۷۲ میں باایمان مرد اور خواتین کے ساتھ بہشت کے باغات کا وعدہ بھی ہمیشہ کے لیے ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا

"اللہ نے مومن مردوں اور مومنہ عورتوں سے ایسے (جنت کے) باغات کا وعدہ کر رکھا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس بات کو تسلیم کیا جاسکتا ہے "ایک انسان جس نے زیادہ سے زیادہ اسی (۸۰) سال یا سو سال زندگی گزاری ہو اور

مختلف گناہ اس سے سرزد ہوئے ہوں، اسے لاکھوں، کروڑوں بلکہ اس سے بھی زیادہ سال سزا دی جائے۔

البتہ یہی مطلب نیک اعمال کی جزا کے سلسلہ میں زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہے کیونکہ خدا کی رحمت ایک سمندر سے بھی زیادہ وسیع ہے اور جزا جتنی زیادہ ہوگی خدا کی رحمت اور اس کے فضل کے عین مطابق ہوگی۔

لیکن برے اعمال اور محدود گناہوں کے نتیجے میں ہمیشہ کے لیے اس کو عذاب میں مبتلا رکھنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے اور خداوند متعال کی عدالت کو دیکھتے ہوئے اتنی دائمی سزا کی کیا وجہ بیان کی جاسکتی ہے؟

کیا گناہ اور اس کی سزا کے درمیان مطابقت نہیں ہونی چاہیے؟ (یعنی جتنا گناہ کیا جائے اتنی ہی سزا دی جائے)۔

جواب: اس گفتگو اور ان سوالات کے درست جوابات کے لیے چند نکات سے متعلق گہرائی تک غور وفکر کی ضرورت ہے:

الف: قیامت اور اس کے بعد کی سزائیں اس جہان کی سزاؤں سے کسی طور پر بھی شباہت نہیں رکھتیں مثلاً اگر کوئی شخص دنیا میں کوئی غلط کام، چوری وغیرہ کرتا ہے تو اسے ایک خاص عرصہ تک قید کر دیا جاتا ہے لیکن قیامت کی سزائیں اس کے گناہوں اور اعمال کے آثار اور اس کے کاموں کی خصوصیات کے اعتبار سے ہیں۔

زیادہ واضح الفاظ میں گناہ گاروں کی تمام سزائیں جن کا سامنا وہ اگلے جہان میں کریں گے، درحقیقت ان کے اپنے کیے گئے گناہوں کا نتیجہ ہے جو ان کے دامن گیر ہوگا۔

اس مقام پر قرآن مجید میں واضح تعبیر موجود ہے۔ سورۂ یٰسین کی آیت نمبر ۵۴ میں ارشاد خداوندی ہو رہا ہے:

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ

"اس روز کسی پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا جائے گا اور تمھیں بس وہی بدلہ دیا جائے گا جیسا تم عمل کرتے رہے ہو"۔

ایک سادہ سی مثال ہے۔ ہم اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک شخص منشیات اور شراب وغیرہ کا کثرت سے استعمال کرتا ہے۔ اسے اس قبیح کام سے جتنا بھی منع کیا جاتا ہے اور اسے کہا جاتا ہے کہ ان زہریلی چیزوں کے استعمال سے تمہارا معدہ خراب ہو جائے گا۔ تمہارے دل کی حرکت متاثر ہوگی اور تمہارے اعصاب مجروح ہو جائیں گے مگر وہ ان باتوں کی بالکل پرواہ نہیں کرتا۔

چند ہفتے یا چند ماہ وہ اس خیالی لذت میں مبتلا رہتا ہے اور بتدریج مختلف بیماریوں معدہ کے زخم، دل اور اعصاب کی کمزوری کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر دسیوں سال (اپنی عمر کے آخر تک) ان بیماریوں میں مبتلا ہو کر شب و روز ان کی اذیت میں گزارتا ہے۔ کیا یہاں پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اس شخص نے تو چند روز یا چند ماہ منشیات کا استعمال کیا تھا مگر کیوں وہ تا حیات امراض میں مبتلا ہو گیا؟

اس اعتراض کے جواب میں فوراً کہا جائے گا کہ یہ اس کے اعمال کا نتیجہ ہے یہاں تک کہ اگر وہ حضرت نوحؑ سے بھی زیادہ عمر پائے اور اسے ہم ہمیشہ بیماری کی اذیت میں مبتلا دیکھیں تو تب بھی ہم کہیں گے کہ اس نے دانستہ اور آگاہ ہونے کے باوجود ان تمام امراض کو خود اپنے لیے تیار کیا ہے۔

روز قیامت کی جزا و سزا اس (چند سالہ یا کئی سالہ بیماری) سے بھی زیادہ ہے لہٰذا عدالت خدا پر کسی بھی قسم کا اعتراض باقی نہیں رہتا۔

ب: بعض افراد یہ گمان کرتے ہیں کہ سزا کی مدت اور زمانہ اتنا ہی ہونا

چاہیے جتنا گناہ کا زمانہ ہے۔ یہ ایک بڑی غلطی ہے کیونکہ گناہ اور اس کی سزا کے درمیان زمانے کے اعتبار سے کوئی ربط نہیں ہے بلکہ سزا کا تعلق اس گناہ کی کیفیت اور نتیجہ سے ہے۔

مثلاً ایک شخص صرف ایک لحظہ میں کسی انسان کو بے جرم وخطا قتل کر دیتا ہے۔ اس دنیا کے بعض قوانین کے مطابق اس کو عمر قید کی سزا دی جاتی ہے۔ اس مثال میں قتل کرنے کی مدت ایک لحظہ ہے، جبکہ سزا دسیوں سال پر محیط ہے۔ کوئی شخص بھی اس سزا کو "ظالمانہ سزا" شمار نہیں کرتا کیونکہ یہاں پر منٹ، گھنٹے، مہینے یا سال کی بات نہیں ہے بلکہ اس گناہ کی کیفیت اور نتیجہ کو دیکھا جائے گا۔

ج: "خلود و ہمیشگی" اور جہنم کی دائمی سزائیں صرف ان لوگوں کے لیے ہیں کہ جنھوں نے نجات کے تمام راستے اپنے اُوپر بند کر لیے ہیں اور جان بوجھ کر فساد، تباہی، کفرونفاق میں غرق ہیں اور گناہوں نے ان کے سارے وجود کو ایسا تاریک کر دیا ہے کہ وہ مجسم گناہ بن کر رہ گئے ہیں۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۸۱ میں ایک خوب صورت تعبیر کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

بَلٰى مَنۡ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتۡ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ‌ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ

"جو کوئی بدی اختیار کرے اور اس کے گناہ اس پر حاوی ہو جائیں تو ایسے لوگ اہلِ دوزخ ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔

اس قسم کے افراد نے مکمل طور پر خداوند عالم سے اپنا رابطہ منقطع کر لیا ہے اور نجات کے تمام راستے اپنے اُوپر بند کر لیے ہیں۔ گویا ان افراد کی مثال اس پرندے کی طرح ہے جو اپنے پروں کو توڑ کر آگ لگا دے اور ہمیشہ کے لیے آسمان

کی طرف پرواز کرنے سے محروم رہے اور زمین پر رہنے پر مجبور ہو جائے۔

مذکورہ بالا تینوں نکات اس حقیقت کو روشن کرتے ہیں کہ دائمی عذاب کا مسئلہ جو کہ منافقین اور کفار کے ساتھ مخصوص ہے، ہرگز "عدالتِ الٰہی" کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ ان کے برے اعمال کا نتیجہ ہے اور ان کو پہلے ہی اس بات سے پیغمبرانِ الٰہی کے ذریعے آگاہ کیا جا چکا ہے کہ ان کاموں کا نتیجہ انتہائی تلخ اور برا ہے۔

اگر یہ افراد جاہل ہوں، انبیاء کی دعوت ان تک نہ پہنچی ہو اور انھوں نے جہالت اور نادانی کی بنیاد پر ان اعمال کا ارتکاب کیا ہو تو یقیناً وہ اس سزا کے مستحق نہیں ہوں گے۔

اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ آیات قرآن اور روایات اسلامی سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمتِ الٰہی کا سمندر اس قدر بڑا اور وسیع ہے کہ خطاکاروں کے بہت بڑے بڑے گروہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بخشے جائیں گے۔

کچھ گروہ شفاعت کے ذریعے — کچھ گروہ معافی کے ذریعے۔ اور کچھ گروہ معمولی نیکی کر کے خدا کے فضل سے کثیر اجر پا کر بخشے جائیں گے اور کچھ گروہ ایک مدت تک دوزخ میں اپنے برے اعمال کی سزا پا کر اور الٰہی بھٹی سے گزر کر پاک وصاف ہو کر رحمت اور نعمات الٰہی سے بہرہ مند ہوں گے۔

صرف ایک گروہ جہنم میں ہمیشہ کے لیے باقی رہ جائے گا اور وہ گروہ حق کے خلاف اپنی دشمنی اور لجاجت، ظلم وفساد اور بے حد منافقت کی وجہ سے سرتاپا کفر اور بے ایمانی کے گہرے اندھیروں میں ڈوبا ہوا گروہ ہوگا۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ بعض افراد جہنم کی دائمی سزا کو خدا کے عدل کے خلاف کیوں شمار کرتے ہیں؟

۲ کیا آخرت کی سزائیں اس دنیا کی سزاؤں کی طرح ہیں؟ اگر نہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟

۳ کیا عدالت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ گناہ کی مدت اور سزا کی مدت برابر ہونی چاہیے؟

۴ جہنم کی دائمی سزائیں کن لوگوں کے لیے ہیں؟

۵ عفو الٰہی سے کون لوگ بہرہ مند ہوں گے؟

maablib.org

# نبوت

maablib.org

پہلا سبق

# ہمیں رہبرانِ الٰہی کی احتیاج

## ہمارے علم و دانش کا محدود ہونا

ممکن ہے بعض افراد یہ سوچیں کہ کیا اُصولی طور پر ہماری رہنمائی کے لیے خدا کی طرف سے انبیاءؑ کا مبعوث ہونا ضروری ہے؟ کیا ہماری عقل وفہم حقائق کا اِدراک کرنے کے لیے کافی نہیں ہے؟ کیا انسان کی علمی ترقی پوشیدہ رازوں تک پہنچنے اور تمام حقائق کو واضح کرنے کے لیے اس کی مددگار نہیں ہے؟

اور پھر وہ چیزیں جو انبیاءؑ ہمارے لیے لے کر آئے ہیں وہ دو حال سے خارج نہیں ہیں: ہماری عقل ان کو بخوبی درک کرسکتی ہے یا اس کے برعکس ہماری عقل ان کے اِدراک سے قاصر ہے۔

پہلی صورت میں ہم انبیاءؑ کی زحمت کے محتاج نہیں ہیں جبکہ دوسری صورت میں ہم ان چیزوں (اُصول وقواعد) کو کیوں قبول کریں جو ہماری عقل وخرد کے ہی خلاف ہیں!

بالفاظ دیگر: آیا یہ درست ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں کے اختیار میں دے دے؟ اور ان کے احکامات وارشادات کو بغیر کسی چون وچرا کے قبول کرلے؟ کیا انبیاء ہماری ہی طرح انسان نہیں ہیں؟ ہم اپنے آپ کو کیسے اپنی طرح کے انسانوں کے حوالے کرسکتے ہیں؟

جوابات: چند نکات کی طرف متوجہ ہونے سے ان تمام سوالات کے

جوابات اور انسانی نظام زندگی میں انبیاءؑ کا مقام واضح ہو جائے گا:

① ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارا علم و شعور انتہائی محدود ہے اور اس تمام تر علمی ترقی و وسعت کے باوجود جو کہ بشر کو نصیب ہوئی آج ہم جو کچھ بھی جانتے ہیں اس کے مقابلے میں وہ اشیاء کہ جن کا ہمیں علم نہیں ہے ایسے ہی ہے جیسے پانی کا ایک قطرہ دریا کے مقابلہ میں یا ایک تنکا پہاڑ کے مقابلہ میں یا بعض عظیم دانشوروں کے کہنے کے مطابق: آج ہم جتنا بھی علم رکھتے ہیں وہ اس کائنات کے تمام علم کے مقابلے میں الف، ب شمار ہو سکتا ہے۔ یا یوں کہیں گے کہ حقیقت یہ ہے ہماری عقل تو شعور اور فیصلہ کی جگہ یک انتہائی محدودی ہے کہ جسے علم و دانش کی شعاعوں نے روشن کیا ہے۔ ہم اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں جانتے۔

انبیاءؑ تشریف لائے اور ہماری ضرورت اور حاجت کے مطابق ہماری عقل و شعور کی اس وسیع جگہ کو منور کیا۔ درحقیقت ہماری عقل ایک طاقتور روشنی پھیلانے والی چیز کے مانند ہے، لیکن انبیاءؑ اور الٰہی پیغامات ایک ایسے خورشید کے مانند ہیں جو تمام کائنات کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ کیا کوئی ایسا شخص ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ چونکہ میں خود روشنی پھیلانے والی طاقتور چیز رکھتا ہوں لہٰذا سورج کا محتاج نہیں ہوں؟!

زیادہ بہتر انداز میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کے مسائل کو تین گروہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

① ''معقول'' ② ''غیر معقول'' اور ③ ''مجہول'' انبیاءؑ کبھی بھی غیر معقول بات ''یعنی ایسی چیز جو عقل و خرد کے خلاف ہو'' نہیں کہتے اور اگر وہ کوئی ایسی بات کہیں تو وہ پیغمبر نہیں ہیں۔ انبیاءؑ تو ہماری عقل و شعور کے مددگار ہوتے ہیں تاکہ ہم نامعلوم چیزوں کا علم حاصل کر سکیں اور یہ بات ہمارے لیے بہت اہمیت کی حامل ہے۔

لہٰذا وہ افراد جو زمانہ ماضی میں کہتے تھے کہ عقل و خرد کے ہوتے ہوئے

انبیاءؑ کی ضرورت نہیں ہے جیسے برہمن لوگ جو کہ ہندوستان اور بعض دیگر علاقوں میں رہتے ہیں" یا وہ لوگ جو آج یہ کہتے ہیں کہ اس تمام علمی ترقی اور کامیابیوں کے بعد انسان انبیاءؑ اور ان کی تعلیمات کا محتاج نہیں ہے، تو وہ نہ انسان کے علم و دانش کی وسعت کو جانتے ہیں اور نہ انبیاءؑ کی رسالت کا ادراک رکھتے ہیں۔

یہ لوگ ایسے ہی ہیں کہ جیسے ایک بچہ پہلی کلاس میں ایک ہی سبق پڑھنے کے بعد یہ کہے کہ میں اب تمام چیزوں کو جانتا ہوں اور مجھے کسی معلم یا استاد کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا یہ دعویٰ بے اساس نہیں ہے؟ انبیاءؑ تو صرف معلم ہی نہیں ہیں۔ ان کی رہبری کا مسئلہ ایک الگ بحث کا متقاضی ہے کہ جسے ہم بعد میں تفصیل کے ساتھ ذکر کریں گے۔

۲ کوئی بھی شخص یہ نہیں کہتا کہ انسان اپنے آپ کو اپنے تمام تر اختیارات اور وجود کے ساتھ اپنے ہی جیسے کسی شخص کے حوالے کر دے۔ بحث یہ ہے کہ انبیاءؑ جیسا کہ ہم بعد میں ثابت کریں گے وہ وحی آسمانی کے ساتھ یعنی خداوند متعال کے لامحدود علم کے ساتھ رابطہ رکھتے ہیں اور ہمیں چاہیے کہ ہم قطعی دلائل کے ساتھ ان کے خدا کے ساتھ رابطے کو پہچانیں کہ جس کے نتیجے میں ہم نہ صرف ان انبیاء الٰہی کی باتوں کو قبول کریں گے بلکہ ان کی تعلیمات پر دل و جان سے عمل بھی کریں گے۔

اگر ہم ایک ماہر اور حاذق طبیب کے نسخہ پر عمل کریں تو کیا ہم نے کوئی غلط کام کیا؟ انبیاءؑ ہمارے بہت بڑے روحانی طبیب ہیں۔ اگر ہم اپنے معلم اور اساتذہ کے درس کو جو ہماری عقل و فکر کے مطابق ہے، قبول کر لیں تو کیا یہ ایک غلط فعل ہے؟ انبیاءؑ انسانیت کے سب سے بڑے معلم ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ ہم ان دلائل سے متعلق گفتگو کریں کہ جو خدا کی طرف سے انبیاءؑ کی بعثت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

ہمارے پاس تین ایسی روشن دلیلیں ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم انبیاءؑ کی رہنمائی کے محتاج ہیں:

## تعلیم کے اعتبار سے احتیاج

اگر ہم نُور کی ایک خیالی اور افسانوی سواری پر سوار ہوں اور ہر ایک سیکنڈ میں تیس لاکھ کلومیٹر یا پچاس ہزار فرسخ کی رفتار سے اس لامحدود کائنات کی سیر کریں، کسی شک اور تردید کے بغیر ہمیں حضرت نوح علیہ السلام کی عمر جیسی ہزاروں عمریں درکار ہونی چاہییں تاکہ ہم اس عظیم کائنات کے کسی ایک گوشے کا نظارہ کرسکیں۔

یہ کائنات اپنی ان تمام حیرت اور سحرانگیز وسعتوں کے ساتھ یقیناً بیہودہ اور فضول نہیں بنائی گئیں اور جیسا کہ ہم خداشناسی کے اسباق میں جان چکے ہیں کہ اس کائنات کا کوئی بھی فائدہ یا نفع خدا کے لیے نہیں ہے کیونکہ وہ ایک ایسا وجود ہے جو ہر نظر سے کامل و اکمل، بے نیاز، لامحدود اور ہر قسم کے نقص سے پاک ہے اور اس نے اس کائنات اور انسان کو اس لیے نہیں بنایا کہ اپنے کسی نقص کو دُور کرے۔

لہٰذا ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ خدا کا ہدف یہ تھا کہ دوسروں پر اپنا جود و کرم کرے اور تمام موجودات کو کامل کرے جیسے سورج کہ جو ہم زمین والوں پر چمکتا ہے حالانکہ وہ ہمارا محتاج نہیں ہے۔ سورج کی یہ روشنی صرف ہمارے فائدہ کے لیے ہے وگرنہ ہم سورج کے لیے کون سی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

کیا صرف ہماری معلومات رُشد و تکامل کی راہ طے کرنے اور ایک انسانِ کامل کے مرحلہ تک پہنچنے کے لیے کافی ہیں؟

ہم اس کائنات کے اُسرار و رموز میں سے کتنے رازوں سے آگاہ ہیں؟

اصلاً زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کائنات کب سے وجود میں آئی ہے؟ کوئی بھی شخص ان سوالات کے صحیح اور دقیق جوابات نہیں جانتا۔ یہ سب کچھ کب تک باقی

رہے گا؟ اس کا جواب بھی کسی کے پاس نہیں ہے۔

اجتماعی اور اقتصادی زندگی کے حوالے سے ہر دانشور اپنا ایک الگ نظریہ رکھتا ہے، مثلاً ایک گروہ سرمایہ داری کا قائل ہے جب کہ دوسرا گروہ سوشلزم اور کمیونزم کے نظریات کا حامی اور تیسرا گروہ نہ پہلے کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی دوسرے کو اور دونوں گروہوں کے نظریات کو غلط قرار دیتا ہے۔ اسی طرح زندگی کے دیگر مسائل میں بھی دانشوروں کی آرا بہت زیادہ اور مختلف ہیں۔

انسان حیرت زدہ ہے کہ کون سا نظریہ اختیار کرے؟ اس مقام پر انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس بات کا اعتراف کیا جائے کہ خلقت کے اصلی اور حقیقی ہدف یعنی "انسان کی تمام ابعاد میں پرورش، نمو اور تکامل" تک پہنچنے کے لیے ایسی تعلیمات کی ضرورت ہے کہ جو صحیح، حقیقی، ہر قسم کی خطاؤں سے پاک اور زندگی کے حقائق کے مطابق ہوں۔ ایسی تعلیمات کہ جو اس طویل راہ میں اصلی مقصد تک پہنچنے کے لیے انسان کی مددگار ثابت ہوسکیں۔

اور یہ سب کچھ صرف اور صرف علم خدا یعنی انبیاءؑ کے ذریعے حاصل ہونے والی آسمانی وحی سے ہی ممکن ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا جس نے ہمیں ان راستوں کو طے کرنے کے لیے پیدا کیا ہے ضروری ہے کہ ان کا علم اور معرفت بھی ہمیں عطا کرے۔

## اجتماعی اور اخلاقی مسائل میں رہبری کی ضرورت

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے وجود میں عقل و دانائی کے علاوہ ایک اور قوت بھی موجود ہے کہ جس کا نام "غرائز اور میلانات" ہیں۔ غریزہ خودپسندی، غریزہ خشم و غضب، غریزہ شہوت اور اس قسم کے دیگر میلانات و رجحانات۔

بلاشک وشبہہ اگر ہم اپنے ان غرائز کو بے مہار چھوڑ دیں تو ہماری عقل اور

دانائی قید ہو جائے گی اور انسان تاریخ کے ظالم اور جابر لوگوں کی طرح ایسے بھیڑیے کی شکل اختیار کرلے گا کہ جو ہر اعتبار سے جنگل کے بھیڑیوں سے بھی خطرناک تر ہے۔

ہم اخلاقی تربیت کے لیے ایک تربیت کرنے والے استاد کے محتاج ہیں۔ ایک ''نمونہ'' اور ''اسوہ'' کے محتاج ہیں تاکہ قانون ''محاکات'' ① کے تحت اس کی گفتار و رفتار کے مطابق عمل کرسکیں۔ یہ ضروری ہے کہ ایک کامل اور تربیت یافتہ انسان اس خطرناک اور نشیب و فراز سے پُر راستے میں ہمارا ہاتھ پکڑے اور ہمیں غرائز کے طوفان سے بچائے۔ اخلاقی فضائل کے اُصولوں کو اپنے عمل اور گفتار سے ہمارے دل و جان پر نقش کرسکے۔ شجاعت و توانائی، انسان دوستی، مروت، درگزر کرنا، وفاداری، سچائی، امانت داری اور پاک دامنی کو ہماری روح میں پروان چڑھائے۔

آیا انبیاء معصومینؑ کے علاوہ کوئی ایسا مربی اور رہنما ہمیں مل سکتا ہے؟ اس دلیل کے بعد ممکن نہیں ہے کہ ہمارا مہربان اور ہر شے پر قدرت رکھنے والا خدا ہمیں اس قسم کے رہنماؤں سے محروم رکھے۔

(اس بحث کا باقی حصہ آیندہ سبق میں پڑھیں)۔

---

① محاکات ایک دوسرے سے مشابہ ہونا، کسی چیز یا حالت کی نقل کرنا۔ پس جس سے مشابہ ہونے کی انسان کوشش کرے اور جس ہستی کی نقل کرے اسے نمونہ اور اُسوہ ہونا چاہیے۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ آپ کا علم و دانش جس قدر بھی زیادہ ہو جائے کیا آپ یہ احساس کرتے ہیں کہ آپ کی جہالت آپ کے علم کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے؟ مثال دیجیے۔

۲ کیا آپ اندھی تقلید اور انبیاءؑ کی اطاعت و پیروی کے درمیان فرق واضح کرسکتے ہیں؟

۳ اگر ہم کسی رہنما کے بغیر ایک غیر معلوم راہ کو اختیار کریں تو ہمیں کن خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا؟

۴ ہم انبیاءؑ کی رہنمائی کے کس قدر محتاج ہیں۔ وضاحت کیجیے؟

۵ کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ اس درس کے پڑھنے کے بعد کون سی ایسی شے باقی رہ گئی ہے جو آیندہ سبق میں کہی جائے گی۔

maablib.org

دوسرا سبق

# اجتماعی قانون گزاری کے لیے انبیاء کے وجود کی ضرورت

ہم گذشتہ سبق میں "تعلیم" اور "تربیت" کے حوالے سے وجود انبیاءؑ کی ضرورت کے بارے میں جان چکے ہیں۔ اب ہم اجتماعی قوانین کے لیے انبیاءؑ کے اہم کردار کے بارے میں بحث کریں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ انسانوں کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت کہ جو اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں نظر آتی ہے اور اس کی تمام تر ترقی کا باعث ہے۔ یہی مصروف اجتماعی زندگی ہے۔

بلاشک وتردید اگر انسان ایک دوسرے سے جدا زندگی گزارتے تو آج بھی اس کی فکری سطح اور تہذیب وتمدن پتھر کے زمانے کے انسان جیسی ہی ہوتی۔

جی ہاں! یہ اجتماعی تلاش اور کوشش کا نتیجہ ہی ہے کہ رسم ورواج اور تہذیب و تمدن کا چراغ روشن ہے اور یہ اجتماعی کوشش کا ہی نتیجہ ہے کہ نئے نئے علمی انکشافات اور اختراعات ہمارے سامنے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہم چاند تک پہنچنے کے سفر کو دیکھیں تو یہ کام ایک یا چند بڑے دانش مندوں کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ لاکھوں علما اور دانش مندوں کے ہزاروں سال کے مطالعات، انکشافات اور تجربات کا نتیجہ ہے کہ انسان اس عظمت تک پہنچ سکا۔

یا اگر ایک انتہائی ماہر ڈاکٹر ہمارے زمانے میں ایک مردہ انسان کے قابل استفادہ دل کو نکال کر کسی دوسرے قریب المرگ انسان کے سینے میں لگا کر اسے حتمی

موت سے ایک عرصے تک کے لیے بچالیتا ہے تو یہ ہزاروں بلکہ لاکھوں ڈاکٹروں، طبیبوں اور جراحوں کے طویل تجربات کا نتیجہ ہے کہ جو اساتذہ سے شاگرد در شاگرد منتقل ہوئے ہیں۔

لیکن ان تمام تر اچھائیوں اور برکات کے باوجود اجتماعی زندگی میں بہت سی مشکلات بھی حائل ہیں اور وہ انسانوں کے باہمی منافع اور حقوق کا آپس میں متصادم ہونا اور نتیجہ میں جنگ وجدال کا وجود میں آتا ہے۔

اس مقام پر ہمارے لیے قواعد وضوابط، قوانین اور ایک منظم پروگرام کی ضرورت واضح ہوجاتی ہے، قوانین ہماری تین بڑی مشکلات کو حل کرسکتے ہیں:

① اجتماع اور معاشرے کے حوالے سے ایک انسان کی ذمہ داریوں اور ایک فرد کے حوالے سے معاشرہ کی ذمہ داریوں کو قوانین ہی واضح کرتے ہیں اور ان کی صلاحیتوں کو نکھارتے اور کوششوں کو مربوط رکھتے ہیں۔

② قانون ہی افراد کے اپنے وظائف کی انجام دہی پر ایک حد تک ضروری نگرانی کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔

③ قانون ہی مختلف افراد کو ایک دوسرے کے حقوق پامال کرنے سے روکتا ہے اور مختلف گروہوں کے آپس میں تصادم اور معاشرے کو ہرج ومرج سے بچاتا ہے اور کسی بھی زیادتی کی صورت میں زیادتی کرنے والے کے لیے مناسب سزاؤں کا تعین کرتا ہے۔

## بہترین قانون ساز کون ہے؟

اب ہمیں جاننا چاہیے کہ انسانی ضروریات کے مطابق بہترین قوانین کون بناسکتا ہے؟ ایسے قوانین کہ جو مندرجہ بالا تینوں اُصولوں کے مطابق ہوں، یعنی نہ صرف افراد کی ذمہ داریوں کو معین کریں بلکہ فرد اور اجتماع کے حقوق بھی روشن کریں

اور نا صرف ان کے تمام کاموں پر مکمل نگران ہوں بلکہ زیادتی کرنے والوں کا احتساب بھی کریں۔

ہم یہاں پر ایک سادہ سی مثال بیان کرتے ہیں: انسانی معاشرے کو ہم ایک بہت بڑی ٹرین اور قانون ساز ادارے کو اس کے انجن (Engine- Locomotive) سے تشبیہ دیتے ہیں کہ جو اس بہت بڑی ٹرین کو حرکت میں لاتا ہے۔ قانون ایک آہنی ریلوے لائن کی طرح ہے جو اس گاڑی کو اس کے اصلی ہدف تک پہنچانے کے لیے مددگار ثابت ہوتا ہے یعنی ایک ایسا راستہ ہے جو مختلف پیچ وخم اور نشیب و فراز سے گزرتا ہے۔ ایک ریلوے لائن کے لیے درج ذیل خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ جس زمین سے گاڑی نے گزرنا ہو وہ اس کے بوجھ کو برداشت کر سکے۔ لائن کے دونوں خطوط کے درمیان انجن کے پہیوں کے فاصلے کے مطابق انتہائی دقیق اور مناسب فاصلے کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح راستے میں آنے والوں غاروں کی دیواریں اور بلندی گاڑی کی بلندی کے مطابق ہوں، راستے کے نشیب و فراز اس قدر سخت اور زیادہ نہیں ہونے چاہیں کہ گاڑی کی بریکیں اور اُس کا پریشر اس کا ساتھ نہ دے سکیں۔ اسی طرح پہاڑوں کے اطراف سے پتھروں کا گرنا، کھائیوں کے ان کناروں کا گرنا جہاں سے گاڑی گزرتی ہے اور سیلاب کو مدنظر رکھنا ضروری ہے تاکہ گاڑی صحیح و سالم اس راستے کو طے کر سکے۔ اس مثال کے بعد ہم انسانی معاشرے کی بحث کی طرف لوٹتے ہیں۔ وہ قانون ساز جو چاہتا ہے کہ انسانوں کے لیے بہترین قانون بنائے اس میں درج ذیل خصوصیات کا ہونا ضروری ہے:

① نوع انسان اور ان کی غرائز، مشکلات اور ضروریات کو مکمل طور پر جانتا ہو۔

② انسانوں کی تمام تر توانائی اور استعداد کو مدنظر رکھے اور ان کو نکھارنے کے لیے قوانین کا اجراء کرے۔

③ ہر قسم کے وہ حوادث جو کہ ممکنہ طور پر معاشرے کو پیش آسکتے ہیں اور اسی طرح ان کا عکس العمل، ان کے لیے قبل از وقت آگاہی حاصل کرے۔

④ معاشرے سے اس کے کسی بھی قسم کے منافع مربوط نہ ہوں تا کہ قوانین بناتے وقت وہ اپنے یا اپنے رشتہ داروں یا اپنی جماعت کے منافع کی طرف متوجہ نہ ہو۔

⑤ ضروری ہے کہ یہ قانون ساز مستقبل کی انسانی ترقی یا نقصان سے مکمل طور پر آگاہ ہو۔

⑥ ضروری ہے کہ یہ قانون ساز خطا، اشتباہ اور ہر قسم کی بھول چوک سے بچا ہوا ہو۔

⑦ ضروری ہے کہ یہ قانون ساز اتنی طاقت اور قدرت رکھتا ہو کہ معاشرے کے کسی بھی فرد کی قدرت اور طاقت سے نہ ڈرے اور ہر حال میں انتہائی مہربان، غمخوار اور خیر خواہ ہو۔

## یہ شرائط کس میں موجود ہیں؟

آیا انسان بہترین قانون ساز ہو سکتا ہے؟

آیا آج تک کسی نے انسان کو مکمل طور پر پہچانا ہے؟ حالانکہ ہمارے زمانے کے ایک بڑے دانش ور نے انسان کے متعلق ایک مفصل کتاب لکھی ہے اور اس کا عنوان ''انسان موجود ناشناختہ'' (یعنی انسان کہ جسے آج تک پہچانا نہیں جاسکا) رکھا ہے۔

کیا انسانی روح، اس کے میلانات، غرائز اور اس کے لطیف جذبات کو مکمل طور پر پہچان لیا گیا ہے؟

کیا انسان کی جسمی اور روحی ضروریات کو خدا کے علاوہ کوئی ہستی جانتی ہے؟

کیا آپ عام انسانوں کے درمیان کسی ایسے شخص کو تلاش کر سکتے ہیں کہ جس کے اس معاشرے سے کسی بھی قسم کے فوائد منسلک نہ ہوں؟

کیا کوئی ایسا شخص جو ہر قسم کی خطا اور اشتباہ سے پاک ہو اور انسان و معاشرے کے تمام مسائل اور احتیاجات سے مکمل آگاہ ہو، کیا آپ اسے ان عام انسانوں میں ڈھونڈ سکتے ہیں؟

لہٰذا خدا اور وہ شخص جو وحی کے ذریعے خدا سے ارتباط رکھتا ہو ان کے علاوہ کوئی بھی شخص مکمل اور بہترین قانون ساز نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ خدا نے جب انسان کو کمال کے تمام مراحل طے کرنے کے لیے پیدا کیا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اس کی ہدایت کے لیے ایسے افراد کو معسور فرمائے جو تمام الٰہی و آسمانی قوانین کی تعلیم انسان کو دے سکیں اور جب انسان جان لیں گے کہ فلاں قانون خدا کا قانون ہے تو وہ زیادہ اعتماد اور اطمینان کے ساتھ اس پر عمل کر سکیں گے بالفاظ دیگر یہ آگاہی اس بات کی ضامن ہے کہ ان قوانین پر زیادہ سے زیادہ عمل کیا جائے گا۔

## توحید اور نبوت کے درمیان رابطہ

اس نکتے کی طرف متوجہ کرنا ضروری ہے کہ نظام خلقت بذات خود الٰہی پیغمبروںؑ کے وجود اور ان کی رسالت پر ایک زندہ گواہ ہے۔ اگر ہم اس کائنات کے حیرت انگیز نظام پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ خدا نے تمام موجودات کی ضروریات کا اپنے لطف و کرم کے ساتھ خیال رکھا ہے مثلاً اگر ہمیں دیکھنے کے لیے آنکھیں دی ہیں تو یہ ان کی حفاظت اور روشنی کو مناسب اور صحیح منعکس کرنے کے لیے پلکیں بھی عطا کی ہیں۔

آنکھوں کے گوشوں میں آنسو کے غدود پیدا کیے تا کہ ان کی سطح کو مرطوب

رکھیں کیونکہ آنکھوں کا خشک ہونا ان کے ختم ہونے کا باعث بنتا ہے اور پھر آنکھوں کے اندر انتہائی باریک سوراخ بنائے تاکہ اضافی پانی کو ناک کے اندر گرا سکیں۔ اگر یہ باریک سوراخ نہ ہوتے تو وہ آنسوؤں کے مسلسل قطرے ہمارے چہرے پر بہتے رہتے، آنکھ کی پتلی کو اس قدر حساسیت عطا کی کہ وہ خود بخود تیز یا کمزور روشنی کے مقابلے میں تنگ یا کشادہ ہوجاتی ہے تاکہ حسبِ ضرورت روشنی آنکھ میں پہنچے اور آنکھ کو صدمہ نہ پہنچے۔ آنکھ کے دائرے کے اطراف میں ایسے مختلف عضلات بنائے کہ سر اور جسم کو حرکت دیے بغیر آسانی کے ساتھ آنکھ کو ہر طرف گھما کر دیکھا جاسکتا ہے۔

ایک ایسا خدا جو انسان کی ضروریات کا اس قدر خیال رکھتا ہے کیا ممکن ہے کہ وہ انسان کو ایک ایسے معصوم اور قابل اطمینان رہبر و راہنما سے محروم رکھے کہ جو خدا کی وحی سے رہنمائی حاصل کرتا ہو؟!

مشہور ومعروف فلسفی بوعلی سینا، اپنی مشہور کتاب "شفا" میں تحریر فرماتے ہیں:

انسان پلکوں، ابرو اور پاؤں کے درمیان خالی جگہ کا اتنا محتاج نہیں ہے کہ جتنا اپنی بقا اور کمالات کے حصول کے لیے انبیاءؑ کی بعثت کا محتاج ہے۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ خداوند متعال ایک ضروری چیز کو تو پیدا کرے لیکن اس سے زیادہ لازمی چیز کو پیدا نہ کرے۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ انسان کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟

۲ انسان قانون کے بغیر زندگی کیوں نہیں گزار سکتا؟

۳ ایک واضح اور روشن مثال کے ذریعے ثابت کریں کہ انسانی زندگی کے لیے کسی قانون اور ضابطے کی کیا اہمیت ہے؟

۴ ایک اچھے قانون ساز کے لیے کن صفات کا ہونا ضروری ہے؟

۵ انبیاءؑ کا انسانوں میں سے ہی ہونا کیوں ضروری ہے؟

maablib.org

تیسرا سبق

# انبیاءؑ کیوں معصوم ہیں؟

## گناہ اور خطا سے پاک ہونا

بلاشک وشبہہ ہر نبیؐ کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ لوگوں کا یوں اعتماد حاصل کرے کہ اس کی گفتار میں کسی بھی قسم کے جھوٹ یا خطا کا شائبہ تک نہ رہے وگرنہ اس کی رہبری ورہنمائی متزلزل ہوجائے گی۔

اگر انبیاءؑ معصوم نہ ہوں تو بہانہ باز قسم کے لوگ "اس وجہ سے کہ انبیاءؑ غلطی کرتے ہیں" اور حقیقت کے متلاشی افراد انبیاءؑ کے دعویٰ میں متزلزل ہونے کی وجہ سے یا تو ان کی دعوت پر لبیک نہیں کہیں گے یا کم ازکم گرمجوشی سے اسے قبول نہیں کریں گے۔

اس دلیل کو ہم "دلیل اعتماد" کا نام دے سکتے ہیں اور یہ دلیل عصمتِ انبیاءؑ کے دلائل میں سے ایک اہم ترین دلیل ہے۔

بالفاظ دیگر یہ کیسے ممکن ہے کہ خداوند متعال ایسے شخص کی اطاعت کا حکم دے جو کسی شرط اور قید کے بغیر ہو اور عین ممکن ہے خطا کار ہو یا گناہ کا ارتکاب کرے، کیا ایسی صورت میں لوگ اس کی اطاعت کر سکتے ہیں؟

اگر اطاعت کریں گے تو گویا انھوں نے خطا اور گناہ کی اتباع کی اور اگر نہ کریں گے تو انھوں نے رہبری کے مقام کو تسلیم نہیں کیا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ انبیاءؑ کی رہبری کا مقام دیگر افراد سے مکمل طور پر مختلف ہے کیونکہ لوگ اپنا عقیدہ اور زندگی کے رہنما اُصول انھیں انبیاء سے ہی لیتے ہیں۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جب بڑے بڑے مفسرینِ قرآن اس آیہ مبارکہ:
اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (سورۂ نساء: آیت ۵۹ "خدا کی اطاعت کرو، رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت کرو) پر پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں: بغیر کسی شرط اور قید کے اطاعت کا حکم اس بات کی دلیل ہے کہ نا صرف انبیاءؑ معصوم ہیں بلکہ اُولی الامر بھی معصوم ہیں۔ اور اُولی الامر سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح معصوم آئمہؑ ہیں وگرنہ خداوند متعال ہرگز بغیر کسی قید اور شرط کے ان کی اطاعت کا حکم نہ دیتا۔

ایک اور طریقے سے بھی ہم انبیاءؑ کا ہر گناہ سے پاک و معصوم ہونا ثابت کرسکتے ہیں اور وہ یہ کہ "انبیاءؑ میں ہر قسم کے گناہ کے عوامل شکست خوردہ ہیں"۔

یعنی جب ہم اپنے نفوس کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہم بعض گناہوں اور بُرے و ناپسندیدہ کاموں کے مقابلے میں تقریباً معصوم ہیں۔ زیادہ وضاحت کے لیے درج ذیل مثالوں میں غور و فکر فرمائیں:

○ کیا آپ کوئی ایسا عقل مند آدمی تلاش کرسکتے ہیں جو آگ کو کھانے کے لیے فکرمند ہو یا کوڑا کرکٹ اور گندگی چبانے کی فکر میں ہو؟

○ کیا کوئی ایسا باشعور انسان تلاش کیا جاسکتا ہے جو مکمل طور پر برہنہ ہو کر گلیوں اور بازاروں میں گھومے؟

یقیناً جواب نفی میں ہوگا اور اگر کسی کو ایسا کام کرتے ہوئے دیکھیں گے تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ وہ نارمل انسان ہے اور کسی نفسیاتی بیماری کا شکار ہو کر اپنی عقل سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے وگرنہ کسی عقل مند انسان سے ایسا اقدام محال ہے۔

جب ہم اس قسم کے حالات و واقعات کے متعلق غور و فکر کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان عادات و اعمال کا غیر معقول اور پست ہونا اس قدر واضح ہے کہ کوئی بھی شخص ان کا ارتکاب نہیں کرسکتا۔

اب ہم یہاں ایک مختصر جملے کے ذریعے اس حقیقت کو مجسم کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ ہر عقل مند اور صحیح و سالم شخص بعض برے اور ناشائستہ کاموں کے مقابلے میں ''محفوظ'' یا بالفاظ دیگر ''عصمت'' رکھتا ہے۔

اس سے کچھ آگے بڑھتے ہیں، انسانوں میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ان ناشائستہ کاموں سے اس قدر پرہیز کرنے والے ہیں کہ عام انسان اس قسم کی احتیاط سے عاری ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر ایک ماہر طبیب جو کہ جراثیم (Microbe) کی مختلف اقسام سے واقف ہے کبھی بھی اس بات پر آمادہ نہیں ہوگا کہ وہ ایک ایسا پانی پیے جو کہ خطرناک قسم کے جراثیموں سے آلودہ ہو جب کہ ایک اَن پڑھ اور جاہل انسان اس کام کو انجام دے سکتا ہے۔

اس سادہ سے تجزیہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسان کی علمی سطح اور آگاہی جتنی بڑھے گی اتنا ہی زیادہ وہ خطا و اشتباہ سے محفوظ رہے گا۔

پس اس حساب سے اگر کوئی شخص ایمان اور معلومات کے اعتبار سے جتنا زیادہ بلند ہوتا چلا جائے گا اور خدا اور اس کی عدالت پر اعتقاد کا عالم یہ ہوگا کہ گویا وہ ان دونوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے حاضر و ناظر دیکھ رہا ہوگا تو یقیناً وہ اپنے آپ کو تمام گناہوں سے محفوظ رکھے گا اور ہر برا عمل اس کے نزدیک ایسے ہی ہوگا جیسے ہماری نظر میں بازار میں مادرزاد ننگا گھومنا۔

اس کے نزدیک حرام مال ایسے ہی آگ کا شعلہ ہوگا جیسے ہمارے نزدیک حقیقی آگ کہ جسے ہم اپنے منہ کی طرف نہیں لے جاتے وہ بھی حرام مال کو اپنے منہ کی طرف نہیں لے جائے گا۔

اس تمام گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا کہ انبیاءؑ اپنے علم و آگاہی اور کامل ایمان کی وجہ

سے گناہوں کے تمام عوامل کو کنٹرول میں کر لیتے ہیں کہ جس کے نتیجے میں گناہ کا خواہ کتنا ہی بڑا عامل پیش آئے ان کی عقل و ایمان پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ انبیاء معصوم ہیں اور گناہوں سے منزہ و مبرا ہیں۔

## عصمت کا مقام کیسے باعثِ فضیلت ہو سکتا ہے؟

بعض ایسے لوگ جو کہ عصمت کے مفہوم اور گناہوں سے بچانے والے عوامل سے آگاہ نہیں ہیں۔ وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر خدا کسی کو گناہ سے روک دے اور اس میں ہر قسم کے گناہ کے عوامل ختم کر دے تو یہ چیز اس شخص کے لیے باعثِ فضیلت نہیں ہے۔ یہ ایک اجباری عصمت ہے اور زبردستی کی عصمت کو کسی بھی قسم کی فضیلت شمار نہیں کیا جا سکتا، لیکن جو توضیحات ہم ذکر کر چکے ہیں ان سے اس اعتراض کا جواب واضح ہو جاتا ہے کہ انبیاء کی عصمت میں کسی بھی قسم کا اجباری پہلو نہیں پایا جاتا بلکہ ان کا انتہائی قوی ایمان و کامل یقین، آگاہی و شناسائی اور فوق العادہ علم اس بات کا موجب بنا ہے کہ عصمت کی ایک عظیم فضیلت انھیں حاصل ہوئی ہے۔

اگر باہوش اور آگاہ طبیب بیماری کے تمام عوامل سے شدت کے ساتھ پرہیز کرے تو کیا یہ اس کے مجبور ہونے کی دلیل ہے؟

اگر کوئی صحت کے اُصولوں کا اس حد تک خیال رکھے تو کیا یہ اس کی فضیلت شمار نہیں ہوگی؟ اگر ایک قانون فہم شخص کسی جنایت کے عدالت میں ہولناک نتائج کو جانتے ہوئے اس سے سختی سے پرہیز کرتا ہے تو کیا یہ اس کی فضیلت شمار نہیں ہوگی؟

پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ انبیاءؑ کا معصوم ہونا نا صرف ان کے اختیار میں ہے بلکہ ان کے لیے ایک بہت بڑی عظمت بھی ہے۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ معصوم ہونے کی کتنی اقسام ہیں؟

۲ اگر انبیاءؑ معصوم نہ ہوتے تو کیا مشکلات پیش آسکتی تھیں؟

۳ عصمت کا حقیقی مقام کیا ہے؟

۴ سبق میں مذکورہ مثالوں کے علاوہ ایسی مثالیں ذکر فرمائیں کہ جن میں تمام افراد یا بعض افراد معصوم ثابت ہوسکیں؟

۵ انبیاءؑ کی عصمت اجباری ہے یا اختیاری؟ دلیل پیش کریں؟

maablib.org

چوتھا سبق

# پیغمبرؐ کی شناخت کا بہترین راستہ

بلا شک وشبہ ہر مدعی کے دعوی کو قبول کرنا عقل اور منطق کے خلاف ہے۔ خداوند متعال کی طرف سے نبوت و رسالت کا دعوی کرنے والا شخص ممکن ہے کہ سچا ہو، لیکن یہ احتمال اپنی جگہ موجود ہے کہ فرصت طلب اور دغاباز قسم کا انسان سچے انبیاءؑ کی جگہ لینے کی کوشش کرے، لہٰذا ضروری ہے کہ ایک ایسا یقینی و قطعی معیار ہمارے پاس ہونا چاہیے کہ جس کے ذریعے انبیاءؑ کے دعوی کی حقیقت اور ان کا خدا سے رابطہ ہمیں معلوم ہو سکے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمارے پاس مختلف راستے ہیں جن میں سے دو اہم راستے درج ذیل ہیں:

۱) پیغمبرؐ کے دعوی سے متعلق دقیق تجزیہ اور اس کی حقیقت پر مختلف قرائن کی جمع آوری۔

۲) معجزہ اور خارق عادہ کام۔

ہم پہلے معجزے کے متعلق گفتگو کرتے ہیں کہ بعض ایسے افراد بھی موجود ہیں جو "معجزہ" کا لفظ سن کر تعجب کرتے ہیں یا معجزات کا کوئی قصہ کہانی یا افسانہ سمجھتے ہیں حالانکہ اگر معجزہ کے دقیق علمی معنی پر غور و فکر کیا جائے تو یہ تمام تصورات اشتباہ محض کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔

معجزہ کوئی ایسا عمل نہیں ہے کہ جو غیر ممکن یا کسی علت کے بغیر ہو بلکہ سادہ الفاظ میں معجزہ اس خارق عادت عمل کا نام ہے کہ جو عادی و معمولی افراد کی قدرت

میں نہیں ہوتا بلکہ معجزہ طبیعت سے مافوق طاقت کے ذریعے ہی امکان پذیر ہے۔

اسی لیے معجزہ کے لیے درج ذیل شرائط کا ہونا ضروری ہے:

① ایسا کام جو ممکن اور قابلِ قبول ہو۔

② عام یا صاحبِ کمال انسان صرف انسانی طاقت کے ذریعے اس کو انجام دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔

③ معجزہ لانے والا شخص اپنے کام سے متعلق اتنا مطمئن ہو کہ دوسروں کو مقابلے کی دعوت دے سکے۔

④ کوئی بھی شخص اس جیسا کام نہ کرسکے جیسا کہ معجزے کے نام سے واضح ہے کہ تمام افراد اس کے مقابلے میں عاجز ہو جائیں۔

⑤ ضروری ہے کہ معجزہ دعویٔ نبوت یا امامت کے مطابق ہو۔ لہٰذا وہ خارق عادت کام جو انبیاءؑ اور ائمہ کے علاوہ دیگر افراد انجام دیتے ہیں انھیں معجزہ کے بجائے "کرامت" کہا جاتا ہے۔

## چند روشن نمونے

ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں سے ایک معجزہ مُردوں کو زندہ کرنا اور ناقابلِ علاج مریضوں کو صحت یاب کرنا تھا۔

کیا ہمارے پاس کوئی ایسی علمی اور عقلی دلیل موجود ہے کہ انسان کے جسم سے جب روح خارج ہو جاتی ہے تو وہ دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ نہیں سکتا؟

کیا ہمارے پاس ایسی علمی اور عقلی دلیل موجود ہے کہ سرطان کی بیماری کے لیے کوئی علاج نہ ہو؟ حالانکہ ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ البتہ بغیر کسی شک وشبہ کے موجودہ زمانے کی تمام تر ترقی کے باوجود انسان اب تک مردوں کو زندہ کرنے یا بہت سی بیماریوں کے علاج سے عاجز ہے، چاہے دنیا کے تمام ڈاکٹر

مل کر اپنے تجربات اور معلومات سے مدد ہی کیوں نہ لیں۔

لیکن دوسری طرف کوئی مانع نہیں ہے کہ ایک انسان الٰہی قوت اور علم خدا کے بیکراں سمندر سے خصوصی آگاہی کے بعد ایک مخفی اشارے کے ذریعے بھی روح کو واپس جسم میں لا سکتا ہے اور لاعلاج مریضوں کو شفا بخش سکتا ہے۔

علم تو یہی کہتا ہے کہ نہ تو ہمیں معلوم ہے اور نہ ہی ہم اس کی طاقت رکھتے ہیں کہ علم اس کام کو ناممکن اور غیر معقول قرار نہیں دیتا۔

## دوسری مثال

چاند کا سفر ایک خلائی جہاز کے بغیر کسی بھی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے لیکن کوئی مانع نہیں ہے کہ ہماری طاقت سے زیادہ طاقتور اور ہمارے سائنسی آلات و خلائی جہازوں سے زیادہ دقیق آلات کسی کی دسترس میں ہوں اور وہ ان خلائی جہازوں کی مدد کے بغیر ہی چاند یا دوسرے ستاروں پر پہنچ جائے۔

دراصل اگر کوئی شخص اس قسم کے خارق عادت کام انجام دے اور ساتھ ہی ساتھ نبوت کا بھی دعویٰ کرے اور لوگوں کو بھی اپنے مقابلے پر بلائے لیکن لوگ اس کے مقابلے سے عاجز ہوں تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا ہے۔ کیونکہ ممکن نہیں ہے کہ خداوند متعال ایک جھوٹے شخص کو اتنی قدرت اور طاقت عطا کردے کہ وہ اس کے بندوں کی گمراہی کا باعث بنے۔

## معجزات کو خرافات سے نہیں ملانا چاہیے

افراط و تفریط ہمیشہ فساد و تباہی اور حقیقت کا چہرہ بگاڑنے کا سبب بنتے ہیں۔ معجزہ سے متعلق بھی یہ بات صادق آتی ہے حالانکہ بعض روشن فکر ہونے کے دعوے دار افراد واضح طور پر یا اشارے و کنایے کے ساتھ ہر قسم کے معجزے کا انکار

کرتے ہیں جب کہ لوگوں کا ایک اور گروہ زیادہ سے زیادہ معجزات کو تخلیق کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ ضعیف خبروں اور منحرف کردینے والے افسانوں (کہ جو بعض اوقات دشمن کی طرف سے پھیلائے گئے ہوتے ہیں) کو معجزات سے خلط ملط کردیتا ہے اور حقیقی پیغمبروںؑ کے علمی معجزات کو اپنے بنائے ہوئے افسانوں اور توہمات کا لباس پہنا دیتا ہے۔

جب تک حقیقی معجزات اس قسم کے جعلی افسانوں سے منزہ نہ ہوجائیں تو اس وقت تک ان کا اصلی چہرہ آشکار نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بزرگ علماء نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ معجزات سے متعلق اسلامی احادیث کو ان افسانوی باتوں سے بچایا جاسکے۔

اسی مقصد کے لیے "علم رجال" وجود میں آیا تاکہ احادیث کے راویوں کو اچھے طریقے سے پہچانا جاسکے اور صحیح و ضعیف احادیث کو الگ الگ کیا جاسکے تاکہ توہمات حقائق سے نہ مل جائیں۔

استعماری اور الحادی قوتوں کی آج بھی یہ کوشش ہے کہ وہ ان بے سروپا باتوں کو صحیح دینی اعتقادات سے مخلوط کردیں اور اس طریقے سے تمام افراد کو حقیقی علم سے دور کردیا جائے، لہٰذا ضروری ہے کہ ہم دشمن کی ان تخریبی سازشوں سے مکمل طور پر آگاہ رہیں۔

## معجزہ کا دوسری خارق عادت چیزوں سے فرق

غالباً آپ نے سنا ہوگا کہ بعض شعبدہ باز بعض اوقات خارق عادت کام کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے یہ عجیب و غریب کام دیکھے بھی ہوں گے۔ یہ افسانہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ آخر ان خارق عادت کاموں اور انبیاءؑ کے

معجزات میں کیا فرق ہے اور ہمارے پاس ان کی تشخیص کا معیار کیا ہے؟!

اس سوال کے دو واضح جواب یہ ہیں:

① اس قسم کے لوگ ہمیشہ محدود کام انجام دیتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی شخص اس بات کے لیے آمادہ نہیں ہوگا کہ آپ کی خواہش کے مطابق خارق عادت کام انجام دے بلکہ وہ صرف ایسا ہی کام انجام دے گا کہ جس کی اس نے بہت زیادہ مشق یا ریاضت کی ہو۔ اس بات کی دلیل واضح ہے کیونکہ ہر انسان کی طاقت محدود ہے اور وہ صرف ایک یا چند کاموں میں مہارت حاصل کرسکتا ہے۔

لیکن انبیاءؑ کے خارق عادات کام بغیر کسی قید وشرط کے ہیں، یعنی لامحدود ہیں۔ وہ کسی بھی طلب کردہ معجزے کو انجام دینے کی قدرت رکھتے ہیں کیونکہ وہ خدا کی بے پناہ قدرت وطاقت سے مدد حاصل کرتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ خدا کی قدرت تمام حدود وقیود سے خارج ہے، جب کہ انسان کی قوت وقدرت بہت ہی محدود ہے۔

② ایک شعبدہ باز کا انجام دیا گیا کام دوسرا شعبدہ باز بھی انجام دے سکتا ہے، یعنی وہ کام بشر کی قدرت سے باہر نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک شعبدہ باز خارق عادت کام کرنے کے باوجود مقابلے کی دعوت نہیں دیتا یعنی کسی کو چیلنج نہیں کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اسی شہر وقریہ میں یا کسی دوسرے شہر میں اس جیسے دیگر افراد بھی موجود ہیں لیکن انبیاء مکمل اطمینان کے ساتھ چیلنج کرتے ہیں اور کہتے ہیں: "اگر زمین کے تمام انسان بھی جمع ہوجائیں تو مجھ جیسا کام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے"۔

یہی فرق سحر اور جادو پر بھی صادق آتا ہے اور بیان کردہ دونوں باتوں کے بعد ہم معجزہ اور جادو کو ایک دوسرے سے جدا کرسکتے ہیں۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

١ معجزہ کو معجزہ کیوں کہتے ہیں؟

٢ کیا معجزہ علّیت کے قانون سے مستثنیٰ ہے؟

٣ کن طریقوں سے ہم معجزہ کو شعبدہ بازوں کے عمل اور جادو سے جدا کر سکتے ہیں؟

٤ معجزہ کی اصلی شرائط کیا ہیں؟

٥ کیا آپ نے آج تک معجزہ جیسی کوئی چیز دیکھی ہے؟

## پانچواں سبق

# پیغمبرؐ اسلام کا سب سے بڑا معجزہ

تمام اسلامی دانش وروں کا اس پر اعتقاد ہے کہ قرآن پیغمبر اسلام ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اور یہ جو ہم کہتے ہیں کہ سب سے بڑا اس لیے کہ:

① قرآن ایک ایسا عقلی معجزہ ہے جو عام لوگوں کی فکر وروح کے مطابق ہے۔

② قرآنِ مجید ہمیشہ رہنے والا معجزہ ہے۔

③ قرآنِ مجید ایک ایسا معجزہ ہے کہ چودہ سو سال گزرنے کے باوجود پکار پکار کر کہہ رہا ہے: "اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ آسمانی کتاب خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی نہیں ہے تو اس جیسی لے کر آئیں!"

اس قسم کے چیلنج کو جسے "تحدی" کہا جاتا ہے قرآنِ مجید نے چند جگہ پر واضح طور پر دیا ہے۔ ایک جگہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ.... (سورۂ اسراء: آیت ۸۸)

"کہہ دیجیے اگر انسان اور جن سب مل کر اس قرآن کی مثل لانے کی کوشش کریں تو وہ اس کی مثل نہیں لا سکیں گے......"۔

ایک اور جگہ میں قرآنِ مجید مقابلے کی دعوت کو آسان کر کے فرماتا ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

”کیا یہ کہتے ہیں کہ اس نے ”قرآن کو“ خود بنایا ہے؟ کہہ دیجیے
اگر تم سچے ہو تو اس جیسی خود ساختہ دس سورتیں بنا لاؤ اور اللہ کے
سوا جس جس کو بلا سکتے ہو، بلاؤ“۔ (سورۂ ہود: آیت ۱۳)

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: ”اگر یہ دعوت قبول نہ کریں تو جان لیجیے کہ یہ آیات خدا کی طرف سے ہیں“۔ (سورۂ ہود: آیت ۱۴)

ایک اور آیۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے مقابلے کی شرائط کو کم کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ
مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ○ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۳)

”پس یہ کتاب (قرآن) جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی
ہے اس میں اگر آپ کو شک ہے تو کم از کم اس سورہ جیسی ایک
سورہ تو لائیں۔ پس خداوند متعال کے علاوہ اپنے گواہوں (اور
منکرین) کو لائیں اگر تم سچ کہتے ہو“۔

اس کے بعد والی آیۂ مبارکہ میں واضح طور پر کہا گیا ہے:

اگر وہ ”یعنی کفار“ اس کام کو انجام نہ دے سکے اور وہ ہرگز اس کام کو انجام نہیں دے سکتے تو پس کہہ دیجیے کہ وہ اس آگ سے اپنے آپ کو بچائیں کہ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

قرآن نے انکار کرنے والوں کو مسلسل مقابلہ کرنے کی دعوتیں دی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرِ خدا معجزہ کے مسئلے میں زیادہ تر قرآن ہی پر بھروسہ کرتے تھے۔ اگرچہ اس کے علاوہ چند اور معجزات بھی پیغمبرِ خدا سے نقل ہوئے ہیں اور تاریخ

کی کتابوں میں ان کا ذکر ہوا ہے۔

پس چونکہ قرآن ایک زندہ معجزہ ہے اور تمام لوگوں کو اس تک پہنچنے میں کوئی مانع درپیش نہیں ہے۔ لہٰذا ہم معجزات کی بحث میں ''قرآن'' کا ذکر ہی کافی سمجھتے ہیں۔

سب لوگ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے سے عاجز آگئے تھے؟ جالب نکتہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے مخالفین کے میدان مقابلہ میں آنے پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور مختلف اُبھارنے والی عبارتوں سے ان کو دعوت دی ہے تاکہ کسی کے لیے کوئی عذر نہ رہ جائے جیسے:

''اگر آپ سچے ہیں؟ آپ ہرگز نہیں کرسکتے؟ تمام لوگوں سے مدد لے سکتے ہیں؟ کم از کم اس سورہ جیسی ایک سورہ لائیں، اگر آپ انکار کریں گے تو آگ جو جلادینے والی ہے وہ آپ کے انتظار میں ہے'' یہ سب جملے اس واقعیت کو بیان کررہے ہیں۔

البتہ یہ تمام چیزیں ایک طرف ہیں اور دوسری طرف پیغمبرؐ خدا کا اپنے مخالفین کے ساتھ مقابلہ کرنا معمولی بات نہیں تھی اس لیے کہ اسلام نے نہ صرف یہ کہ ان کے مذہب ''کہ جس پر وہ سختی سے عمل کرتے تھے'' کو خطرے میں ڈال دیا تھا بلکہ ان کے اقتصادی اور سیاسی منافع بھی خطرے میں آگئے تھے۔ بالفاظ دیگر اسلام کے نفوذ اور ترقی نے ان کی تمام تر زندگی کو درہم برہم کردیا تھا۔ لہٰذا وہ مجبور تھے کہ اپنی تمام تر طاقت اور قدرت کے ساتھ میدان میں آجائیں۔

انھیں چاہیے تھا کہ تمام تر کوشش اور امکان کے ساتھ پیغمبرؐ اسلام کو جواب دینے کے لیے قرآن جیسی آیات لے آتے تاکہ نہ تو قرآن دوبارہ انھیں چیلنج کرتا اور نہ انھیں اپنے مقابل عاجز شمار کرتا اور نہ اس چیز کو اپنی حقانیت پر سند شمار کرتا۔

انھوں نے تمام ان لوگوں سے مدد طلب کی تھی جو اس زمانے کے فصیح و بلیغ

لوگ تھے۔ لیکن ہر دفعہ جب وہ قرآن مجید کے مقابلے میں آئے تو انھیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوئے۔ تاریخ کی کتابوں میں سب کچھ تفصیل سے مذکور ہے۔

## ولید بن مغیرہ کی کہانی

وہ لوگ جو قرآن مجید کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے بلائے گئے تھے ان میں ولید بن مغیرہ بھی شامل تھا کہ جس کا تعلق قبیلہ بنی مخزوم سے تھا کہ یہ قبیلہ اس زمانے میں عربوں کے درمیان اچھی تدبیر اور عمدہ فکر سے مالا مال تھا۔ لہٰذا کفار نے اس سے یہ درخواست کی کہ اس چیز کے بارے میں وہ غور و خوض کرے اور قرآن مجید کی حیرت انگیز اور خارق عادت حد تک نفوذ کرنے والی آیات کے بارے میں اپنا نظریہ بیان کرے۔

ولید بن مغیرہ نے پیغمبرؐ خدا سے درخواست کی کہ قرآن مجید کی کچھ آیات تلاوت فرمائیں۔ پیغمبرؐ اسلام نے کچھ آیات سورۂ مبارکہ ''حم سجدہ'' سے تلاوت فرمائیں۔ پس ان آیات کا سننا تھا کہ ولید بن مغیرہ کے دل میں ہیجان و اضطراب پیدا ہوا کہ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور بنی مخزوم کی قائم کردہ محفل میں جا پہنچا اور اس نے خدا کی قسم کھا کر کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے میں نے ایسا کلام سنا ہے کہ جو نہ انسانوں کی گفتار اور نہ جنوں کے کلام کے مانند ہے اور اس کے بعد ولید بن مغیرہ نے اس طرح کہا:

وان لهُ لحلاوة وان عليه لطلاوة وان اعلاه لمثمر وان اسفله لمغدق وانه يعلو ولا يعلى عليه

''اس کی گفتار میں مخصوص مٹھاس تھی اور کلام میں ایک خاص قسم کی ایسی خوب صورتی تھی جیسے ایک توانا درخت پر پھل دار

ٹہنیاں ہوں اور وہ مضبوط اور محکم کلام ہے جو ہر چیز سے بلند تر ہے اور کوئی بھی چیز اس کلام سے بلند نہیں ہو سکتی"۔

ولید بن مغیرہ کا یہ کہنا تھا کہ قریش کے درمیان آہستہ آہستہ یہ شک پڑنا شروع ہو گیا کہ ولید بن مغیرہ محمدؐ کا چاہنے والا ہو گیا ہے۔ ابو جہل جلدی میں ولید بن مغیرہ کے گھر پہنچا اور قریش کی یہ بات کہ "ولید بن مغیرہ محمدؐ کا چاہنے والا ہو گیا ہے" اسے کہی اور اس کو دوبارہ قریش کی محفل میں آنے کی دعوت دی۔

ولید بن مغیرہ قریش کی محفل میں دوبارہ پہنچا اور اس نے قریش سے کہا:

① کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دیوانہ ہے؟

② کیا آپ نے واقعاً آثار دیوانگی اس میں ملاحظہ کیے ہیں؟

حاضرین محفل نے نفی میں جواب دیا۔ پھر ولید بن مغیرہ نے کہا کہ آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ جھوٹ بولتا ہے؟ مگر وہ آپ کے درمیان سچا اور امین مشہور نہیں تھا؟!

قریش کے بعض سرداروں نے ولید بن مغیرہ سے پوچھا کہ اس کی طرف کون سی نسبت دینی چاہیے؟

ولید بن مغیرہ نے تھوڑی سی فکر کرنے کے بعد کہا کہ آپ اس کو "ساحر" کہنا شروع کر دیں۔

اگرچہ قریش کا پروگرام یہ تھا کہ اس تعبیر "ساحر" سے لوگوں میں سے اس گروہ کو "جو قرآن مجید کے چاہنے والے تھے" "محمدؐ" سے دور کر دیا جائے لیکن یہ تعبیر اس گروہ کو "جو قرآن مجید کے چاہنے والے تھے" "محمدؐ" سے دور کر دیا جائے لیکن یہ تعبیر "ساحر" خود اس بات پر ایک زندہ دلیل تھی کہ قرآن مجید فوق عادت جذب کرنے والی کتاب ہے۔ پس انھوں نے اس قوت جاذبہ کا نام سحر رکھ دیا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ قرآن کا دور سے بھی سحر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

قریش نے ہر جگہ یہ نعرہ لگانا شروع کر دیا کہ محمدؐ زبردست ساحر ہے اور یہ آیات اس کا سحر ہے، اس سے دُور ہو جائیں اور یہ کوشش کریں کہ اس کا کلام نہ سنیں۔ لیکن ان کی یہ ساری کی ساری سازش تمام تر کوشش کے باوجود ناکام ہوئی اور حقیقت کے متلاشی لوگ جو اردگرد کے علاقوں میں رہتے تھے چونکہ ان کے دل پاک تھے اس لیے وہ گروہ در گروہ کی شکل میں قرآن کی طرف آنا شروع ہو گئے اور اس پیغام آسمانی کے آب زلال سے سیراب ہونے لگے، دشمن شکست کھا کر ہٹنے لگے۔

آج بھی قرآن مجید دنیا کے تمام لوگوں کو مقابلے کی دعوت دے رہا ہے اور چیلنج کر رہا ہے کہ اگر تم ان آیات کے بارے میں شک اور تردد کا شکار ہو اور اس کلام کو انسانی ذہن کی اختراع خیال کرتے ہو تو اس جیسا کلام لے کر آؤ۔

اے ہر قوم وملت کے دانش ور! اے فلاسفہ! اے ادیبو! اس بات سے بھی ہم کاملاً آگاہ ہیں کہ اسلام کے دشمن خصوصاً عیسائی پادری جو کہ اسلام کو ایک انقلابی مکتب اور عیسائیت کے لیے مضر اور خطرناک خیال کرتے ہیں ہر سال کروڑوں ڈالر اسلام مخالف تعلیمات پر خرچ کرتے ہیں اور یہ کام مختلف فرہنگی، علمی اور صحت و صفائی کے مختلف پروگراموں کی آڑ میں مختلف اسلامی ممالک میں بڑی تیزی اور منظم طریقے سے کر رہے ہیں (اگر وہ اپنے عقیدہ میں سچے ہیں تو) کیا بہتر ہوتا کہ وہ اپنے عیسائی عربوں، دانش وروں، شعراء، فلاسفہ اور لکھنے والوں کو اس بات کی دعوت دیتے کہ قرآن کی طرح چند سورتیں تیار کر کے لے آؤ تاکہ انھیں پھیلا کر مسلمانوں کو خاموش کیا جائے۔

یہ طے ہے اگر یہ کام ممکن ہوتا تو عیسائی ایسا ضرور کرتے۔ اس کام کو انجام نہ دینا ان کی کمزوری اور شکست اور قرآن کے سچا معجزہ ہونے پر دلیل ہے۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

1. پیغمبر گرامی ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید کیوں ہے؟
2. قرآن کس قسم کا چیلنج کر رہا ہے؟
3. دشمنانِ قرآن اس کو "سحر" کے نام سے کیوں پکارتے ہیں؟
4. قرآنِ مجید "موجودہ مسیحیت" کا سخت رقیب کیوں ہے؟
5. "ولید بن مغیرہ مخزومی" کی داستان کیا ہے؟

maablib.org

چھٹا سبق

# اعجازِ قرآن کے چند دریچوں کی طرف

## حروفِ مقطعات کیوں؟

ہم جانتے ہیں کہ بہت سی قرآنی سورتوں کا آغاز "حروف مقطعہ" جیسے "الم"، "الر"، "یٰس" وغیرہ سے ہوا ہے۔

روایات اسلامی کے مطابق ان "حروف مقطعات" کا ایک راز اور فلسفہ یہ بھی ہے کہ خداوند عالم ہمیں بتانا چاہتا ہے کہ قرآن مجید جیسا "بڑا عظیم اور جاودانی معجزہ" کیسے ان معمولی سمجھے جانے والے حروف "الف، با" سے وجود میں آیا ہے اور ایک اتنا بڑا کام ایسے حروف اور الفاظ سے وجود میں آیا ہے کہ جن کو ایک چند سالہ بچہ بھی پڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اتنے اہم عظیم کام کا اس قسم کے مواد سے وجود میں آنا ہی ایک بڑا "معجزہ" ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن کس حیثیت سے معجزہ ہے، کیا صرف فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے؟ یعنی "عبارت کی شیرینی، تعبیرات کا سریع الانتقال اور غیر معمولی اثر و نفوذ" یا کسی اور حیثیت سے "معجزہ" ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہم قرآن کو جس نظر، زاویے اور دریچے سے دیکھیں قرآن ہر اس اعتبار سے "معجزہ" ہے، جیسے:

① فصاحت و بلاغت، اس کے الفاظ اور مفاہیم ایک مٹھاس، غیر معمولی کشش اور عجیب و غریب قوت جاذبہ پر مشتمل ہیں۔

② ہر نظر سے اعلیٰ ترین راہنما مضامین، خصوصاً تمام خرافات سے پاک عقائد کا بیان۔

③ معجزات علمی، یعنی قرآن نے ان مسائل سے پردہ اُٹھایا ہے کہ جن مسائل کی حقیقت تک آج تک انسان نہیں پہنچ سکا تھا!

④ آنے والے بہت سے مسائل (و واقعات) کی واضح، صحیح اور دقیق پیشین گوئی (قرآن کی غیبی خبریں)۔

⑤ کسی قسم کے تضاد، اختلاف، تفرقہ اور پریشان کن باتوں اور ان جیسے دیگر اُمور سے قرآن کا پاک ہونا۔

مذکورہ بالا پانچ مسائل کے متعلق بحث مفصل و طولانی ہے۔ لیکن ہم ان چند اسباق میں اس تمام بحث کے چند اہم اور جاذب ترین نکات کا تجزیہ کرتے ہیں۔

## فصاحت و بلاغت

ہم جانتے ہیں کہ ہر کلام کے دو "پہلو" ہوتے ہیں: ① الفاظ، ② مطالب۔

ہر وہ کلام جو موزوں، خوش نما الفاظ، مناسب، منظم، رواں کلمات پر مشتمل ہو اور پیچیدہ اور غیر مناسب عبارات سے پاک ہو اور اس کے جملوں کی ساخت معنیٰ و مراد کو کامل صورت میں زیبائی اور جذابیت کے ساتھ بیان کرے تو اسے فصیح و بلیغ کلام کہا جاتا ہے۔

قرآنِ مجید بطور اکمل ان دو خوبیوں اور خصوصیات پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کوئی شخص یہ ہمت نہیں کرسکا کہ وہ اس کی آیات یا سورتوں کے مقابلہ میں کوئی ایسا کلام لاسکے جو اس کی طرح پُرکشش، جذب کرنے والا، مٹھاس سے بھرپور اور خوب صورت انداز کا حامل ہو۔

گذشتہ سبق میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ مشرکینِ عرب کا فاصل اور منتخب شخص

''ولید بن مغیرہ'' آیات قرآن کو سن کر ہیجان زدہ ہو گیا تھا اور قرآن کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک مدت تک دقیق غور وفکر اور مطالعہ کرتا رہا۔ بالآخر (ناکام و نامراد ہو کر) اس نے سردارانِ قریش سے کہا کہ وہ (لوگوں سے) کہیں کہ قرآن ''سحر'' اور محمدؐ ''ساحر'' ہیں۔

مشرکین متعدد مرتبہ سحر وساحر کی نسبت پیغمبرؐ اسلام کی طرف دیتے رہے۔ اگرچہ وہ اس نسبت کے ذریعے پیغمبرؐ اسلام کی ''مذمت'' کرنا چاہتے تھے مگر درحقیقت وہ آپؐ کی تعریف و ستائش کر رہے تھے، کیونکہ یہ نسبت اس بات کا اعتراف تھا کہ ''قرآنِ مجید غیر معمولی اثر ونفوذ رکھتا ہے''۔

مشرکین بجائے اس کے کہ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے معجزہ ہونے کا اقرار کرتے اور اس پر ایمان لے آتے، اسے افسانہ سمجھتے ہوئے گمراہی کا شکار رہے اور اسے ''سحر'' قرار دیتے رہے۔

تاریخ اسلام میں ایسے کئی مواقع آئے کہ تندخو اور جھگڑالو قسم کے لوگ جب پیغمبرؐ اسلام کی خدمت میں آتے اور قرآن کی آیات سنتے تو فوراً اپنا مذہب چھوڑ دیتے اور نُورِ اسلام سے ان کے دل منور ہو جاتے۔ یہ واقعات اس چیز کی طرف واضح اشارہ ہیں کہ قرآنِ مجید کی کشش اور اس کی فصاحت و بلاغت یقیناً ایک معجزہ ہے۔

ماضی بعید کے بجائے موجودہ زمانے کے ماہرین ادبیات عرب کا حال بھی یہی ہے وہ جتنا زیادہ قرآن پڑھیں اور بار بار پڑھیں نا صرف اس تکرار سے نہیں تھکتے ایک روحانی لذت کا احساس کرتے ہیں۔

قرآن کی تعبیرات بہت دقیق اور منظم، بیان کی پاکیزگی اور متانت، ساتھ ہی ساتھ بہت ہی واضح و آشکار اور وقتِ ضرورت پر بہت ہی محکم اور شکست دینے والی ہیں۔

یہ بات واضح رہے کہ نزول قرآن کے زمانہ کے لوگ ادبی اعتبار سے بہت ترقی یافتہ اور دقیق تھے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے اشعار آج بھی عربی اشعار کے بہترین نمونے شمار ہوتے ہیں۔

مشہور ہے کہ ہر سال حجاز کے بڑے بڑے ادیب جمع ہوتے تھے اور عکاظ نامی بازار میں جو کہ ایک تجارتی و ادبی مرکز تھا، اپنے بہترین اشعار کو پیش کرتے تھے۔ پھر ان کے کلام سے ایک بہترین شعر کا انتخاب کر کے اسے "سال کا بہترین شعر" قرار دیا جاتا تھا اور خانہ کعبہ میں آویزاں کر دیا جاتا تھا۔ پیغمبرؐ اسلام کے ظہور کے زمانے میں ان اشعار کے "سات نمونے" خانہ کعبہ میں موجود تھے اور انھیں "معلقات سبعہ" کہا جاتا تھا۔

لیکن قرآنِ مجید کے نزول کے بعد قرآن کی فصاحت و بلاغت کے مقابلہ میں ان کی حیثیت وفصاحت اس قدر پھیکی پڑ گئی کہ بتدریج ان سب اشعار کو نا صرف وہاں سے اُتار دیا گیا بلکہ انھیں فراموش بھی کر دیا گیا۔

مفسرین قرآن نے مختلف آیات کی عجیب وغریب باریکیوں کی طرف اپنی اپنی علمی صلاحیت کے مطابق اشارہ کیا ہے۔ آپ بھی ان تفاسیر کی طرف رجوع کر کے ہمارے ذکر کردہ حقائق کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر قرآن سے آشنائی ہو تو معلوم ہوگا کہ پیغمبرؐ اسلام کا یہ فرمان ذرہ برابر بھی مبالغہ آمیز نہیں ہے کہ:

ظاهره انيق وباطنه عميق لا تحصى عجائبه ولا تبلى غرائبه

"ظاہر قرآن بہت ہی موزوں ومزین اور باطن قرآن بہت ہی کامل وعمیق ہے۔ اس کے عجائب ناقابل شمار اور اس کے عجیب

تو ادر نا قابل زوال ہیں"۔

مکتب قرآن کے سب سے بڑے شاگرد حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

فیہ ربیع القلب وینابیع العلم وما للقلب جلاء غیرہ

"قرآن دلوں کے لیے بہار ہے، علم و دانش کے چشمے قرآن سے اُبلتے ہیں اور قلوب کے لیے قرآن سب سے بڑا صیقل اور ان کو جلا بخشنے والا ہے"۔

maablib.org

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ قرآن کے حروف مقطعات کا فلسفہ کیا ہے؟

۲ کیا قرآن ایک حیثیت سے معجزہ ہے یا ہر اعتبار سے معجزہ ہے؟

۳ پیغمبر اسلام کو مخالفین ساحر کیوں کہتے تھے؟

۴ فصاحت اور بلاغت کے درمیان کیا فرق ہے؟

۵ "معلقات سبع" کا کس زمانے سے تعلق ہے اور ان کا مطلب کیا ہے؟

maablib.org

ساتواں سبق

# قرآنِ مجید کا کائنات کے بارے میں نظریہ

بحث کے آغاز میں ضروری ہے کہ ہم اس معاشرہ کا تہذیب وتمدن کے اعتبار سے تجزیہ کریں کہ جہاں قرآنِ مجید کا نزول ہوا۔

مورخین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ سرزمینِ حجاز اس زمانہ میں پسماندہ ترین خطہ تصور کیا جاتا تھا اور عصرِ جاہلیت کے لوگوں کو نیم وحشی یا وحشی اقوام کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

عقیدہ کے اعتبار سے وہ لوگ بت پرستی میں غرق تھے اور تمام معاشرے پر پتھر یا لکڑی کے بنائے ہوئے بتوں کا منحوس سایہ پھیلا ہوا تھا۔ مشہور ہے کہ "کھجور" کے بت بنا کر ان کے سامنے دوزانو بیٹھ جاتے، ان کو سجدہ کرتے اور قحط سالی کے موقع پر انھیں کھا جاتے تھے۔

لڑکیوں سے نفرت کی شدت کا یہ عالم تھا کہ انھیں زندہ درگور کردیتے تھے جب کہ فرشتوں کو "خدا کی بیٹیاں" تصور کرتے تھے اور خدا کو تو ایک عام انسان کے رتبہ پر لے آتے تھے۔

"توحید پرستی اور وحدانیت" پر سخت حیران ہوتے تھے اور جب حضرت پیغمبر اکرمؐ نے ان کو دعوت توحید دی تو وہ نہایت تعجب سے کہنے لگے:

أَجَعَلَ الْأٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ

"کیا اس نے بہت سے معبودوں کی جگہ صرف ایک معبود بنا

لیا؟ یہ تو یقیناً بڑی عجیب چیز ہے"۔ (سورۂ ص: آیت ۵)

جو شخص بھی ان کی خرافات، جھوٹے افسانوں اور ان کے نظریات کے خلاف بات کرتا اسے "دیوانہ" کہہ کر پکارنے لگتے۔

قبائلی نظام اپنی پوری شدت کے ساتھ معاشرے پر چھایا ہوا تھا اور قبائلی اختلافات اس قدر شدید تھے کہ ہمیشہ جنگ کی آگ روشن رہتی تھی اور زمین کو ایک دوسرے کے خون سے رنگین رکھتے تھے۔ قتل و غارت گری ان کا روزانہ کا معمول تھا اور اس پر وہ فخر کرتے تھے۔

اہم مرکزی شہر مکہ میں پڑھے لکھے افراد کا شمار انگلیوں پر کیا جاسکتا تھا جب کہ دانش مند اور عالم شاذ ونادر ہی پائے جاتے تھے۔ اس قسم کے معاشرے سے ایک شخص "، کہ جس نے نہ تو اسکول کا رُخ کیا تھا اور نہ ہی کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے تھے" اُٹھتا ہے اور ایک ایسی کتاب لے کر آتا ہے کہ چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی علماء و دانش منداس کی تفسیر میں مشغول ہیں اور ہر دور میں نئے نئے حقائق کا انکشاف کر رہے ہیں۔

قرآن مجید اس کائنات اور اس کے نظام کا انتہائی دقیق اور منظم نقشہ پیش کرتا ہے۔ "توحید" کا مکمل تعارف بھی قرآن کی زبان سے ہی معلوم ہوتا ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق کے اَسرار و رموز، دن و رات، سورج و چاند، جمادات و نباتات اور انسان کی خلقت، غرض یہ کہ ان تمام اشیاء کو خدا کی نشانیوں اور اس کے وجود مبارک کی دلیلوں کے طور پر اپنی مختلف آیات میں مختلف انداز، تعبیرات اور تشبیہات سے پیش کرتا ہے۔

بعض اوقات وہ انسان کے وجود کی گہرائیوں میں اُترتا ہے اور وہاں سے اُٹھنے والی آواز کے ذریعے ثابت کرتا ہے کہ "توحید" اور "یکتا پرستی" انسان کی

فطرت میں داخل ہے۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ (سورۂ عنکبوت: آیت ۶۵)

"وہ جب کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں۔ پھر جب وہ انھیں نجات دے کر خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو وہ شرک کرنے لگتے ہیں"۔

اور کبھی عقل و دانائی کے ذریعے استدلال کرتے ہوئے "توحید" کو ثابت کرتا ہے اور اس کائنات اور خود اپنے نفوس میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ زمین و آسمان، حیوانات، پہاڑوں، دریاؤں، بارش کے برسنے، بادِ نسیم کے جھونکوں اور انسانی جسم و روح کی انتہائی دقیق، منظم اور پیچیدہ تخلیقی اسرار و رموز سے پردہ اٹھاتا ہے۔

خداوند متعال کی صفات کو انتہائی گہرے لیکن دلکش انداز سے پیش کرتا ہے۔

ایک جگہ فرماتا ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (سورۂ)

"کوئی چیز اس کے مانند نہیں ہے"۔

جبکہ دوسری جگہ فرماتا ہے:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ○ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

"وہی اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ پنہاں اور آشکار چیزوں کا جاننے والا ہے، وہی رحمٰن اور رحیم ہے۔ وہی اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہی بادشاہ ہے، نہایت پاکیزہ، سلامتی دینے والا، امان دینے والا، تسلط قائم رکھنے والا، بڑا غالب آنے والا، بڑی طاقت والا، کبریائی کا مالک ہے۔ پاک ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ وہی اللہ ہی خالق، پیدا کرنے والا اور صورت گر ہے جس کے لیے حسین ترین نام ہیں جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ سب اس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے"۔ (سورۂ حشر: آیت ۲۲ تا ۲۴)

خداوند عالم کے "لامحدود علم" کی توصیف ان دل کش الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"اور اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر کے ساتھ مزید سات سمندر مل (کر سیاہی بن) جائیں تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے"۔ (سورۂ لقمان: آیت ۲۷)

خداوند عالم کے ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کو ایسی اعلیٰ ترین تعبیرات سے پیش کرتا ہے کہ یہ تعبیرات صرف قرآن کا ہی خاصہ ہو سکتی ہیں۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ

"اور مشرق ہو یا مغرب، دونوں اللہ ہی کے ہیں۔ پس تم جدھر بھی رُخ کرو اُدھر اللہ کی ذات ہے"۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۱۱۵)

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ

"تم جہاں بھی ہو وہ تمھارے ساتھ ہوتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو،

اللہ اس پر خوب نگاہ رکھنے والا ہے"۔ (سورۂ حدید، آیت ۴)

قیامت اور یوم حشر کی بات ہو تو قیامت کا انکار اور تعجب کرنے والے مشرکین کے بارے میں کہتا ہے:

"(انسان اپنی خلقت کو بھول کر کہنے لگتا ہے) ان ہڈیوں کو خاک ہونے کے بعد کون زندہ کرے گا؟"

"کہہ دیجیے! انھیں وہی زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور وہ ہر قسم کی تخلیق کو خوب جانتا ہے"۔

"وہی خدا جس نے تمھارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی پھر تم اس سے آگ لگاتے ہو (وہی خدا کہ جس نے پانی کے ہمراہ آگ کے شعلہ کو وجود بخشا ہے اس بات پر بھی قادر ہے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی عطا کرے)۔

"جس نے آسمانوں اور زمین کو (اس تمام تر عظمت کے ساتھ) پیدا کیا ہے آیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کرے؟ کیوں نہیں! وہ تو بڑا خالق (اور) دانا ہے"۔

(اس کی قدرت کا تو یہ عالم ہے کہ) جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرلیتا ہے تو بس اس کا امر یہ ہوتا ہے: ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے (اس قدرت کے بالمقابل انسانوں کا دوبارہ زندہ ہونا، بہت ہی آسان اور معمولی بات ہے)۔ (سورۂ یٰسین: آیت ۷۸ تا ۸۲)

قرآن لوگوں کے اعمال کے بارے میں یوں کہتا ہے:

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ○ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ○

"اس (خوف ناک) دن وہ (زمین) اپنے حالات بیان کرے گی، کیونکہ اس کے رب نے اسے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا"۔ (سورۂ زلزال: آیت ۴-۵)

اور کبھی ہاتھ، پاؤں اور بدن کی سخت جلد کی گواہی کا تذکرہ بھی قرآن صراحت کے ساتھ کرتا ہے:

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ (سورۂ یٰسین: آیت ۶۵)

"آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیتے ہیں اور ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے (اس کے بارے میں جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں)"۔

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (سورۂ فصلت: آیت ۲۱)

"تو وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے: تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ وہ جواب دیں گے: اسی اللہ نے ہمیں گویائی عطا کی جس نے ہر چیز کو گویائی دی ہے (تاکہ ہم حقائق بتا سکیں)"۔

قرآن مجید کے معارف کی قدر و قیمت اور اس کے مضامین کی عظمت اور ان مضامین کا ہر قسم کی خرافات سے پاک ہونا اس وقت زیادہ واضح ہوجاتا ہے جب ہم اس کا مقایسہ "تحریف شدہ توراۃ اور انجیل" سے کرتے ہیں، مثلاً:

توراۃ حضرت آدمؑ کی خلقت کے بارے میں کیا کہتی ہے؟ قرآن کیا کہتا ہے؟ انبیاءؑ کے واقعات اور داستانیں توراۃ کس انداز میں پیش کرتی ہے؟ قرآن کا انداز بیان کیسا ہے؟

توراۃ اور انجیل خدا کو کن صفات کے ساتھ متصف قرار دیتی ہیں اور قرآن خداوند متعال کی توصیف کیسے بیان کرتا ہے؟

اگر ہم یہ اور ان جیسے دیگر سوالات کے جوابات ان کتابوں سے تلاش کریں تو ان کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے۔ [1]

[1] مزید وضاحت کے لیے "رہبران بزرگ" نامی فارسی کتاب کا مطالعہ کریں۔

maablib.org

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱۔ وہ محیط جس میں قرآن نازل ہوا اور اس معاشرہ کی خصوصیات بیان کریں؟

۲۔ سرزمینِ حجاز کے اپنے والوں کے افکار پر بت پرستی کے اثرات کیا تھے؟

۳۔ "توحید فطری" اور "توحید استدلالی" کے درمیان فرق واضح کریں؟

۴۔ پروردگار عالم کی معرفت اور اس کی صفات کے بارے میں قرآنِ مجید کے انداز تخاطب کے چند نمونے بیان کریں؟

۵۔ کس طریقے سے قرآنِ مجید اور اس کے مضامین کی خصوصیات کا بہتر احاطہ کیا جاسکتا ہے؟

maablib.org

اٹھواں سبق

# قرآن اور جدید علمی انکشافات

بلاشک وشبہ قرآنِ مجید علوم طبیعیات (Physics) یا طب (Medical) یا علمِ نفسیات (Psychology) یا علوم ریاضی کی کتاب نہیں ہے۔

قرآنِ مجید ایک انسان ساز اور ہدایت دینے والی کتاب ہے اور ہر وہ چیز جو اس ہدف کے لیے ضروری ہے اس میں موجود ہے۔ ہمیں قرآنِ مجید کو مختلف علوم کا دائرۃ المعارف یا انسائیکلوپیڈیا (Encyclopaedia) سمجھنے کے بجائے اس سے ایمان وہدایت کا نور، تقویٰ و پرہیزگاری، انسانیت و اخلاق اور نظم وضبط کے قوانین اخذ کرنے چاہییں اور یہ تمام چیزیں قرآنِ مجید میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

لیکن قرآنِ مجید میں علوم طبیعیات کے مسائل اور اس کائنات کے حُسن و اَسرار و رُموز کو جاننے کے لیے بھی مختلف اشارے اور تعبیرات موجود ہیں، خصوصاً "توحید" کے متعلق "برہان نظم" کی ابحاث میں اس کائنات کے اَسرار و رُموز سے پردہ اُٹھایا گیا ہے اور ایسے ایسے انکشافات کیے گئے ہیں کہ آج کے ترقی یافتہ زمانے میں بھی سائنس دان ان اَسرار کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکے۔

اس قسم کے انکشافات کے مجموعہ کو ہم "قرآن کے علمی معجزات" کا نام دے سکتے ہیں۔ یہاں پر ہم چند علمی معجزات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

## قرآن اور قوت جاذبہ کا قانون

مشہور سائنس دان نیوٹن سے پہلے کسی نے بھی کششِ ثقل کے قانون کو مکمل

طور پر دریافت نہیں کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن نیوٹن سیب کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا کہ ایک سیب درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گر گیا۔ اس معمولی اور عام سے واقعہ نے اسے فکر کی نئی راہوں سے آشنا کیا اور وہ کئی سال سوچتا رہا کہ یہ کون سی طاقت ہے کہ جس نے سیب کو اپنی طرف کھینچ لیا؟ سیب درخت سے ٹوٹ کر آسمان کی طرف کیوں نہیں گیا؟ اور پھر سالہا سال کی سوچ و بچار کے نتیجے میں اس نے قانونِ جاذبہ یا کششِ ثقل کا انکشاف کیا جس سے ثابت ہوا کہ دو جسم ایک دوسرے کو مخصوص فاصلہ رکھتے ہوئے کھینچتے ہیں۔ اس قانون کے انکشاف کی روشنی میں منظم نظام شمسی کو ثابت کیا گیا کہ بہت بڑے بڑے کرّات اپنے اپنے مدار میں سورج کے گرد کیوں گھومتے ہیں؟ وہ مدار سے نکل کر ایک دوسرے سے ٹکراتے کیوں نہیں؟ یا ایک دوسرے پر گر کیوں نہیں جاتے؟ وہ کون سی قدرت ہے کہ جس نے اس لامتناہی فضا میں ایک دقیق دائرے کے اندر ان کرّات کو گردش کی حالت میں زندہ رکھا ہوا ہے اور وہ سوئی کی نوک کے برابر بھی اس کی خلاف ورزی نہیں کرتے؟!

جی ہاں! نیوٹن نے اس راز کو کشف کیا کہ اس دائرہ کی حرکت میں تیزی سے گھومنے والا جسم ایک طرف مرکز سے دُور ہوتا ہے اور اسی وقت وہ مرکز کی طرف کھنچا بھی جا رہا ہے۔ یہ قانون دافعہ و جاذبہ نے جسم کو متعادل حالت میں رکھا ہوا ہے کہ وہ اپنے مدار میں رہنے پر مجبور ہے"۔

لیکن ان تمام حقائق کو قرآنِ مجید سورۂ رعد کی دوسری آیت میں چودہ سو سال قبل بیان کر چکا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ

تُوْقِنُوْنَ○ (سورۂ رعد: آیت ۲)

"اللہ وہ ذات ہے جس نے آسمانوں (آسمانی کرات) کو تمھیں نظر آنے والے ستونوں کے بغیر (یعنی غیر مرئی ستونوں کے ساتھ) بلند کیا۔ پھر اس نے عرش پر سلطنت اُستوار کی اور سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ ان میں سے ہر ایک مقررہ مدت کے لیے چل رہا ہے، وہی اُمور کی تدبیر کرتا ہے، وہی نشانیوں کو تفصیل سے بیان کرتا ہے شاید تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو"۔

اسی آیت کے ذیل میں حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

الیس اللہ یقول بغیر عمد ترونھا؟ قلت: بلٰی، قال: ثم عمد لکن لا ترونھا

"کیا خدا نہیں فرماتا کہ تمھیں نظر آنے والے ستونوں کے بغیر (ہم نے اسے بلند کیا) راوی کہتا ہے کہ امامؑ کے استفسار کے جواب میں مَیں نے کہا: جی ہاں، امامؑ نے فرمایا: لہٰذا ستون موجود ہیں مگر تم انھیں نہیں دیکھ سکتے"۔

کیا "قوت جاذبہ" کی وضاحت کے لیے عربی زبان میں عمدٍ لا ترونھا (اُردو میں غیر مرئی ستون) سے بہتر، واضح اور سادہ تعبیر وجود رکھتی ہے؟!

ایک اور حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ھذا النجوم التی فی السماء مدائن مثل المدائن التی فی الارض مربوطۃ کل مدینۃ الی عمود من نُور

"آسمان پر موجود یہ ستارے زمین پر موجود شہروں کی طرح

(بڑے بڑے) شہر ہیں، اور ہر شہر دوسرے شہر کے ساتھ
(ہر ستارہ دوسرے ستارے کے ساتھ) نور کے ستونوں کے
ذریعے جڑا ہوا ہے"۔

اس جدید دور میں سائنس دان اور ماہرین فلکیات تسلیم کرتے ہیں کہ "آسمان پر موجود ستاروں میں سے کروڑوں ستارے ایسے ہیں کہ جن پر زندگی اور عقل رکھنے والے اجسام موجود ہیں"۔ اگرچہ یہ ستارے ابھی تک انسان کی دسترس میں نہیں ہیں"۔

## زمین کی اپنے گرد اور سورج کے گرد گردش

کہتے ہیں کہ سب سے پہلے جس شخص نے زمین کی اپنے گرد (اور اپنے مدار میں) حرکت کا انکشاف کیا وہ اٹلی (Italy) کا رہنے والا ماہر فلکیات گالیلو تھا۔ یہ انکشاف اس نے آج سے تقریباً چار سو سال قبل کیا۔ اس انکشاف سے قبل تمام ماہرین و علمائے ارضیات و فلکیات مصری دانش مند بطلیوس کے نظریہ ہیئت پر عمل پیرا تھے کہ اس کا خیال تھا: "کائنات کا مرکز زمین ہے اور تمام سیارے (کرات) اس کے گرد چکر لگا رہے ہیں"۔

البتہ گالیلو کے اس علمی انکشاف پر کلیسا کے طرف داروں نے اس پر کفر کا فتویٰ جاری کر دیا اور وہ اس بات پر مجبور ہوا کہ اپنے اس علمی انکشاف پر معذرت اور اظہار ندامت کر کے موت سے نجات حاصل کرے لیکن اس کے بعد والے علماء نے اسی کے نظریات کی روشنی میں کام کیا اور آج اس علمی انکشاف کو نہ صرف تمام ماہرین صحیح تسلیم کرتے ہیں بلکہ یہ نظریہ سائنسی تجربات سے بھی ثابت ہو چکا ہے کہ زمین اپنے مدار کے گرد حرکت کرتی ہے اور فضاؤں میں پرواز کے ذریعے انسان اپنی آنکھوں سے اس چیز کا نظارہ کر رہا ہے۔

مختصر یہ کہ زمین کی مرکزیت کا نظریہ غلط ثابت ہوا اور معلوم ہوا کہ یہ صرف ہماری حسی خطا تھی کہ زمین ساکن ہے اور تمام ستارے وسیارے اس کے گرد گردش کر رہے ہیں حالانکہ ہم خود حرکت میں تھے اور ستاروں کو حرکت میں فرض کر رہے تھے۔

بطلیموس کا نظریہ تقریباً پندرہ سو سال تک علماء کے اذہان پر چھایا رہا حتیٰ کہ قرآنِ مجید کے نزول کے بعد بھی کوئی اس نظریے کی مخالفت کی جرأت نہ کرسکا۔ لیکن جب ہم قرآنِ مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں تو سورۂ نمل کی آیت ۸۸ میں واضح طور پر زمین کی حرکت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہو رہا ہے:

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ اللهِ الَّذِيٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ اِنَّهٗ خَبِيْرٌ بِمَا تَفْعَلُوْنَ

"اور آپ پہاڑوں کو دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ یہ ایک جگہ ساکن ہیں جب کہ (اس وقت) یہ بادلوں کی طرح چل رہے ہوں گے۔ یہ سب اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر چیز کو پختگی سے بنایا ہے وہ تمہارے اعمال سے یقیناً خوب باخبر ہے"۔

اس آیت میں پہاڑوں کی حرکت کا ذکر صراحت سے کیا گیا ہے حالانکہ ہم ان کو ساکن سمجھتے ہیں اور پہاڑوں کی حرکت کو بادلوں کی حرکت سے تشبیہ دے کر بتایا جا رہا ہے کہ پہاڑ، بادلوں کی طرح تیزی و نرمی، آرام اور بغیر کسی شور و غوغا کے حرکت کرتے ہیں۔

"زمین کی حرکت" کو پہاڑوں کی حرکت سے تعبیر کر کے اس حقیقت کی عظمت کو آشکار کیا جا رہا ہے، کیونکہ پہاڑ حالت حرکت میں نہیں ہیں بلکہ دراصل ان کی حرکت "زمین کی حرکت" ہے (یا اپنے گرد زمین کا گھومنا یا پھر سورج کے گرد

اس کرہ کی حرکت یا ہر دو مراد ہیں)۔ آپ تصور کیجیے کہ ایک ایسے دور میں "جب تمام علمی محافل اور دانشور حضرات اس بات پر مصر تھے کہ زمین ساکن وثابت ہے اور سورج وستارے حرکت میں ہیں"۔ قرآن مجید نے اس کے برعکس یہ واضح اعلان کیا کہ ایک عظیم علمی معجزہ شمار نہیں کیا جائے گا؟!

اور یہ اعلان بھی ایک ایسے شخص سے کہ جس نے نہ صرف کہیں سے کوئی سبق نہیں پڑھا بلکہ ایک ایسے معاشرے میں زندگی گزار رہا تھا کہ جو معاشرہ علم وتہذیب سے دور شمار ہوتا تھا، کیا یہ انکشاف اس آسمانی کتاب کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے؟!

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ "قرآن کے علمی معجزات" سے کیا مراد ہے؟

۲ سب سے پہلے قانونِ جاذبہ کا اظہار و انکشاف "کس نے" اور کس زمانہ میں کیا؟

۳ قرآن اس قانونِ جاذبہ کی خبر کس آیت میں دے رہا ہے؟ (آیت بتائیں) اور قرآن کی تعبیر بھی بتائیں۔

۴ "زمین کے سکون کا نظریہ" کس نے دیا؟ اور یہ کتنے سال انسانی افکار پر چھایا رہا؟

۵ قرآنِ مجید کس آیت اور کون سی تعبیر کے ذریعے "زمین کی حرکت" کی خبر دے رہا ہے؟

maablib.org

نواں سبق

# پیغمبرؐ اسلام کی سچائی وحقانیت پر ایک اور دلیل

ایک مدعی نبوت اور اس کی دعوت کی سچائی وحقانیت یا کذب و بطلان کا سراغ ''مطالبہ معجزہ'' کے علاوہ دیگر طریقوں سے بھی لگایا جاسکتا ہے اور یہ طریقے دعویٰ کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے ایک مزید واضح دلیل شمار ہوں گے، اور وہ طریقے درج ذیل آثار وقرائن کی دقیق جمع آوری سے حاصل ہوسکتے ہیں:

① اخلاقی خصوصیات اور معاشرتی خدمات۔

② دعوت کے زمانے میں معاشرہ کی وضعیت۔

③ زمان کی شرائط۔

④ دعوت میں شامل مختلف اُمور۔

⑤ داعی کا لائحہ عمل یا پروگرام اور اس ہدف تک پہنچنے کے وسائل۔

⑥ ماحول پر دعوت کے اثرات کا اندازہ۔

⑦ داعی کا اپنے ہدف سے متعلق جذبۂ ایمان وفداکاری۔

⑧ دشمن کی دھمکیوں اور لالچ کی پروا نہ کرنا۔

⑨ عمومی افکار پر تیزی سے اثر انداز ہونا۔

⑩ ایمان لانے والے لوگوں سے متعلق بحث اور یہ کہ وہ کس قسم کے طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔

اگر ہم مندرجہ بالا دس مسائل ہر مدعی (نبوت) کے حوالے سے مورد بحث قرار دیں تو ہم نہ صرف حقانیت کا ایک معیار قائم کرسکتے ہیں بلکہ آسانی کے ساتھ اس کی سچائی یا جھوٹ کا بھی علم حاصل کرسکتے ہیں۔

مندرجہ بالا دس مسائل میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے ایک دقیق بحث کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے بارے میں مفصل بحث کرنے سے چند کتابیں دائرۂ تحریر میں آسکتی ہیں:

① مختلف مکاتب و مذاہب سے تعلق رکھنے والے مؤرخین نے حضرت پیغمبر اسلام کی اخلاقی خصوصیات سے متعلق جو باتیں تحریر کی ہیں ان میں یہ بات سب کے نزدیک تسلیم شدہ ہے کہ آپؐ اس قدر پاک و پاکیزہ اور کارِ خیر کرنے والے تھے کہ زمانہ جاہلیت میں ہی آپؐ کو "امین" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ تاریخ کہتی ہے کہ جب آپؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کیا تو حضرت علیؑ کو اس بات پر مامور کیا کہ آپؐ کے بعد وہ آپؐ کے پاس موجود لوگوں کی امانتیں ان کو لوٹا دیں۔

آپؐ کی شجاعت، استقامت، حُسنِ اخلاق، وسعتِ قلبی، جوانمردی اور درگزر جیسی خصوصیات کا مشاہدہ "حالت جنگ و صلح" ہر جگہ کیا جاسکتا ہے، خصوصاً فتح مکہ کے موقع پر جب آپؐ نے اپنے خونخوار دشمن کے لیے عام معافی کا اعلان فرمایا۔ معافی کا اعلان آپؐ کی ان خصوصیات کی ایک زندہ مثال ہے۔

② تمام افراد جانتے ہیں کہ ایک عام و معمولی انسان (حتیٰ کہ ان میں باکمال لوگ بھی) کسی نہ کسی طرح گردشِ ایام میں کم یا زیادہ معاشرے کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔

اب سوچیے کہ جو شخص چالیس سال تک جاہل و بت پرست معاشرے میں زندگی گزارے، ایک ایسا معاشرہ کہ جس میں ہر شخص کے رگ و پے میں شرک و خرافات

سے

کی بھرمار ہو، اس کے لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ فقط توحید کے ساتھ ملحق رہے اور تمام مظاہر شرک سے اپنے آپ کو بچا کر رکھے؟

کیسے ممکن ہے کہ جہالت کے محور میں رہتے ہوئے علم کے اس اعلیٰ ترین درجات سے کائنات کو منور کرے؟

آیا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ "ماوراء طبیعت" سے تائید الٰہی کے بغیر یہ عجیب شاہکار ظہور میں آسکے؟

۳ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آپؐ کا ظہور کس زمانے میں ہوا؟ وہ ایک ایسا زمانہ تھا جب دنیا قرونِ وسطیٰ کی وادی سے گزرتی ہوئی مطلق العنانیت اور آمریت، ناجائز تعصبات اور ظالمانہ نسلی وطبقاتی امتیازات کا شکار تھی۔ اس بات کو ہم حضرت علیؑ "جو کہ قبل از ظہور اسلام اور بعد از ظہور اسلام کے عینی گواہ ہیں" کی زبانِ مبارک سے نقل کرتے ہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"خدا نے آپؐ کو ایک ایسے زمانے میں رسالت پر مبعوث فرمایا جب لوگ حیرت وتعجب کی وادیوں میں گمراہ و پریشان تھے۔ ان کی عقل ان کی خون آشام ہوا و ہوس کے تابع تھی۔ غرور وتکبر نے انھیں زوال پذیر کردیا تھا۔ جہالت کی اندھیری وادیوں میں بھٹک رہے تھے اور غیض وغضب و اضطراب کی حالت نے انھیں مضطرب و پریشان کر رکھا تھا"۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۹۱)

اب تصور کیجیے ایک ایسا آئین جس کا نعرہ "لوگوں کے درمیان مساوات، تمام نسلی وطبقاتی فرق کو ختم کرنا اور اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (تمام مومن آپس میں بھائی ہیں) پر مشتمل ہو"۔ اس زمانے کے حالات سے کیا مطابقت رکھتا ہے؟

④ آپؐ کی دعوت، تمام ابعاد میں توحید و وحدانیت، تمام ظالمانہ و جابرانہ امتیازات کا خاتمہ، دنیا کے تمام انسانوں کے درمیان اتفاق و اتحاد، ظلم و ستم کے مقابلہ میں جہاد، ایک عالم گیر عادلانہ حکومت کی بنیاد، مظلوم اقوام کا دفاع، تقویٰ، پاکیزگی اور امانت داری کو انسان کی قدر و قیمت کا معیار قرار دینا، جیسے اہم ترین موضوعات پر مشتمل تھی۔

⑤ اپنے الٰہی پروگرام کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے کسی بھی صورت میں غیر منطقی راستوں سے فائدہ نہ اُٹھایا اور نہ ہی کسی کو اس بات کی اجازت دی اور ہمیشہ اپنے مقدس اہداف کے حصول کے لیے مقدس وسائل کا انتخاب کیا۔ قرآن صریحاً اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے:

وَلَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا (سورۂ مائدہ: آیت ۸)

"اور کسی قوم کی دشمنی تمھاری بے انصافی کا سبب نہ بنے...... الخ"

جنگ کے میدانوں میں اخلاقی اُصولوں کی رعایت، غیرفوجی (عام) انسانوں کو اذیت و تکلیف نہ دینا، باغات و درختوں کو پامال نہ کرنا، دشمن کے پینے کے پانی کو آلودہ نہ کرنا، جنگی قیدیوں سے محبت و رعایت کا سلوک اور ان جیسے دسیوں احکامات اس واقعیت کو روشن کرنے کے لیے تاریخ کے اَوراق پر موجود ہیں۔

⑥ آپؐ کی دعوت توحید اس قدر پُرتاثیر تھی کہ دشمنانِ اسلام ہمیشہ آپؐ کے قریب آنے سے خوف زدہ رہتے تھے کیونکہ آپؐ میں قوت جاذبہ اور کلام میں نفوذ کا اثر بدرجۂ اتم موجود تھا۔ بعض اوقات آپؐ کی گفتگو کے دوران دشمنانِ اسلام شور و غل کرتے تھے تاکہ لوگ آپؐ کے کلام مبارک کو سن کر آپؐ کے گرویدہ اور اسلام کے پیروکار نہ بن جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ دشمنانِ اسلام نے آپؐ کے کلام کی

تاثیر سے خوف زدہ ہو کر آپؐ کو "ساحر" اور آپؐ کے کلام کو "سحر" کہنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات آپؐ کی دعوت کے پرتاثیر ہونے اور قلوب پر چھا جانے کا اعتراف تھی۔

⑦ اپنی دعوت سے آپؐ کا لگاؤ اور اس الٰہی آئین نامہ سے آپؐ کا عشق و فداکاری اور اس کا پابند ہونا بھی آپؐ کی حقانیت کی دلیل ہے۔

بعض جنگوں کے میدانوں سے جب تازہ اسلام لانے والے لوگوں کے پاؤں اُکھڑ گئے تو آپؐ انتہائی سختی سے دشمن کے مقابلے پر ڈٹے رہے اور دشمن کے لالچ دینے یا دھمکانے، غرض ہر قسم کے انداز و اطوار کے مقابلے میں ثابت قدم رہے اور کوئی بھی بات یا مسئلہ آپؐ کے پاؤں میں لغزش پیدا نہ کر سکا۔

⑧ کفار نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ آپؐ کو اپنی انحرافی سازشوں کے جال میں پھانس لیں مگر آپؐ کبھی اس جال میں نہ آئے۔ آپؐ نے فرمایا:

اگر سورج کو میرے ایک ہاتھ پر اور چاند کو دوسرے ہاتھ پر رکھ دیا جائے (تمام نظام شمسی کو میرے زیر تسلط قرار دے دیا جائے) تو تب بھی میں اپنے ہدف سے ہرگز دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں"۔

⑨ عام انسانوں کے لیے آپؐ کی دعوت نہ صرف پراثر تھی بلکہ انتہائی تیزی و ناقابل بیان سرعت کے ساتھ ان کے افکار میں تبدیلی کا باعث بھی بنی۔ جن افراد نے اسلام کے بارے تحقیق کرنے والے مغربی لوگوں کی اسلام سے متعلق کتب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ مغربی محققین "اسلام کی پیدائش اور پھر تیزی کے ساتھ اس کے پھیلاؤ" سے کس قدر حیران ہیں۔

مثلاً مغرب کے تین مشہور اساتذہ کہ جنھوں نے "تاریخ تمدن عرب اور مشرق میں اس کی بنیادیں" نامی کتاب تحریر کی ہے، اس حقیقت کا اعتراف کرتے

ہوئے لکھتے ہیں: ''اُس بات کو جاننے کے لیے کہ اسلام نے اس قدر تیزی سے کیسے ترقی کی؟ اور ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں ترقی پذیر دنیا کے تمام اہم علاقوں پر چھا گیا۔ اب تک کی گئی تمام کوششوں کے بعد بھی یہ راز اور معمہ حل نہیں ہوسکا''۔

جی ہاں! یہ واقعاً ایک معمہ ہی ہے کہ اس زمانے کے ناگفتہ بہ وسائل کے باوجود اس قدر تیزی کے ساتھ اسلام کروڑوں لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں کیسے اُتر گیا؟ بہت سی تہذیبوں اور ثقافتوں کو ختم کر کے ایک نئی تہذیب اور ثقافت کو کیسے وجود میں لے آیا؟

۱۰ آپؐ کے دشمن کفر و استکبار کے سردار، ظالم، ثروت مند اور خود پسند تھے جب کہ آپؐ کی دعوت پر ایمان لانے والوں کی اکثریت پاک دل نوجوان تھے اور ایک بہت بڑا گروہ جو محروم و مظلوم طبقات پر مشتمل تھا حتیٰ کہ غلام بھی تھے یعنی وہ افراد کہ جن کا تمام سرمایہ فقط سچائی و پاک دلی تھی اور وہ حق کے متلاشی اور پیاسے تھے۔

اس تمام بحث کے بعد کہ جس کی شرح بہت تفصیلی ہے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ آپؐ کی دعوت ایک الٰہی دعوت تھی، ایک ایسی دعوت جو لوگوں کی طبائع اور نفوس میں اُتر گئی، ایک ایسی دعوت جو پروردگار کی طرف سے لوگوں کو فساد و تباہی، جہالت، شرک اور ظلم و ستم سے نجات دلانے کے لیے بھیجی گئی تھی۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ کیا پیغمبر اسلام کی حقانیت کی پہچان کے لیے معجزہ کے علاوہ بھی کوئی دلیل ہے؟ اگر ہے تو بیان کریں؟

۲ ''قرائن کی جمع آوری'' سے کیا مراد ہے اور کن اُمور سے متعلق زیادہ فکر کرنے کی ضرورت ہے؟

۳ قبل از اسلام اور بعد از ظہور اسلام کے عرب معاشرے کے باہمی مقایسہ و تقابل سے ہمیں کن باتوں کا علم ہو سکتا ہے؟

۴ زمانہ جاہلیت میں عرب معاشرے کی حالت کیا تھی؟ توضیح دیں۔ دیگر دنیا کے حالات بھی مختصراً بیان کریں۔

۵ دشمنانِ اسلام حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جادوگر کیوں کہتے تھے؟

maablib.org

## دسواں سبق

# پیغمبرِ اسلام کا آخری نبی ہونا

### خاتمیت کا دقیق مفہوم

پیغمبر اسلام ﷺ خدا کے آخری پیغمبرؐ ہیں اور نبوت کا سلسلہ آپؐ پر ختم ہو گیا ہے۔ یہ بات "ضروریات دین مبین اسلام" میں سے ہے۔

"ضروری یا ضروریات" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی مسلمانوں کی صف میں داخل ہوتا ہے بہت جلد جان لیتا ہے کہ تمام مسلمان اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں اور یہ چیز مسلمانوں کے نزدیک واضح اور تسلیم شدہ ہے، یعنی جو شخص بھی کسی مسلمان سے کوئی تعلق قائم کرے اسے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ جس طرح مسلمان خدا کی "توحید" کے قائل ہیں اسی طرح پیغمبرؐ اسلام کے آخری نبی ہونے پر بھی سب کا اتفاق ہے اور کوئی بھی مسلمان کسی اور نبی کے انتظار میں نہیں ہے۔

درحقیقت بعثتِ انبیاءؑ سے قافلہ بشریت نے تکامل کے مختلف مراحل یکے بعد دیگرے طے کیے ہیں اور بالآخر انسان رُشد و تکامل کی اس منزل تک پہنچ گیا کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے یعنی "اسلام کی مکمل اور جامع تعلیمات کی روشنی میں اپنے مسائل اور مشکلات کو حل کر سکتا ہے"۔

بالفاظ دیگر اسلام آخری اور جامع ترین قانون کا نام ہے کہ جس کے ذریعے بشر اپنے مسائل حل کر سکتا ہے۔ اعتقادات کے حوالے سے دینی بصیرت کا مسئلہ ہو یا عمل کے اعتبار سے نظم و ضبط، اسلام انسان کی تمام ضروریات کو ہر زمانے میں اور

ہر جگہ پر حل کرتا ہے۔

## پیغمبرِ اسلام کے خاتم الانبیاءؑ ہونے کی دلیل

اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے ہمارے پاس متعدد دلائل ہیں جن میں سے زیادہ روشن درج ذیل تین دلیلیں ہیں:

① اس مسئلہ کا ضروری ہونا کہ جیسا ہم کہہ چکے ہیں کہ کوئی بھی شخص دنیا کے کسی بھی کونے میں موجود کسی مسلمان سے رابطہ کرے تو وہ اسے "پیغمبرِ اسلام کی خاتمیت" کا معتقد پائے گا، لہٰذا اگر کوئی شخص "اسلام" کو "دلیل اور منطق" کے ذریعے بطور مذہب اختیار کرے تو اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ "خاتمیت" کے عقیدہ کو بھی اختیار کرے، کیونکہ ہم گذشتہ اسباق میں اسلام کی حقانیت اور اس کے قوانین کو متعدد دلیلوں سے ثابت کر چکے ہیں اور چونکہ "خاتمیت کا عقیدہ" بھی ضروریاتِ دین میں سے ہے لہٰذا اس کو تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔

② آیاتِ قرآن بھی آپؐ کے آخری نبی ہونے پر گواہ ہیں، جیسے مثلاً:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ (سورۂ احزاب: آیت ۴۰)

"محمدؐ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، ہاں وہ اللہ کے رسولؐ اور خاتم النبیینؐ ہیں...الخ"۔

یہ تعبیر قرآنِ مجید نے اس وقت پیش کی جب عربوں میں "لے پالک بچوں" کا رواج عام تھا۔ وہ کسی کے بچے کو لے کر اپنا فرزند قرار دے دیتے تھے اور حقیقی اولاد کی طرح اپنے خاندان میں شامل کر لیتے تھے۔ وہ "محرم" ہوتا اور "میراث" کا بھی حق دار قرار دیا جاتا تھا۔

لیکن اسلام نے آکر اس جاہلانہ رسم کا خاتمہ کیا اور کہا: "لے پالک بچے

حقیقی بیٹوں کی طرح شرعی وحقوقی قوانین میں شریک نہیں ہو سکتے"۔ ان میں سے ایک "حضرت زید" بھی تھے جن کی پرورش آپؐ نے فرمائی تھی لیکن وہ آپؐ کے حقیقی فرزند شمار نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا قرآن مجید نے کہا: بجائے اس کے کہ تم پیغمبرؐ اسلام کو ان لوگوں میں سے کسی کا باپ کہہ کر پکارو اور ان کے دو حقیقی اوصاف "رسالت" اور "خاتمیت" (یعنی رسولؐ اللہ یا خاتم النبیینؐ سے پکارا کرو)۔

ان تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا آخری نبی ہونا آپؐ کی رسالت کی طرح واضح طور پر روشن اور ثابت تھا۔

اب یہ سوال باقی ہے کہ "خاتم" کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

"خاتم" کی اصل "ختم" ہے، جس کا معنی "ختم کرنے والا اور وہ چیز کہ جس کے ذریعے کسی کام کو ختم کیا جائے" ہے مثلاً خط کے آخر میں لگائی جانے والی مہر کو بھی "خاتم" کہتے ہیں اور انگوٹھی کے نگینے کو "خاتم" کہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس زمانہ (جاہلیت) میں "نام والی مہر" کی بجائے نگینے سے ہی کام لیا جاتا تھا۔ ہر ایک کی انگوٹھی کے نگینہ پر مختلف اور مخصوص نقش ونگار یا نام کندہ ہوتا تھا اور وہ اسے اپنے خط یا مکتوب کے آخر میں لگا دیتا تھا۔

اسلامی روایات میں ہے کہ جب آپؐ نے اس زمانے کے مختلف بادشاہوں، سرداروں اور رئیسوں کے نام اسلام قبول کرنے کی دعوت دینے کے لیے خطوط لکھنے کا فیصلہ فرمایا تو آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ: "غیر عرب بادشاہ مہر کے بغیر کسی بھی خط کو قبول نہیں کرتے" جب کہ اس وقت تک پیغمبرؐ اسلام کے تمام خطوط مکمل طور پر سادہ اور بغیر مہر کے ہوتے تھے۔ لہٰذا آپؐ کے حکم سے ایک انگوٹھی تیار کی گئی اور اس کے نگینے پر "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا جملہ نقش کیا گیا اور پھر آپؐ کے تمام خطوط پر یہی مہر لگائی جاتی تھی۔ لہٰذا "خاتم" کا اصلی معنی "ختم کرنے والا" اور

"آخر تک پہنچانے والا" ہے۔

۳ بہت سی روایات واضح طور پر آپؐ کے "آخری نبی" ہونے کو ثابت کرتی ہیں۔ ان میں سے کچھ روایات ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

الف: تفسیر مجمع البیان میں ایک معتبر حدیث حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے منقول ہے اور آپ نے یہ حدیث پیغمبر اکرم ﷺ سے ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

> "انبیاءؑ کے درمیان میری مثال ایسے ہی ہے کہ جیسے کسی شخص نے ایک خوب صورت محل تعمیر کیا ہو مگر صرف ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی ہو جس کے نتیجے میں جو شخص بھی اس محل کو دیکھتا ہے تو یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ کیا خوب صورت محل ہے لیکن ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے۔ مَیں وہی آخری اینٹ ہوں اور تمام انبیاءؑ کی نبوت کا سلسلہ میرے اُوپر ختم ہو گیا ہے"۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

> حلال محمد حلال ابداً الی یوم القیامة وحرامه حرام ابداً الی یوم القیامة
>
> "حلال محمدؐ قیامت تک حلال اور حرام محمدؐ قیامت تک حرام ہے"۔ (اُصول کافی، ج ا، ص ۵۸)

اہلِ تشیع اور تسنن کے ہاں پیغمبر اکرم ﷺ کی مشہور و معروف حدیث میں آپؐ حضرت علی علیہ السلام کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لانبی بعدی
>
> "آپؑ کی میرے ساتھ وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کی موسیٰؑ سے

تھی مگر یہ کہ میرے بعد سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا ہے"۔

اس کے مشابہ بھی دسیوں احادیث اس بات کو ثابت کرتی ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری نبی ہونے کے بارے میں کچھ سوالات ایسے ہیں کہ جن کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے:

① بعض افراد کہتے ہیں اگر (لوگوں کی ہدایت کے لیے) انبیاءؑ کا بھیجا جانا خدا کی طرف سے ایک بہت بڑا فیض و کرم ہے تو موجودہ زمانے کے لوگ اس بہت بڑے فائدے سے محروم کیوں ہیں؟ اس زمانے کے لوگوں کی رہبری اور ہدایت کے لیے کسی نئے رہنما کو کیوں نہیں بھیجا جاتا؟

اِسی قسم کی باتیں کرنے والے لوگ اس حقیقت سے غافل ہیں کہ ہمارے زمانے میں کسی نبیؑ کے نہ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس زمانے کے لوگ وہ لیاقت اور خوبی نہیں رکھتے کہ جس کی وجہ سے ان کے لیے نبی بھیجا جائے بلکہ اس زمانے میں فکری وعلمی طور پر کاروانِ انسانیت اس مقام تک پہنچ چکا ہے کہ اگر اس کے پاس پیغمبرؐ اسلام کی صحیح تعلیمات ہوں اور وہ ان پر عمل بھی کرے تو وہ صراط مستقیم پر قائم و دائم رہ سکتا ہے۔

ہم وضاحت کے لیے ایک مثال پیش کرتے ہیں:

اُولوالعزم انبیاء (یعنی وہ نبی جو صاحبِ کتاب اور نئی شریعت کے ساتھ مبعوث ہوئے) پانچ ہیں: حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک خاص زمانے میں لوگوں کی ہدایت اور ان کے رُشد وکمال کے لیے تکالیف برداشت کیں، جس کے نتیجے میں قافلۂ بشریت ایک مرحلے سے گزر کر دوسرے مرحلے میں داخل ہوتا رہا اور دوسرے اُولوالعزم پیغمبرؐ نے اس قافلے کو تیسرے کے حوالے اور پھر آخر میں یہ قافلہ

اپنی آخری منزل تک پہنچ کر اس قابل ہو گیا کہ اپنے راستے پر قائم و دائم رہ سکے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک طالب علم اپنی تعلیم کو مکمل کرنے کے لیے مختلف تعلیمی مراحل طے کرتا ہے تاکہ تعلیم سے فارغ ہو سکے (البتہ فارغ التحصیل ہونا کوئی قابلیت کا معیار نہیں ہے بلکہ ایک کامیاب اور مستقل زندگی اصل معیار ہے)۔ پہلے پرائمری، پھر مڈل، ہائی، ایف اے، ایم اے اور آخر میں پی ایچ ڈی - Doctor of Philosophy یا M.B.B.S۔

اگر ایک ڈاکٹر اسکول یا یونیورسٹی میں نہیں جاتا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے، وہ صلاحیت ہی نہیں رکھتا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس اتنی علمی معلومات ہیں کہ اپنی علمی مشکلات کو حل کر سکتا ہے یا مزید مطالعہ کر کے ترقی کی منازل عبور کر سکتا ہے۔

② دوسرا اعتراض چونکہ معاشرہ ہمیشہ تغیر و تبدل کا شکار ہے لہٰذا اسلام کے مستقل اور یکساں قوانین معاشرے کے جدید مسائل اور ضروریات کا حل پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

جواب: اسلامی قوانین دو قسم کے ہیں:

○ پہلی قسم ان قوانین پر مشتمل ہے جو انسانی خصوصیات کی طرح ثابت اور برقرار ہیں جیسے "توحید کا عقیدہ"، "اجتماعی عدالت کے قوانین کا اجرا"۔ ہر قسم کے ظلم و ستم اور ناانصافی کے خلاف آوازِ حق کو بلند کرنا وغیرہ۔

○ دوسری قسم ان جامع قوانین اور اُصولوں پر مبنی ہے جو مختلف موضوعات کے تغیر و تبدل کے ساتھ نئی صورت کو قبول کرتے ہیں اور جدید زمانے کی مشکلات اور مسائل کا حل پیش کرتے ہیں مثلاً ہمارے پاس ایک "اسلامی قاعدہ" بعنوان اُوفُوا بِالعُقُود (اپنے عہد و پیمان کا احترام کرتے ہوئے انھیں پورا کرو) موجود ہے۔

ہمیں زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف تجارتی، سیاسی اور اجتماعی مفید قراردادیں (Resolution) پیش آتی ہیں۔ ہم مندرجہ بالا قانونِ کلی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان جدید مسائل کا جواب دے سکتے ہیں۔

اسی طرح دوسرا قاعدہ بنام "قاعدہ لَاضَرَرَ وَلَاضِرَارَ" ہر اس قانون اور حکم کے مقابلے میں ہمارا مددگار ہے جو قانون کسی فرد یا معاشرہ کے لیے باعثِ ضرر و نقصان ہو۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ اسلام کے کُلی قوانین کس قدر ہمارے مسائل اور مشکلات کو حل کرتے ہیں، اور اس قسم کے قوانین "اسلام" میں کثرت سے پائے جاتے ہیں اور انھی قوانین کی مدد سے ہم نے عظیم اسلامی انقلاب کے بعد اپنی پیچیدہ قسم کی مشکلات پر قابو پایا ہے اور انھیں حل کر رہے ہیں۔

③ تیسرا اعتراض: بلاشک و تردید ہم اسلامی مسائل کے سلسلہ میں "رہبر و قائد" کے محتاج ہیں جبکہ سلسلۂ نبوت کے ختم اور ان کے جانشین کے پردۂ غیبت میں ہونے کی وجہ سے ہم رہبر سے محروم ہوگئے ہیں (جبکہ کسی اور نبی کا انتظار بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا ہے) کیا یہ بات اسلامی معاشرے کے لیے شدید نقصان دہ نہیں ہے۔

جواب: اس دور میں ایسے فقیہ کو رہبر قرار دیا گیا ہے جو تمام ضروری شرائط کا حامل، علم و تقویٰ اور سیاسی، اقتصادی، اجتماعی اور معاشرتی مسائل میں ماہر اور صاحبِ نظر ہو۔

اس قسم کے رہبر کی پہچان کے لیے بھی "اسلام" نے ہماری رہنمائی کی ہے، لہٰذا یہ مسئلہ بھی پریشان کن نہیں ہے۔

دراصل "ولایتِ فقیہ" سلسلۂ انبیاءؑ و اوصیاء کا ہی حصّہ ہے۔ "جامع الشرائط

فقیہ کی رہبری" اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی معاشرے سرپرست وراہنما کے بغیر آزاد نہیں چھوڑے گئے۔ ①

---

① مزید وضاحت کے لیے حضرت آیت اللہ مدظلہ کی کتاب "طرح حکومت اسلامی" کی طرف رجوع کریں۔

maablib.org

# سوچیے اور جواب دیجیے

۱ ''خاتمیت'' کا دقیق مفہوم کیا ہے؟

۲ ''آیات قرآن'' سے ''خاتمیت'' کو ثابت کریں۔

۳ ہمارے زمانے کے لوگوں کی طرف انبیاء الٰہی مبعوث کیوں نہیں کیے جارہے ہیں؟ ہم اس اعزاز سے کیوں محروم ہیں؟

۴ اسلامی قوانین کتنی قسم کے ہیں؟ اور ہمارے زمانے کے مسائل کا حل کیسے پیش کرتے ہیں؟

۵ کیا ایک اسلامی معاشرہ رہبر کے بغیر قائم رہ سکتا ہے؟ ہمارے زمانے میں ''رہبری'' کے مسئلے کا حل کیا ہے؟

maablib.org

# امامت

maablib.org

پہلا سبق

# امامت کی بحث کا آغاز کب ہوا؟

ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی وفات کے بعد مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے:

ایک گروہ کا عقیدہ تھا کہ پیغمبرؐ خدا نے اپنے لیے کوئی جانشین معین نہیں فرمایا بلکہ اس کام کو اُمت کے سپرد کر دیا ہے تاکہ اُمت کے افراد مل بیٹھ کر اپنے درمیان میں سے ہی کسی فرد کو اپنا رہبر بنالیں۔ اس گروہ کو "اہلِ سنت" کہا جاتا ہے۔

دوسرے گروہ کا عقیدہ تھا کہ پیغمبرؐ خدا کے جانشین کے لیے ضروری ہے کہ وہ پیغمبرؐ خدا کی طرح گناہوں اور خطاؤں سے پاک و معصوم ہو، نیز ایسے غیر معمولی اور بے پناہ علم کا حامل ہو کہ لوگوں کی روحانی اور مادی رہبری کے عہدہ پر فائز ہو سکے اور اسلام کے اُصولوں کی حفاظت اور بقا کا انتظام کر سکے۔

لہٰذا اس گروہ کا عقیدہ تھا کہ ایسے شخص (جانشین) کا انتخاب صرف خدا کی طرف سے پیغمبرؐ خدا کے وسیلہ سے ممکن ہے اور پیغمبرؐ خدا نے اس وظیفہ کو انجام دیتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام کو اپنے جانشین کے طور پر منتخب کر دیا ہے۔

اس گروہ کو "امامیہ یا "شیعہ" (اہلِ تشیع) کہا جاتا ہے۔

ہمارا ان مختصر سی ابحاث میں مقصد یہ ہے کہ ہم اس مسئلہ (امامت) پر عقلی و تاریخی دلائل، قرآنی آیات اور سنتِ پیغمبرؐ کی روشنی میں غور و فکر کریں۔ لیکن بحث کے آغاز میں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ چند نکات کی طرف اشارہ کریں:

## کیا یہ بحث اختلافات بڑھانے والی ہے؟

بعض لوگ مسئلۂ امامت پر بحث شروع ہوتے ہی فوراً بول اٹھتے ہی کہ آج کل ان باتوں کا زمانہ نہیں ہے۔ موجودہ زمانہ "اتحاد بین المسلمین" کا زمانہ ہے جبکہ جانشین پیغمبرؐ کے موضوع پر گفتگو تفرقہ بازی اور اختلافات کا باعث بنتی ہے۔

آج ہمیں اپنے مشترکہ دشمنوں کا سامنا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ان کے بارے سوچیں: صیہونزم (یہودیت کی عالم گیر تحریک) اور مشرق و مغرب کی سامراجی طاقتوں کا سامنا ہے لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم ان اختلافی مسائل کو پس پشت ڈال دیں لیکن یہ انداز فکر صریحاً ایک غلطی ہے کیونکہ:

① وہ چیزیں جو اختلافات اور تفرقہ بازی کا باعث ہیں وہ تعصب سے بھری ہوئی غیر منطقی اور کینہ پرور ابحاث ہیں۔ لیکن محبت و دوستی کے ماحول میں منطقی دلائل کے ساتھ اور تعصب و دشمنی سے پاک ابحاث نہ صرف اختلاف میں اضافے کا باعث نہیں بنتیں بلکہ باہمی فاصلوں کو کم اور مشترکہ نقطۂ نظر کو تقویت پہنچاتی ہیں۔

خود میں نے حج وزیارات کے متعدد مواقع پر حجاز کے اہلِ سنت کے علماء اور دانشوروں سے کئی بار بحث کی۔ میں اور وہ (علمائے اہلِ سنت) دونوں ہی اس بات کو محسوس کرتے تھے کہ یہ ابحاث نہ صرف ہمارے تعلقات پر برا اثر نہیں ڈالتیں بلکہ آپس میں افہام وتفہیم اور مثبت سوچ وفکر کے بڑھانے کا باعث بنتی ہیں۔ آپس کے فاصلوں کو کم کرتی ہیں اور اگر کوئی بغض وعناد ہو تو اسے دلوں سے دھو ڈالتی ہیں۔

خاص طور پر ان ابحاث کے نتیجہ میں یہ واضح ہو جاتا تھا کہ "ہمارے درمیان بہت سے مشترک نقطۂ نظر موجود ہیں کہ جن پر بھروسہ اور اعتماد کرتے ہوئے ہم اپنے مشترکہ دشمنوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

اہلِ سنت چار مذاہب میں تقسیم ہوئے: ① حنفی ② حنبلی ③ شافعی ④ مالکی۔

ان چار مذاہب کا وجود اہلِ سنت میں تفرقہ کا باعث نہیں بنا، لہٰذا اگر وہ (اہلِ سنت) فقہ شیعہ کو کم از کم ایک پانچویں فقہی مذہب کی حیثیت سے ہی قبول کرلیں تو بہت سی مشکلات اور اختلافات کا خاتمہ ہوسکتا ہے جیسا کہ ماضی قریب میں (تقریباً ۴۰ سال قبل) اہلِ سنت کے ایک بڑے مفتی اور مصر کی الازہر یونیورسٹی کے سربراہ (Chancellor) ''شیخ شلتوت'' نے ایک بڑا موثر قدم اُٹھایا اور اہلِ سنت کے درمیان فقہ شیعہ کا رسمی طور پر اعلان کیا اور اس طرح سے انھوں نے اتحاد اسلامی کے لیے زبردست خدمت انجام دی جس کی وجہ سے ان کے اور ملّتِ تشیع کے مرجع اعلیٰ آیت اللہ العظمیٰ بروجردی مرحوم کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔

۲ ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام کی تجلی ہر مذہب سے زیادہ مذہب تشیع میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اگرچہ ہم تمام اسلامی مذاہب کا احترام کرتے ہیں لیکن ہمارا عقیدہ ہے کہ مذہب تشیع ہی حقیقی اسلام کے سارے پہلوؤں کا مکمل اور بہترین تعارف کراسکتا ہے اور اسلامی حکومت سے متعلق تمام مسائل کا حل پیش کرسکتا ہے۔ تو پھر کیوں نہ اس مکتب کی دلائل کے ساتھ اپنے بچوں کو تعلیم دیں؟ اور اگر ہم یہ کام انجام نہیں دیتے تو یقیناً ہم نے اپنے بچوں کے ساتھ خیانت کی ہے۔

ہم پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ اسلام نے اپنے جانشین کو معین فرمایا ہے۔ کیا مشکل ہے کہ اگر عقل و منطق اور دلائل سے اس موضوع پر بحث کو بڑھائیں؟

لیکن یہ گفتگو کرتے وقت ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے تاکہ دوسروں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ پہنچنے پائے۔

۳ اسلام کے دشمنوں نے ''اتحاد بین المسلمین'' کی بنیادوں کو کمزور کرنے کے لیے شیعوں کے خلاف اہلِ سنت سے اور سنیوں کے خلاف اہلِ تشیع سے اس قدر

جھوٹ بولے اور الزام تراشیاں کی ہیں کہ چند ممالک میں یہ دونوں گروہ ایک دوسرے سے مکمل طور پر دُور ہوگئے ہیں۔

جب ہم "مسئلۂ امامت" کو اس انداز سے "جیسا کہ اُوپر ذکر کیا گیا ہے" پیش کریں اور ان نکات کو کہ جن پر اہلِ تشیع ایمان رکھتے ہیں قرآن وسنت کی روشنی میں دلائل سے واضح کریں گے تو معلوم ہوجائے گا کہ یہ تمام پروپیگنڈا غلط تھا اور ہمارے مشترک دشمنوں نے صرف زہر اُگلا ہے۔

مثال کے طور پر میں یہ نہیں بھول سکتا کہ جب اپنے سعودی عرب کے ایک سفر کے دوران سعودی عرب کی ایک مذہبی شخصیت سے میری ملاقات اور بحث ہوئی تو انھوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ "میں نے سنا ہے کہ جو قرآن اہلِ تشیع کے پاس ہے وہ ہمارے پاس موجود قرآن سے مختلف ہے"۔

مجھے یہ سن کر بڑا تعجب ہوا۔ میں نے ان سے کہا: بھائی اس بات کی تحقیق تو بہت آسان ہے۔

میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ خود یا آپ کا کوئی نمایندہ عمرہ کی ادائیگی کے بعد ایران میں کوئی اطلاع دیے بغیر میرے ہمراہ ایران چلے۔ وہاں پر گلی کوچوں میں موجود مساجد میں بڑی تعداد میں قرآن موجود ہیں۔ اس کے علاوہ سب مسلمانوں کے گھروں میں بھی قرآن موجود ہیں۔ ہم ہر اس مسجد میں جائیں گے جہاں آپ پسند فرمائیں گے یا پھر جس گھر پر پسند فرمائیں گے اس کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے اور ان سے قرآن طلب کریں گے تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ ہمارے اور آپ کے قرآن میں ایک حرف یا ایک نقطہ تک کا اختلاف نہیں ہے (بہت سے قرآن جن سے ہم استفادہ کرتے ہیں وہ سعودی عرب، مصر اور دیگر اسلامی ممالک کے ہی شائع شدہ ہیں)۔

آپ یقین کریں کہ اس محکم اور دوستانہ انداز سے گفتگو کی وجہ سے اسلام دشمنوں نے جو عجیب زہرافشانی اس مشہور شخص کے ذہن میں کر رکھی تھی اس کا اثر ختم ہوگیا۔

گویا امامت سے متعلق گفتگو اس انداز سے جیسا کہ اُوپر بتایا گیا ہے اسلامی معاشرے کی وحدت کو مستحکم کرتی ہے اور حقائق کو روشن کرنے اور آپس کے فاصلوں کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

## امامت کیا ہے؟

''امام'' جیسا کہ اس کے عنوان سے واضح ہے ''مسلمانوں کے پیشوا یا رہبر'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور مذہب شیعہ کے اُصول وعقائد کے اعتبار سے ''امام معصوم'' اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ہر طرح سے پیغمبرؐ کا جانشین ہو لیکن فرق صرف یہ ہے کہ پیغمبرؐ مکتب و مذہب کا بانی ہوتا ہے اور امام اس مکتب و مذہب کا محافظ ونگہبان ہوتا ہے۔ پیغمبرؐ پر وحی نازل ہوتی ہے لیکن امام پر وحی نازل نہیں ہوتی۔ امام پیغمبرؐ سے تعلیمات حاصل کرتا ہے اور غیر معمولی علم کا حامل ہوتا ہے۔

اہلِ تشیع کے عقیدہ کے مطابق امام معصوم صرف اسلامی مملکت کا پیشوا ہی نہیں ہوتا بلکہ روحانی و مادی رہبری اور ظاہری و باطنی مختصر یہ کہ اسلامی معاشرہ کی ہر جہات سے قیادت پر فائز ہوتا ہے۔ نیز اسلامی عقائد واحکام کی حفاظت کا بھی بغیر کسی خطا اور انحراف کے ذمہ دار ہوتا ہے اور وہ خدا کا برگزیدہ بندہ ہوتا ہے۔

لیکن اہل سنت امامت کی اس طرح تشریح نہیں کرتے۔ وہ امامؑ کو صرف اسلامی معاشرے کا حاکم سمجھتے ہیں بالفاظ دیگر ہر دور اور ہر زمانے کے حکمرانوں کو پیغمبرؐ کے خلفاء اور مسلمانوں کے رہبروں کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔

البتہ آئندہ اسباق میں ہم یہ واضح کریں گے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں اللہ

کے ایک نمائندے کا وجود ضروری ہے، یعنی پیغمبرؐ یا ایک امام معصوم زمین پر ہمیشہ ہو تا کہ وہ خدا کے قانون کی حفاظت اور طالبانِ حق کی رہبری و راہنمائی کر سکے اور اگر کسی وجہ سے انسانوں کی نظر سے اوجھل ہو جائے تو اس کے نمائندے احکام الٰہی کی تبلیغ اور اسلامی حکومت کی تشکیل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

١ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ موجودہ زمانہ امامت کی بحث کرنے کے لیے غیر مناسب ہے ان کی منطق (اور دلیل) کیا ہے؟

٢ ان کی منطق (اور دلیل) کو رڈ کرنے اور اس موضوع (امامت) پر بحث کو ضروری قرار دینے کے لیے ہمارے پاس کتنے جواب ہیں؟

٣ اسلام کے دشمنوں نے مسلمانوں کے درمیان کس طریقے سے تفرقہ پھیلایا ہے۔ اس تفرقہ کو ختم کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

٤ کیا آپ دشمنوں کی تفرقہ اندازی کے کچھ نمونے پیش کر سکتے ہیں؟

٥ مذہب تشیع میں "امامت" سے کیا مراد ہے؟ اس کا مذہب اہلِ سنت میں "امامت" کے جو معنی ہے اس سے کیا فرق ہے؟

maablib.org

## دوسرا سبق

# امام کے وجود کا فلسفہ

انبیاءؑ کی بعثت کی ضرورت کے بارے میں اس سے قبل جو گفتگو کی گئی ہے وہ بہت حد تک ہمیں نبی ﷺ کے بعد "امامؑ کے وجود کی ضرورت" سے بھی آگاہ کرتی ہے۔ کیونکہ بہت سے اہم موضوعات میں نبیؐ اور امامؑ مشترک ہیں لیکن اس جگہ پر یہ ضروری ہے کہ ہم بعض دوسری ابحاث پر بھی غور کریں۔

## الٰہی رہبروں کی ہمراہی میں روحانی تکامل

سب سے پہلے ہمیں انسان کی خلقت کے مقصد کو سمجھنا چاہیے جو کہ گلدستۂ کائنات کا سب سے اہم پھول ہے۔ وہ "پروردگار" کی طرف، "کمال کی انتہا تک" اور زندگی کے تمام ابعاد میں تمام روحانی مراحل طے کرنے کے لیے بہت لمبا اور نشیب و فراز سے پُر راستہ طے کرتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان اس راستے پر کسی معصوم پیشوا کی رہبری کے بغیر منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا اور ان مراحل میں کسی آسمانی استاد کی رہنمائی کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہے اس لیے کہ: "راستے میں تاریکیاں ہیں لہٰذا گمراہی کے خطرات سے ڈرو"۔

یہ درست ہے کہ خدا نے انسان کو عقل و خرد کی نعمت سے نوازا ہے۔ اسے محکم اور بھرپور ضمیر عطا کیا ہے۔ آسمانی کتابیں اس کے لیے بھیجی ہیں لیکن پھر بھی ممکن ہے کہ یہ انسان ان تمام تکوینی اور تشریعی وسائل کے باوجود اپنی صحیح راہ کی

شناخت میں غلطی کا شکار ہو جائے۔ لہٰذا بلا شک وشبہ ایک معصوم پیشوا کا وجود اس کی راہ سے انحراف اور گمراہی کے خطرات کو بہت حد تک کم کر دیتا ہے۔ پس امام کا وجود انسان کے مقصد تخلیق کو کمال تک پہنچانے والا ہے۔

یہی وہ چیز ہے جسے عقائد کی کتابوں میں "قاعدۂ لطف" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قاعدۂ لطف: یعنی وہ تمام چیزیں جو انسان کی خلقت کے مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہیں۔ خداوند حکیم نے اس (انسان) کے اختیار میں دے دی ہیں، انبیاءؑ کی بعثت اور امام معصوم کا وجود بھی ان ہی چیزوں میں سے ہے ورنہ (اگر انبیاء اور آئمہ معصومینؑ کو لوگوں کی ہدایت کے لیے نہ بھیجے تو) خلقتِ انسان کی غرض کی مخالفت ہوگی (غور وفکر کیجیے)۔

## آسمانی ادیان کی حفاظت

ہمیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ "الٰہی اَدیان و مذاہب" جب انبیاءؑ کے قلوب پر نازل ہوتے ہیں تو بارش کے پانی کی بوندوں کے مانند صاف وشفاف، حیات بخش اور روح پرور ہوتے ہیں، لیکن جیسے جیسے وہ غلیظ ماحول اور کمزور یا ناپاک ذہنوں سے گزرتے ہیں تو آہستہ آہستہ آلودہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور خرافات اور توہمات کا ان میں اس قدر اضافہ کیا جاتا ہے کہ بنیادی پاکیزگی اور ظرافت ضائع ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں نہ ان کی کوئی جاذبیت باقی رہتی ہے اور نہ ہی تربیت کی تاثیر، نہ ان سے پیاسوں کو سیراب کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ان سے فضائل وکمالات کی کلیاں اور پھول کھل سکتے ہیں۔

ان مواقع پر ضروری ہے کہ مذہب کو اس کی اصلی شکل میں باقی رکھنے اور اس کے مذہبی پروگرام کو خالص رکھنے کے لیے ایک معصوم پیشوا بعنوان "محافظ" موجود رہے تا کہ وہ مذہب کی راہ میں کجی، انحراف، غلط افکار، دوسروں کے ناروا نظریات،

توہمات اور خرافات کو شامل نہ ہونے دے۔ اگر مذہب و شریعت ایک ایسے رہبر کے بغیر رہے تو بہت کم مدت میں ہی اپنی حقیقی شکل وصورت اور خالص حیثیت کھو بیٹھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اللھم بلیٰ، لا تخلوا الارض من قائم الله بحجة، امّا ظاهراً مشهوراً، او خائفًا مغمور لئلا تبطل حجج الله وبيناته

"ہاں، ہرگز زمین حجت الٰہی کے ساتھ قیام کرنے والے سے خالی نہیں ہوسکتی وہ (قیام کرنے والا) چاہے ظاہر و آشکار ہو یا مخفی و پوشیدہ ہو، تاکہ خدا کی دلیلیں اور اس کی واضح نشانیاں باطل نہ ہونے پائیں"۔

درحقیقت آئمہؑ کے قلوب اس محفوظ صندوق (safe) کی مثل ہیں جس میں بیش قیمت اسناد کو چوروں کی دسترس و دیگر حوادث سے محفوظ و مصون رکھا جاتا ہے اور یہ چیز وجود امام کے فلسفوں میں سے ایک فلسفہ ہے۔

## اُمت کی سیاسی و اجتماعی قیادت

بلاشک وشبہ کوئی بھی معاشرہ یا گروہ ایک باصلاحیت و توانا رہبر کی قیادت میں اجتماعی نظام کی موجودگی کے بغیر اپنے آپ کو باقی نہیں رکھ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ قدیم سے اب تک تمام اقوام اور ملل نے اپنے لیے کسی نہ کسی رہبر کو منتخب کیا ہے۔ کبھی تو وہ راہنما صالح ثابت ہوا اور اکثر اوقات غیر صالح ثابت ہوا ہے، اور اکثر ایسا بھی ہوا کہ اُمتوں کے لیے رہبر کے وجود کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے بہت سے قدرت پسند لوگ اپنی طاقت اور ریاکاری کے بل بوتے پر

لوگوں پر تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ان کے تمام اُمور کی ذمہ داری اپنے ہاتھوں میں لے لی...... یہ ایک طرف۔

جبکہ دوسری طرف اگر انسان اپنے روحانی تکامل کے ہدف تک پہنچنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس ہدف کے حصول کی راہ میں تنہا نہ ہو بلکہ اپنے گروہ یا معاشرے کی ہمراہی میں اپنے ہدف کے حصول کے لیے آگے بڑھے کیونکہ ایک معاشرے اور اجتماع کی قوت و توانائی یقینی طور پر ایک تنہا فرد کی فکری، جسمانی، مادی اور روحانی توانائی سے زیادہ ہے۔

لیکن ایسا معاشرہ ہو کہ اس پر صحیح و عادلانہ نظام حاکم ہو کہ وہ نظام انسانی صلاحیتوں کو نکھارتے ہوئے، کج روی اور انحراف کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہوئے تمام انسانوں کے حقوق کی حفاظت کرے، اور اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کے لیے منظم پروگرام اور ادارے قائم کرے اور پورے معاشرے کو ایک آزاد ماحول میں اس اعلیٰ ہدف کی خاطر پُرجوش تحریک کے لیے آمادہ کرے۔

اس عظیم ذمہ داری کی اہلیت و صلاحیت ایک خطاکار انسان میں یقیناً موجود نہیں ہے کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے اس دنیا کے سیاسی قائدین کے صحیح راستے سے انحراف کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ خدا کی طرف سے اس اہم ذمہ داری اور صحیح نظام کی نگرانی کے لیے ایک معصوم رہبر کو مقرر و معین کیا جائے جو انسانی طاقت اور مفکرین کے افکار سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انحرافات کی روک تھام کر سکے۔

امام کے وجود کے فلسفوں میں سے یہ بھی ایک فلسفہ ہے اور ''قاعدۂ لطف'' کے شعبوں میں سے ایک شعبہ (Section) ہے۔

ہم دوبارہ عرض کرتے ہیں کہ بعض مخصوص زمانوں میں جب امام معصومؑ غائب ہوں تو اس وقت لوگوں کے فرائض اور ذمہ داریاں بھی واضح ہو چکی ہیں اور

اگر خدا نے توفیق دی تو "حکومت اسلامی" سے متعلق گفتگو میں ہم اس موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔

## اتمام حجت کی ضرورت

نا صرف ان قلوب کے لیے کہ جو امامؑ کے وجود مبارک کے "نُور" سے فیض یاب ہو کر کمال مطلق کے حصول کے لیے کوشاں ہوں بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی جو "جان بوجھ کر غلط راہوں کے راہی ہیں" (خدا کی طرف سے) اتمام حجت کا ہونا ضروری ہے تا کہ وہ سزا بے دلیل نہ ہو کہ جس کا ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے اور نہ ہی کوئی شخص اس بات پر اعتراض کر کے کہ اگر آسمانی اور الٰہی رہبروں نے ہمارا ہاتھ تھاما ہوتا اور راہِ حق کی طرف راہنمائی کی ہوتی تو ہم ہرگز گمراہ نہ ہوتے۔

خلاصہ یہ کہ ہر عذر اور بہانے کا راستہ بند کر دیا جائے اور حق کو واضح کرنے کے لیے اتنی دلیلیں بیان کی جائیں کہ بے خبر آگاہ ہو اور آگاہ لوگوں کو اطمینانِ قلب حاصل ہو اور ان کے ارادے مضبوط ہو جائیں۔

## امام فیضِ الٰہی کے حصول کا بڑا وسیلہ

اکثر دانشور "احادیث اسلامی" کی اتباع کرتے ہوئے انسانی معاشرے یا تمام کائنات کے لیے پیغمبرؐ یا امامؑ کے وجود کو اسی طرح ضروری سمجھتے ہیں جس طرح انسانی جسم کے لیے "دل" کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

ہمیں علم ہے کہ جس وقت دل دھڑکتا ہے تو خون کو تمام رگوں میں روانہ کرتا ہے جس کے نتیجہ میں بدن کے تمام سیلز (cells) کو غذا حاصل ہوتی ہے۔

اسی طرح امام معصومؑ بھی ایک انسانِ کامل اور انسانی قافلے کے "راہنما" کی حیثیت سے فیضِ الٰہی کے نزول کا سبب بنتا ہے اور لوگ پیغمبرؐ یا امامؑ سے اپنے اپنے

ارتباط کے مطابق کسب فیض کرتے ہیں۔

لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح انسان کے لیے "دل" کا ہونا ضروری ہے اسی طرح جہانِ انسانیت کے لیے امامؑ کا ہونا ضروری ہے تاکہ انسانیت اس کے واسطے اور وسیلے سے فیوض و برکات الٰہیہ کو حاصل کر سکے۔

ایک بات یاد رہے اور وہ یہ کہ پیغمبرؐ یا امامؑ کے پاس جو کچھ بھی ہوتا ہے اور جو کچھ بھی وہ کہتے ہیں وہ صرف اور صرف خدا کی طرف سے ہوتا ہے لیکن جس طرح "دل" بدن کے لیے فیضِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے بالکل اسی طرح پیغمبرؐ اور امامؑ بھی تمام انسانوں کے لیے فیضِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ اور واسطہ ہوتے ہیں۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ لوگوں کے روحانی تکامل میں امام کا کیا کردار ہے؟

۲ محافظ شریعت کی حیثیت سے امام کا کیا کردار ہے؟

۳ معاشرہ کے نظام اور حکومت میں قیادت کے حوالے سے امام کا کیا کردار ہے؟

۴ اتمام حجت سے کیا مراد ہے؟ اور اس مسئلہ میں امام کا کردار واضح کریں؟

۵ امام فیضِ الٰہی کے حصول کے لیے واسطہ ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ اور اس نقطۂ نظر سے پیغمبرؐ اور امام کے لیے جو بہترین تشبیہ بیان کی جاسکتی ہے کون سی ہے؟

maablib.org

تیسرا سبق

# امام کے لیے ضروری شرائط و خصوصیات

اس بحث میں سب سے پہلے ایک بات کی طرف توجہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید ہمیں بخوبی آگاہ کرتا ہے کہ "مقام امامت" ایک ایسا اعلیٰ اور عظیم الشان مقام ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ اسی مقام تک پہنچ سکتا ہے، بلکہ یہ مقام نبوت اور رسالت سے بھی بڑھ کر ہے جیسا کہ بت شکن پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وَ اِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّہُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ ○ (سورۂ بقرہ: آیت ۱۲۴)

"اور (وہ وقت یاد رکھو) جب ابراہیمؑ کو ان کے رب نے چند کلمات سے آزمایا اور انھوں نے ان کو پورا کر دکھایا۔ ارشاد ہوا: میں تمھیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ انھوں نے کہا: اور میری اولاد سے بھی؟ ارشاد ہوا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا (اور امامت کے عظیم مقام پر شرک و گناہوں سے آلودہ شخص فائز نہیں ہو سکے گا)"۔

اس طرح سے حضرت ابراہیمؑ نبوت و رسالت اور خدا کے مختلف امتحانات میں کامیابی کے مراحل طے کرنے کے بعد انسانوں کی ظاہری و باطنی اور مادی و

روحانی رہبری کے جلیل القدر اور بلند مقام (یعنی امامت) تک پہنچے۔

پیغمبر اسلام بھی نبوت و رسالت کے علاوہ امامت اور مخلوق کی رہبری کے عظیم الشان منصب پر فائز تھے، بعض دوسرے انبیاءؑ بھی منصب امامت پر فائز تھے۔ یہ بات ایک طرف رہے۔

دوسری طرف ہم اس بات سے بھی آگاہ ہیں کہ کسی بھی عہدہ پر فائز ہونے کے لیے فرائض و ذمہ داریوں کے تناسب سے انسان کے لیے ضروری شرائط و خصوصیات کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اس منصب کے فرائض کو انجام دے سکے، یعنی جتنا زیادہ بلند منصب اور جتنی بڑی ذمہ داریاں ہوں گی اسی تناسب سے ضروری شرائط وصفات بھی زیادہ سنگین ہوتی چلی جائیں گی۔

مثلاً شریعت مقدس اسلام میں کسی شخص کے قاضی بننے، بلکہ گواہ بننے کے لیے اور اسی طرح امام جماعت بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ شخص عادل ہو، پس جب دین و مکتب میں گواہی دینے کے لیے یا نماز جماعت میں امامت کے فریضہ کو انجام دینے کے لیے "عدالت" کا ہونا ضروری ہے، وہاں یقینی طور پر امامت جیسے عظیم الشان منصب تک پہنچنے کے لیے انتہائی سخت شرائط ضروری ہوں گی۔

مذکورہ تمہید کی روشنی میں امام کے لیے مندرجہ ذیل شرائط کا ہونا ضروری ہے:

## خطاؤں اور گناہوں سے معصوم ہو

پیغمبر اسلام کی طرح امام کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ معصوم ہو، یعنی گناہوں اور غلطیوں سے محفوظ ہو ورنہ وہ انسانوں کے لیے رہبر، مثالی نمونہ اور آئیڈیل نہیں بن سکتا بلکہ معاشرے کے لیے ایک قابل اعتبار شخص بھی نہیں ہو سکتا۔

امام کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ تمام انسانوں کے دل مسخر کر لے اور اس کا حکم سب کے لیے بغیر کسی پس و پیش کے قابل قبول ہو، لیکن اگر کوئی شخص گناہوں سے

آلودہ ہو تو اس کے لیے ہرگز ممکن نہیں ہوگا کہ وہ ایسی مقبولیت حاصل کر سکے اور اسے ہر لحاظ سے قابل اعتماد و اطمینان قرار دیا جا سکے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے ذاتی روزمرہ کاموں میں غلطیوں اور گناہوں کا ارتکاب کرتا ہو تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ معاشرے کے اُمور میں اس کے افکار و نظریات پر بھروسہ کرتے ہوئے بغیر کسی پس و پیش کے ان پر عمل کیا جائے؟

بلاشک وشبہ پیغمبرؐ کے لیے معصوم ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح مذکورہ دلیل کی روشنی میں امامؑ کے لیے بھی ''معصوم'' ہونے کی شرط ضروری ہے۔

اس بات کو ہم اس طریقے سے بھی ثابت کر سکتے ہیں کہ پیغمبرؐ و امام کے اصلی وجود کا انحصار ''قاعدہ لطف'' پر ہے اور قاعدہ لطف اس صفت (عصمت) کو واجب و ضروری قرار دیتا ہے کیونکہ پیغمبرؐ و امامؑ کے وجود مقدس کے مقاصد کی تکمیل مقام عصمت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ نیز گذشتہ سبق میں جو فلسفہ ہم نے بیان کیا ہے وہ بھی (اس صفتِ عصمت کے بغیر) ناقص و نامکمل رہ جائے گی۔

## مجسم علم ہونا

پیغمبرؐ اسلام کی طرح امام بھی تمام انسانوں کے ہر قسم کے علمی مسائل کے لیے مرجع و پناہ گاہ ہوتا ہے۔ اسے تمام اُصول و فروعِ دین، قرآن کریم کے ظاہری و باطنی علم اور سنتِ پیغمبرؐ نیز اسلام سے مربوط تمام مسائل سے مکمل طور پر آگاہ ہونا چاہیے کیونکہ وہ نہ صرف شریعت کا محافظ و نگہبان ہے بلکہ انسانوں کا رہبر اور پیشوا بھی ہے۔

ایسے اشخاص جو پیچیدہ مسائل کے پیش آنے پر پریشان ہو جائیں اور دوسروں کی طرف دستِ سوال دراز کریں اور ان کا علم و شعور اسلامی معاشرے کو پیش آنے والے مسائل کا حل پیش کرنے سے قاصر ہو وہ ہرگز منصبِ امامت اور دنیا کی رہبری کے عہدہ پر فائز نہیں ہو سکتے۔

مختصر یہ کہ امام کے لیے ضروری ہے کہ احکام الٰہی کا لوگوں میں سب سے زیادہ آگاہ اور دانا ہو تا کہ پیغمبرؐ کی رحلت سے پیدا ہونے والے (علمی) خلا کو فوراً (بلا فاصلہ) پُر کر سکے اور اسلام کی صحیح راہ کو (جو ہر طرح کے انحرافات سے پاک ہو) ثبات و دوام دے سکے۔

## شجاعت

امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کا شجاع ترین انسان ہو کیونکہ شجاعت کے بغیر (صحیح) رہبری ممکن نہیں ہے۔ یہ شجاعت انتہائی سخت و ناگوار حالات سے مقابلے کے لیے اور طاقتور، سرکش اور ظالم سے مقابلے کے لیے، اندرونی و بیرونی دشمنوں سے مقابلے کے لیے ضروری ہے۔

## پرہیزگاری اور تقویٰ الٰہی

ہم جانتے ہیں کہ وہ لوگ جو دنیا کی ظاہری شان و شوکت اور زیبائی میں گرفتار ہوتے ہیں جلد دھوکے کا شکار ہو جاتے ہیں اور حق و عدالت کی راہ سے ان کے منحرف ہونے کا امکان بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ دنیا کی ظاہری شان و شوکت میں گرفتار یہ لوگ کبھی تو طمع اور لالچ کے ذریعے اور کبھی دھمکی کے ذریعے اپنی اصل راہ (راہ مستقیم) سے منحرف ہو جاتے ہیں۔

امام کے لیے ضروری ہے کہ اس دنیا کی آسائشوں اور نعمتوں کے مقابلہ میں "اسیر" بننے کی بجائے "امیر" (مستغنی) اور "فرمانروا" ہو۔

امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مادی دنیا کی ہر قید و بند سے، نفسانی خواہشات سے، مقام و درجہ، مال و دولت اور لالچ کی قیود سے آزاد و بے نیاز ہو، تا کہ اسے نہ تو فریب دیا جا سکے، نہ مغلوب کیا جا سکے اور نہ ہی اسے سازش کے

ذریعے شکست دی جاسکے۔

## اخلاقی جاذبیت

قرآن مجید میں پیغمبر اسلام کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (سورۂ آل عمران: آیت ۱۵۹)

"(اے رسولؐ) یہ مہر (ومحبت) الٰہی ہے کہ آپؐ ان کے لیے نرم مزاج واقع ہوئے اور اگر آپؐ تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ لوگ آپؐ کے پاس سے منتشر ہو جاتے"۔

پیغمبر اسلام کی طرح امام، بلکہ ملت کے ہر پیشوا کے لیے پُرکشش اخلاق حسنہ کا حامل ہونا ضروری ہے تاکہ وہ مقناطیس کی طرح لوگوں کو اپنی طرف کھینچ سکے۔

بلاشک وشبہ ہر قسم کی سختی و بداخلاقی جو کہ انسانوں کو بیزار اور منتشر کرنے کا باعث ہو، پیغمبرؐ و امامؑ کے لیے بہت بڑے عیب ہیں اور ان کا ان عیوب سے پاک ہونا ضروری ہے۔

یہ وہ اہم شرائط ہیں کہ جنھیں علمائے اسلام نے "امام" کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ ان پانچ شرائط کے علاوہ امام کے لیے دیگر خصوصیات وشرائط بھی ہیں لیکن ان میں سے اہم یہی تھیں جو بیان کردی گئی ہیں۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

1. دلیل سے ثابت کریں کہ منصبِ امامت انسان کے لیے ایک اعلیٰ ترین منصب ہے؟
2. کیا پیغمبرؐ اسلام اور تمام اُولوالعزم انبیاءؑ بھی منصبِ امامت کے حامل تھے؟
3. اگر امام "معصوم" نہ ہو تو کون سی مشکلات پیش آسکتی ہیں؟
4. امام کے لیے بھرپور علم کا حامل ہونا کیوں ضروری ہے؟
5. دلیل سے ثابت کریں کہ امام کو سب سے بڑا شجاع، زاہد، نفیس و باوقار اور اخلاقی نقطۂ نظر سے سب انسانوں کے لیے جاذب و پُرکشش ہونا چاہیے؟

چوتھا سبق

# امام کا انتخاب کس کی ذمہ داری ہے؟

مسلمانوں کے ایک گروہ (اہلِ سنت) کا یہ عقیدہ ہے کہ پیغمبرؐ اسلام نے جب دنیا سے رحلت فرمائی تو کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا تھا۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے جانشین کا انتخاب لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہے اور یہ کام مسلمانوں کے اجماع کے ذریعے (جو کہ شرعی دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے) سے انجام پاتا ہے۔

اہلِ سنت کا کہنا ہے کہ رحلتِ پیغمبرؐ کے بعد یہ کام انجام پایا اور پہلے خلیفہ، اُمت کے اجماع سے ہی خلافت کے عہدہ پر منتخب ہوئے تھے۔ جبکہ دوسرے خلیفہ کا انتخاب اجماع اُمت کے بجائے پہلے خلیفہ نے ذاتی طور پر خود کروایا۔

جبکہ دوسرے خلیفہ نے اپنے جانشین کے انتخاب کے لیے چھے افراد پر مشتمل ایک شوریٰ (کمیٹی) تشکیل دی اور اس شوریٰ کے ممبران حضرت علیؑ، حضرت عثمان، عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ، زبیر اور سعد ابن ابی وقاص کو قرار دیا۔

اسی شوریٰ نے تین افراد کی اکثریت سے یعنی سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمٰن بن عوف اور طلحہ نے حضرت عثمان کے لیے اپنی رائے دی (جبکہ دوسرے خلیفہ نے یہ صراحت کردی تھی کہ اگر تین آدمی ایک طرف اور تین آدمی دوسری طرف رائے دیں تو جس طرف عبدالرحمٰن بن عوف (عثمان کے داماد) رائے دیں گے اسی رائے کو تسلیم کیا جائے گا۔

حضرت عثمان کی خلافت کے آخری دور میں مختلف وجوہات کی بنا پر مسلمانوں

نے ان کے خلاف بغاوت کی اور اس سے قبل کہ وہ اپنے جانشین کا انتخاب کرتے یا اس کا تقرر کسی شوریٰ کے ذریعے کرواتے ان کو قتل کر دیا گیا۔

اس وقت تمام مسلمان حضرت علیؑ کی طرف بڑھے اور پیغمبرؐ اسلام کے جانشین کے طور پر ان کی بیعت کی، سوائے شام کے گورنر معاویہ کے جس نے حضرت علیؑ کی بیعت سے انکار کر دیا اور ان کے خلاف بغاوت کا علَم بلند کر دیا کیونکہ اسے یقین تھا کہ حضرت علیؑ اسے موجودہ عہدے پر باقی نہیں رکھیں گے۔

معاویہ کے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے خلاف بغاوت کا علَم بلند کرنے سے تاریخ اسلام میں ناگوار اور مرگ آفرین حادثات کا دور شروع ہوا جس کے نتیجے میں بے گناہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کا خون بہہ گیا۔

یہاں پر علمی اور تاریخی بحثوں کو واضح کرنے کے لیے بہت سے سوالات اُبھرتے ہیں جن میں سے چند اہم سوالات یہاں ذکر کرتے ہیں:

## کیا اُمت کو پیغمبرؐ کا جانشین مقرر کرنے کا حق حاصل ہے؟

اس سوال کا جواب بالکل آسان ہے۔ اگر امامت سے مراد مسلمانوں کی ظاہری حکومت ہے تو ایسے حاکم کا انتخاب عوام کی رائے سے کرنا زمانے کے مروجہ دستور کے عین مطابق ہے۔

لیکن اگر امامت کو ہم اس معنی میں لیں کہ جس کی وضاحت ہم پہلے قرآنِ مجید کی آیات کی روشنی میں کر چکے ہیں تو ہمیں معلوم ہے کہ بلا شک وشبہ ایسے امام اور خلیفہ کو خدا یا اس کے رسولؐ (رسول بھی الہام الٰہی کے بعد) کے علاوہ کوئی بھی شخص معین نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں کہ امامت کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ امام کو اسلام کے تمام اُصول اور فروع کا مکمل علم ہونا چاہیے۔ ایسا علم کہ جس کا سرچشمہ علمِ الٰہی اور علمِ پیغمبرؐ ہو، تاکہ وہ شریعتِ اسلام کی مکمل حفاظت کر سکے۔

امام کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ ''معصوم'' ہو، یعنی ہر طرح کے گناہوں اور خطاؤں سے اس کی خدا کی طرف سے حفاظت ہو، تاکہ وہ امامت کے منصب اور اُمت کی روحانی و مادی اور ظاہری و باطنی رہبری کے عہدے پر فائز ہو سکے اور اسی طرح امام کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں زہد و تقویٰ اور پرہیزگاری و بزرگی کی خصوصیات بھی بدرجۂ اتم موجود ہوں جو کہ اس عہدہ کے لیے نہایت ضروری ہیں۔

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ان شرائط کی موجودگی کی تشخیص خدا اور پیغمبرؐ کے علاوہ کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ وہی (خدا ہی) ہے جو یہ جانتا ہے کہ کس شخص کی روح عصمت کے درجہ پر فائز ہے اور وہی ہے جو یہ جانتا ہے کہ کس شخص میں امامت کے مقام کی اہلیت کے لیے ضروری علم و فضل، زہد و تقویٰ اور شجاعت و بزرگی موجود ہے۔

جن لوگوں نے امام اور خلیفۂ پیغمبرؐ کے تقرر کو لوگوں کے سپرد کیا ہے درحقیقت انھوں نے امامت کے صحیح قرآنی مفہوم کو سمجھنے کے بجائے اسے تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کے خیال میں ''امامت'' معمول کے مطابق حکمرانی اور دنیاوی اُمور میں لوگوں کی رہبری کے لیے نظام تک محدود ہے وگرنہ امامت کے لیے کسی شخص میں ضروری شرائط کی مکمل اور جامع تشخیص صرف خدا کے ذریعے سے ہی ممکن ہے اور صرف وہی ذات ہے جو ان صفات سے باخبر ہے۔

یہ (امامت کے لیے کسی کا انتخاب) بالکل اسی طرح ہے جیسے پیغمبرؐ کا انتخاب لوگوں کی رائے سے نہیں کیا جاسکتا بلکہ ضروری ہے کہ پیغمبرؐ کا انتخاب خداوند عالم کی طرف سے ہو اور معجزات کے ذریعے سے اس کی پہچان کروائی جائے۔ اسی طرح پیغمبرؐ میں پائی جانے والی ضروری صفات کی تشخیص بھی صرف خدا ہی کر سکتا ہے۔

## کیا پیغمبرؐ نے اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا؟

بلا شک وتردید "شریعتِ اسلامی" عالمی اور ہمیشہ باقی رہنے والا قانون ہے اور قرآن مجید کی متعدد آیات صراحت سے اس بات کو بیان کرتی ہیں کہ یہ قانون کسی خاص زمانے یا کسی معین جگہ کے لیے ہرگز نہیں ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ پیغمبرؐ اسلام کی وفات کے زمانہ تک یہ الٰہی آسمانی قانون جزیرۂ عرب سے باہر نہیں پہنچا تھا۔

دوسری طرف پیغمبرؐ اسلام کی "اعلانِ نبوت کے بعد کی" زندگیٔ مبارک کے تیرہ برس مکہ میں شرک و بت پرستی سے مقابلہ کرنے میں گزر گئے جب کہ مدنی زندگی کے دس برس کہ جن کا آغاز ہجرت کے وقت سے ہوا، اور جو اسلام کے پھلنے پھولنے کا زمانہ تھا وہ بھی زیادہ تر دشمنانِ اسلام کی طرف سے مسلط کردہ جنگوں اور غزوات کی نذر ہو گئے۔

اگرچہ پیغمبرؐ اسلام اپنے شب و روز اسلامی مسائل کی تبلیغ و تعلیم میں خرچ کرتے تھے اور اسلام کے تمام شعبوں کی ترویج میں مصروف رہتے تھے لیکن اس کے باوجود اسلام کے بیش تر مسائل کی مکمل تشریح کے لیے زیادہ وقت کی ضرورت تھی لہٰذا ضروری تھا کہ پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد انھی جیسا کوئی شخص اس اہم ذمہ داری کا بوجھ اُٹھائے۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر کسی مکتب کے لیے آیندہ پیش آنے والے حالات کی پیش گوئی اور اس کی پائیداری اور اسے ہمیشہ باقی رکھنے کے لیے تمام وسائل کی فراہمی ایسے اہم ترین مسائل ہیں کہ جن کے بارے میں ہمیشہ ایک رہبر فکرمند رہتا ہے اور کبھی اس بات کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ اس اہم اور بنیادی مسئلہ کو فراموش کر دے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ پیغمبرِ اسلام نے جب زندگی کے معمولی مسائل کے لیے احکامات دیے تھے تو کیا مسلمانوں کے اس (اہم ترین) مسئلۂ خلافت، رہبری اور امامت کے لیے کسی منصوبہ بندی کی ضرورت نہ تھی؟!

ان تینوں وجوہات کا مجموعہ اس بات پر روشن دلیل ہے کہ پیغمبرِ اسلام نے یقیناً اپنے جانشین کو مقرر و معین فرمایا تھا۔ اگر توفیقِ الٰہی شاملِ حال رہی تو اس سلسلے میں اسلام کی ان مسلم روایات کا ذکر کریں گے جو اس منطقی حقیقت کو زیادہ روشن کرسکیں گے کہ پیغمبرِ اسلام اپنی زندگی میں ہی اس اہم مسئلے سے ہرگز غافل نہیں رہے۔ اگرچہ آپؐ کی رحلت کے بعد بعض مخصوص سیاسی تحریکوں نے اس بات کی انتہائی کوشش کی کہ لوگوں کے اذہان میں یہ بات راسخ کردیں کہ پیغمبرؐ نے اپنا جانشین مقرر نہیں کیا تھا۔

کیا اس بات پر یقین کیا جاسکتا ہے کہ "رسولؐ خدا مدینہ سے چند روز کے لیے جب غزوات (مثلاً غزوۂ تبوک) کے لیے باہر تشریف لے جاتے تھے تو مدینہ کو خالی چھوڑنے کے بجائے (کسی نہ کسی کو) اپنا جانشین مقرر فرما کر جاتے تھے"۔ لیکن اسی رسولؐ خدا نے اپنی رحلت کے بعد والے (طویل) زمانے کے لیے کسی کو بھی اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا۔ اور نہ صرف اُمت کو اختلافات اور پریشانیوں کے ایک انبوہ میں یونہی چھوڑ دیا بلکہ اسلام کی بقا کے لیے ہدایت کا بھی کوئی مکمل انتظام نہیں کیا؟!

بلاشک و شبہ اگر رسولؐ اپنے جانشین کو معین نہ فرماتے تو اپنے قدموں پر تازہ کھڑے ہونے والے اسلام کے لیے شدید خطرات لاحق تھے، اور عقل و منطق کی رُو سے کسی ایسے فعل کا (کہ جس سے اسلام کو خطرات لاحق ہوں) پیغمبرِ اسلام سے سرزد ہونا ناممکن ہے۔

وہ لوگ جو اس بات کے مدعی ہیں کہ یہ کام اُمت کے سپرد کردیا گیا ہے کہ

کم از کم کوئی ایک دلیل تو ایسی پیش کریں کہ پیغمبرؐ اسلام نے اس بات کی صراحت کردی ہو کہ یہ اُمت کا کام ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ جسے وہ پیش کرسکیں۔

## اجماع اور شوریٰ

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ "پیغمبرؐ اسلام نے اس اہم ترین مسئلہ (مسئلہ جانشینی جو کہ درحقیقت اسلام کی حیات کا مسئلہ ہے) پر کوئی توجہ نہ کی اور جانشین کے انتخاب کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں کے کندھوں پر تھی"۔ تو ہمیں اس بات کا بھی بخوبی علم ہے کہ "اجماع" سے مراد تمام مسلمانوں کا اتفاق رائے ہے لیکن خلیفہ اوّل کی خلافت کے سلسلے میں اس طرح کا اتفاق رائے بالکل حاصل نہیں ہوا (مدینہ میں موجود صحابہ کے ایک گروہ نے اس بات کا فیصلہ کیا جبکہ تمام اسلامی شہروں کے لوگوں نے اس فیصلے میں بالکل شرکت نہیں کی بلکہ مدینہ میں موجود حضرت علیؑ (وجلیل القدر صحابہ) اور بنی ہاشم کے بہت بڑے گروہ نے اس انتخاب میں سرے سے شرکت ہی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا "اجماع" قطعاً قابل قبول ہی نہیں ہوسکتا۔

اور اس کے علاوہ اگر انتخاب کا یہ طریقہ صحیح تھا تو پھر خلیفہ اوّل نے اپنے جانشین کے تقرر کے لیے اس طریقے پر عمل کیوں نہیں کیا؟ اور ذاتی طور پر اپنے جانشین کو نامزد کیوں کیا؟ اگر ایک شخص کی طرف سے جانشین کو معین کرنا صحیح اور کافی ہوتا تو پیغمبرؐ جو کہ سب سے افضل تھے، اس کام کو انجام دے سکتے تھے۔ اگر خلیفہ اوّل کی ذاتی رائے سے دوسرے خلیفہ کی بیعت لوگوں کی مشکلات دُور کرسکتی ہے تو یہ مسئلہ پیغمبرؐ اسلام کے حوالے سے سب سے بہتر حل ہوسکتا ہے۔

ان باتوں کے علاوہ تیسری مشکل خلیفہ سوم کے سلسلہ میں پیش آئی اور وہ یہ کہ خلیفہ دوم نے نہ صرف اس طریقہ انتخاب کو پس پشت ڈال دیا جو خلیفہ اوّل

کے تقرر کے وقت اختیار کیا گیا تھا بلکہ اس سنت کو بھی توڑ دیا جس کے ذریعہ خود مسند خلافت سنبھالی، یعنی خلیفہ دوم نے نہ تو ''اجماع'' پر عمل کیا اور نہ ہی شخصی اور ذاتی نامزدگی کے طریقہ پر عمل کیا بلکہ اس کام کے لیے (ایک محدود) شوریٰ کو نامزد کر دیا۔

اُصولی طور پر اگر شوریٰ صحیح ہے تو یہ صرف چھے افراد تک محدود کیوں تھی؟ اور چھے افراد میں سے صرف تین افراد کی رائے ہی کیوں کافی تھی؟

یہ وہ سوالات ہیں جو تاریخ اسلام میں ہر محقق کو پیش آتے ہیں اور ان سوالات کا بے جواب ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ رہبر کے مقرر کیے جانے کے یہ طریقے درست نہیں تھے۔

## علی علیہ السلام سب سے افضل تھے

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ پیغمبرؐ اسلام نے کسی بھی شخص کا اپنے جانشین کے طور پر تعارف نہیں کرایا تھا اور یہ بھی فرض کریں کہ اس اہم کام کی ذمہ داری لوگوں پر تھی تو کیا یہ صحیح اور عدل کے مطابق ہے کہ جانشین کے انتخاب کے وقت ایک ایسے شخص کو جو علم و تقویٰ اور دیگر امتیازات کی بنا پر سب سے بہتر و برتر ہو، اسے نظر انداز کر دیا جائے اور ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے جو ان سے کم تر ہو؟

تاریخ اسلام کے سب سے بڑے اہلِ علم حضرات کہ جن میں اہلِ سنت کے علما بھی شامل ہیں، سب نے بڑے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام اسلامی مسائل کے سب سے بڑے عالم تھے۔ حضرت علی علیہ السلام سے مروی روایات اور ان کے آثار اس حقیقت کے تابندہ ثبوت ہیں۔ تاریخ اسلام اس بات کی گواہ ہے کہ تمام علمی مشکلات میں آپ اُمت کے لیے ایک پناہ گاہ کی حیثیت رکھتے تھے یہاں تک کہ اگر لوگ دیگر خلفاء سے مشکل اور پیچیدہ سوالات کرتے تھے تو خلفاء ان کے

جواب کے لیے حضرت علی علیہ السلام کی طرف رجوع کرتے، شجاعت اور بزرگی، زہد و تقویٰ اور دیگر صفات حسنہ میں آپ لوگوں سے افضل تھے لہٰذا اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ امامت یا خلیفہ (جانشین پیغمبرؐ) کے منصب کا انتخاب عوام کو کرنا چاہیے تو حضرت علیؑ سب سے زیادہ اس منصب کے لائق اور شائستہ تھے (ان ابحاث کو ثابت کرنے کے لیے کافی اسناد موجود ہیں جن کا ذکر اختصار کے ساتھ پیش نظر یہاں پر ممکن نہیں ہے)۔

maablib.org

## سوچیے اور جواب دیجیے

1. امام و خلیفہ پیغمبرؐ کا انتخاب عوام کیوں نہیں کر سکتے؟
2. پیغمبرؐ نے اپنے لیے جانشین مقرر کیا تھا یا نہیں؟ عقل و منطق کی رائے کیا ہے؟
3. پہلے تین خلفاء کے انتخاب کا طریقہ کیا تھا؟
4. کیا پہلے تینوں خلفاء کے انتخاب کا طریقہ علمی و اسلامی اُصولوں کے مطابق تھا؟
5. جن دلائل کی بنیاد پر حضرت علی علیہ السلام خلافت کے لیے سب سے زیادہ استحقاق رکھتے تھے ان کو ذکر کریں۔

## پانچواں سبق

# قرآن اور امامت

عظیم آسمانی کتاب ''قرآنِ مجید'' تمام چیزوں کی طرح مسئلہ امامت میں بھی بہترین راہنما ہے۔ قرآنِ مجید نے مسئلہ امامت کا مختلف ابعاد اور پہلوؤں سے تجزیہ کیا ہے۔

### قرآن بتاتا ہے کہ ''امامت'' خدا کی طرف سے ہے

جیسا کہ ہم گذشتہ ابحاث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بت شکن کی داستان میں پڑھ چکے ہیں کہ قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے عہدۂ امامت کو ان کے نبوت ورسالت کے درجے پر فائز ہونے اور بہت سے عظیم امتحانات میں کامیابی کے بعد کا درجہ قرار دیا ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَ اِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (سورۂ بقرہ: آیت ۱۲۴)

''اور (وہ وقت یاد رکھو) جب ابراہیم کو ان کے رب نے چند کلمات سے آزمایا اور انھوں نے ان کو پورا کر دکھایا۔ ارشاد ہوا: میں تمھیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں''۔

مختلف قرآنی آیات اور تاریخی دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ ''حضرت ابراہیم مقام امامت پر بابل کے بت پرستوں کا مقابلہ کرنے، شام کی طرف ہجرت کرنے،

خانہ کعبہ کی تعمیر اور اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان گاہ میں لے جانے کے بعد پہنچے تھے"۔

جب نبوت اور رسالت جیسے مقام کے لیے ضروری ہے کہ اس کا انتخاب خدا کی طرف سے ہو تو مقام امامت اور کائنات کی رہبری "جو کہ رہبری کی معراج ہے" کے لیے بطریق اولیٰ ضروری ہے کہ اس کا انتخاب بھی خدا کی طرف سے ہو کیونکہ یہ کوئی ایسا عہدہ نہیں ہے کہ جس کا انتخاب لوگوں کے ذریعے سے ممکن ہو۔

علاوہ برایں اس منصب (امامت) کے لیے خود قرآنِ مجید فرما رہا ہے:

اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (سورۂ بقرہ: آیت ۱۲۴)

"میں تمھیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں"۔

اسی طرح سورۂ انبیاءؑ کی آیت نمبر ۷۳ میں قرآنِ مجید بعض عظیم پیغمبر حضرات ابراہیمؑ، لوطؑ، اسحاقؑ، یعقوب علیہم السلام کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا۔۔۔

"اور ہم نے انھیں پیشوا بنایا جو ہمارے حکم کے مطابق رہنمائی کرتے تھے"۔

اس سے مشابہ تعبیر بعض دوسری قرآنی آیات میں بھی دیکھنے میں آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس الٰہی منصب کا تقرر خدا کی جانب سے ہونا ضروری ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور اہم بات جو ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت سے مربوط آیت کے آخری حصے میں پڑھتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے اپنے بیٹوں اور اپنی آیندہ نسل کے لیے منصب کی درخواست کی تو خدا نے ان کو جواب میں فرمایا:

لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ○ (سورۂ بقرہ: آیت ۱۲۴)

"میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا"۔

یہ جواب اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اے ابراہیمؑ! آپ کی دعا قبول ہوئی لیکن آپؑ کے بیٹوں میں سے جس نے ظلم کیا وہ ہرگز اس برتر و اعلیٰ منصب (امامت) پر فائز نہیں ہو سکے گا۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ "ظالم" لغوی اور قرآنی منطق کے اعتبار سے بہت سے وسیع معانی رکھتا ہے جس میں تمام گناہ چاہے وہ شرک ظاہری ہو یا شرک باطنی، اپنے اُوپر ظلم ہو یا دوسروں پر ظلم شامل ہیں اور ان چیزوں کا مکمل علم خدا کے علاوہ کسی کے لیے ممکن نہیں ہے کیونکہ صرف خدا ہی وہ ذات ہے جو لوگوں کی نیتوں اور ان کے باطن سے باخبر ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ منصب امامت کا تقرر صرف خدا کے ہاتھوں میں ہے۔

## آیت بلّغ کیوں نازل ہوئی؟

سورۂ مائدہ کی آیت ۶۷ میں ارشاد خداوندی ہوتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَ اللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ○

"اے رسولؐ! جو کچھ آپؐ کے پروردگار کی طرف سے آپؐ پر نازل کیا گیا ہے اسے پہنچا دیجیے اور اگر آپؐ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپؐ نے اللہ کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے محفوظ رکھے گا۔ بے شک اللہ کافروں کی رہنمائی نہیں کرتا"۔

اس آیت کے انداز تخاطب سے واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کے دوش مبارک

پر یہ ایک سنگین ذمہ داری تھی اور آپؐ ہر طرف سے پریشانی میں گھرے ہوئے تھے۔ یہ پیغام ایسا تھا کہ جس کی وجہ سے ممکن تھا آپ کو عوام کے بعض گروہوں کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑے۔ یہی وجہ تھی کہ آیتِ مجیدہ میں نا صرف آپؐ کو اس خاص حکم کے پہنچانے کی تاکید کی گئی بلکہ ممکنہ خطرات اور پریشانیوں کے مقابلہ میں بھی اطمینان دلایا گیا۔

یہ بات مسلمہ طور پر قبول شدہ ہے کہ اس اہم مسئلہ کا توحید و شرک یا یہود و منافقین جیسے دشمنوں کے خلاف جہاد سے کوئی ربط نہ تھا کیونکہ سورۂ مائدہ کے نزول کے وقت تک یہ مسائل مکمل طور پر حل ہو چکے تھے۔

اس کے علاوہ اسلام کے عام اور معمولی احکامات کی تبلیغ کے سلسلہ میں بھی کوئی زحمت یا پریشانی باقی نہیں تھی۔ جبکہ آیت میں ایسا حکم تھا کہ جو رسالت کے ہم وزن اور ہم پلہ تھا کہ اگر یہ حکم نہ پہنچایا جاتا تو گویا رسالت کا حق ہی ادا نہ کیا جاتا۔

کیا رسالت کا ہم پلہ مسئلہ پیغمبر ﷺ کے جانشین اور خلیفہ کے مسئلے کے علاوہ کوئی اور مسئلہ ہو سکتا ہے؟ (قطعاً نہیں)۔ بالخصوص جب کہ یہ آیت پیغمبرؐ کی آخری عمر میں نازل ہوئی تھی۔ لہٰذا جانشینی اور خلافت کے مسئلے سے بھی مناسبت رکھتی تھی کہ جس کی وجہ سے پیغمبر اکرم ﷺ کی نبوت اور رسالت کو دوام حاصل ہونا تھا۔

اس کے علاوہ زید بن ارقم، ابو سعید خدری، ابن عباس، جابر بن عبداللہ انصاری، ابو ہریرہ، حذیفہ، ابن مسعود جیسے صحابہ حضرات سے بھی متعدد روایات نقل ہوئی ہیں اور بعض روایات تو ہم تک گیارہ واسطوں سے پہنچی ہیں۔ صحابہ کے علاوہ بہت سے اہلِ سنت علماء کہ جن میں مفسرین، محدثین اور مورخین شامل ہیں انھوں نے نقل کیا ہے کہ مذکورہ آیت حضرت علی علیہ السلام اور غدیر کے تاریخی واقعہ کے بارے میں نازل

ہوئی ہے۔ ①

ان شاء اللہ ہم بعد میں "روایات اور سنت" کے زیر عنوان داستانِ غدیر کے بارے میں بھی گفتگو کریں گے۔ لیکن اس موقع پر یہ یاددہانی ضروری ہے کہ یہ آیت اس بات کی روشن دلیل ہے کہ پیغمبر گرامیؐ کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنی عمر کے آخری حج اور آخری دور میں حضرت علی علیہ السلام کو باقاعدہ طور پر جانشین منسوب کریں اور تمام مسلمانوں کو ان کا تعارف کروائیں (اور آپؐ نے ایسا ہی کیا)۔

## "اُولی الامر کی اطاعت" کے حکم والی آیت

سورۂ نساء کی آیت ۵۹ میں ارشاد ہو رہا ہے:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ.....

"اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ اور تم میں سے جو صاحبانِ امر ہیں ان کی اطاعت کرو"......

آیتِ مجیدہ میں "اُولی الامر کی اطاعت کا حکم" بغیر کسی شرط اور قید کے خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے ہمراہ ہے۔

## اُولی الامر سے مراد

کیا یہاں پر "اُولی الامر" سے مراد ہر زمانے اور ہر ماحول کے فرماں روا اور حاکم ہیں؟ مثلاً کیا ہمارے زمانے میں ہر ملک کے مسلمانوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے فرماں رواؤں اور حکام کے بغیر کسی شرط و قید کے اطاعت گزار ہو جائیں؟

---

① مزید معلومات کے لیے درج ذیل کتب کا مطالعہ کریں: ① احقاق الحق ② الغدیر ③ المراجعات ④ دلائل الصدق۔

(جیسا کہ بہت سے اہلِ سنت مفسرین نے بیان کیا ہے)۔

(یہ بات عقلی و منطقی اعتبار سے قطعاً قابل قبول نہیں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ مختلف اَدوار اور زمانے میں حکمرانوں کی اکثریت منحرف، گناہ گار اور ظالم تھی اور ہے)۔

کیا اس سے مراد یہ ہے کہ اگر حکمرانوں کا حکم احکام اسلامی کے خلاف نہ ہو تو ان کی اطاعت کی جائے؟ یہ بات بھی اس آیت کے اطلاق اور عمومیت کے خلاف ہے۔ کیا اس سے مراد مخصوص صحابہ کرام ہیں؟ یہ تفسیر بھی اس آیت کے وسیع مفہوم "جو کہ ہر دور اور ہر زمانے کے لیے ہے" کے خلاف ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر ہمارے لیے یہ بات واضح ہے کہ "اُولی الامر سے مراد وہ معصوم پیشوا ہیں کہ جن کا وجود ہر زمانے میں ہے اور جن کی پیروی کسی قید اور شرط کے بغیر ضروری و لازم ہے اور جن کا حکم تسلیم کرنا خدا اور رسولؐ کے حکم کو تسلیم کرنے کی طرح ہے۔

اس کے علاوہ اسلامی مآخذ میں موجود متعدد احادیث کہ جن میں "اُولی الامر" کی تطبیق حضرت علی علیہ السلام اور آئمہ معصومین علیہم السلام سے کی گئی ہے بھی اس حقیقت کی گواہ ہیں۔

## آیت ولایت

سورۂ مائدہ کی آیت ۵۵ میں ارشادِ خداوندی ہے:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ○

"تمہارا ولی تو صرف اللہ اور اس کا رسولؐ اور وہ اہلِ ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں"۔

عربی لغت میں کلمہ "اِنَّمَا" انحصار (کسی چیز کو کسی دوسری چیز پر منحصر کر دینا کے لیے آتا ہے۔ قرآن کلمہ "اِنَّمَا" کے ساتھ تاکید کرتے ہوئے کہہ رہا کہ مسلمانوں کے ولی اور سرپرست صرف تین ہیں: خدا، پیغمبرؐ اور وہ لوگ جو ایمان لائے، نماز قائم کی اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔

بلاشک وشبہ ولایت سے مراد مسلمانوں کی باہمی دوستی نہیں ہے کیونکہ اس کے لیے اس قید اور شرط کی ضرورت نہیں ہے۔ تمام مسلمان ایک دوسرے کے دوست اور بھائی ہیں خواہ وہ حالتِ رکوع میں زکوٰۃ نہ بھی دیتے ہوں۔

لہٰذا "ولایت" سے مراد وہی مادی اور روحانی سرپرستی و رہبری ہے، خصوصاً جبکہ اُولی الامر کی ولایت خدا اور پیغمبرؐ کی ولایت کے ہمراہ ذکر کی جارہی ہے۔

یہ نکتہ بھی واضح ہے کہ آیتِ ولایت میں جن اُوصاف کا ذکر ہوا ہے وہ ایک ایسے شخص کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس نے حالتِ رکوع میں زکوٰۃ ادا کی ہے ورنہ ضروری نہیں ہے کہ انسان نماز میں رکوع کی حالت میں زکوٰۃ ادا کرے، حقیقت میں یہ آیت اس شخص کی فضیلت کے بجائے اس کی نشاندہی کر رہی ہے۔

ان تمام قرائن اور شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا آیتِ ولایت حضرت علی علیہ السلام کی مشہور داستان کی طرف ایک بہت ہی پُرمعنی اشارہ ہے کہ جب حضرت علیؑ نماز میں مشغول تھے کہ اسی اثناء میں ایک حاجت مند نے مسجد نبویؐ میں داخل ہو کر امداد کا تقاضا کیا۔ کسی نے بھی اس کو مثبت جواب نہ دیا اسی حالت میں حضرت علیؑ نے اپنے داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے اسے اشارہ کیا وہ آپؑ کے قریب آیا اور آپؑ کے ہاتھ سے بیش قیمت انگوٹھی اُتار کر لے گیا۔

پیغمبرؐ خدا جو کہ اس واقعہ کا مشاہدہ کر رہے تھے، نے نماز کے بعد سر آسمان کی طرف بلند کر کے عرض کیا تھا: "میرے بھائی موسیٰؑ نے تجھ سے دعا کی تھی کہ تو ان

کی روح (سینے) کو کشادہ، ان کے تمام اُمور کو آسان اور ان کی زبان کی گرہ کو کھول دے اور ان کے بھائی ہارونؑ کو ان کا وزیر و مددگار بنادے۔ خداوندا! میں محمدؐ تیرا پیغمبرؐ اور برگزیدہ ہوں، میرے سینے کو وسیع کردے اور میرے اُوپر تمام اُمور کو آسان کردے۔ میرے خاندان میں سے علیؑ کو میرا وزیر بنادے تاکہ اس کے ذریعے میری کمر قوی اور مضبوط ہوجائے"۔

ابھی پیغمبرؐ خدا کی دُعا تمام نہیں ہوئی تھی کہ جبرئیلؑ آیت ولایت لے کر نازل ہوگئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اہلِ سنت کے بہت سے بڑے بڑے مفسرین، محدثین اور مؤرخین نے بھی آیت ولایت کے نزول کو حضرت علی علیہ السلام کی شان میں قرار دیا ہے اور اصحاب رسولؐ میں سے دس سے زیادہ صحابہ نے اس حدیث کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے۔

ولایت کے موضوع پر قرآن میں بہت سی آیات ذکر ہوئی ہیں مگر ہم کتاب کے اختصار کے پیش نظر صرف چار مذکورہ آیات پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ قرآن کی نظر میں امام کا انتخاب اور تعیین کس کی ذمہ داری ہے؟

۲ آیۂ بلاغ کن حالات میں نازل ہوئی؟ اور اس میں کیا حکم دیا گیا تھا؟

۳ کن شخصیات کی اطاعت بلا قید و شرط عقل کے مطابق ہے؟

۴ کیا آیت اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ.... میں رہبری و امامت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، دلیل پیش کریں؟

۵ مسئلۂ ولایت کے بارے میں تمام قرآنی آیات سے کن مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے؟

maablib.org

## چھٹا سبق

# امامت، سنتِ پیغمبرؐ کی روشنی میں

اسلامی کتب احادیث کے مطالعہ کے وقت خصوصاً اہلِ سنت بھائیوں کی احادیث کے مآخذ میں پیغمبرؐ اسلام سے احادیث کی ایک کثیر تعداد منصب امامت و خلافت کو حضرت علی علیہ السلام کے لیے ثابت کرتی ہے۔

انسان حیرت کے دریا میں ڈوب جاتا ہے کہ ان تمام احادیث کی موجودگی میں تو امامت کے حوالے سے جائے تردید و شک باقی نہیں رہ جاتی۔ کہاں یہ کہ ایک گروہ چاہے کہ اہلِ بیتؑ سے ہٹ کر دوسری راہ اختیار کرے۔

ان احادیث میں سے بعض کی سیکڑوں اسناد موجود ہیں جیسے حدیثِ غدیر اور بعض کی دسیوں اسناد ہیں اور یہ تمام احادیث اپنی اسناد سمیت دسیوں مشہور اسلامی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں۔ یہ احادیث اس قدر واضح ہیں کہ اگر ہم تمام ابحاث کو نظرانداز بھی کردیں پھر بھی یہ مسئلہ اتنا واضح و روشن ہے کہ کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

احادیث کے اس خزانے سے کچھ احادیث ہم بطور نمونہ پیش کرتے ہیں جبکہ وہ حضرات جو اس موضوع پر مزید گہرائی تک مطالعہ کے خواہش مند ہوں ان کے لیے ہم بعض اہم کتب کی نشاندہی کرتے ہیں تاکہ وہ ان سے استفادہ کرسکیں۔ ①

---

① زیادہ وضاحت کے لیے کتاب المراجعات، ترجمہ الغدیر اور نوید امن وامان کی طرف رجوع کریں۔

## حدیث غدیر

مؤرخین اسلام کی ایک بہت بڑی تعداد نے لکھا ہے کہ پیغمبر گرامیؐ اپنی زندگی کے آخری سال حج کے لیے مکہ تشریف لے گئے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے بعد آپؐ اپنے پرانے اور نئے ساتھیوں اور اسلام کے جانثار شیدائی مسلمانوں (جو کہ حجاز کے گوشہ گوشہ سے مراسمِ حج کی ادائیگی کے لیے آپؐ کے ہمراہ تھے) کے عظیم اجتماع کے ساتھ مکہ سے واپسی کے وقت ''جحفہ'' سے گزرتے ہوئے خشک اور گرم بیابان ''غدیرِ خم'' (جو کہ ایک چوراہا تھا اور جہاں سے حجاز کے تمام لوگوں کے راستے جدا ہوتے تھے) کے مقام پر پہنچے۔

اس سے پہلے کہ تمام مسلمان حجاز کے مختلف مقامات کے لیے یہاں سے جدا ہو جاتے۔ پیغمبرؐ نے اپنے ساتھیوں کو رُکنے کا حکم فرمایا اور جو لوگ قافلے کے آگے آگے چل رہے تھے ان کو واپس آنے کا حکم دیا جبکہ پیچھے آنے والے لوگ بھی قافلے میں آشامل ہوئے۔ فضا بے حد گرم اور تپش بہت زیادہ تھی جبکہ اس بیابان میں دُور تک کوئی سایہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ مسلمانوں نے پیغمبرؐ اسلام کے ہمراہ نمازِ ظہر ادا کی اور جیسے ہی انھوں نے اپنے اپنے خیموں میں جانے کا پروگرام بنایا۔ پیغمبرؐ نے اعلان فرمایا کہ سب ایک نئے اور اہم الٰہی پیغام کو سننے کے لیے جو کہ ایک طویل خطبے کے دوران دیا جائے گا تیار ہو جائیں۔

چار اُونٹوں کے پالانوں سے ایک منبر تیار کیا گیا اور اس پر پیغمبرؐ اسلام تشریف فرما ہوئے۔ آپؐ نے خدا کی حمد وثنا کے بعد لوگوں کو مخاطب کر کے یوں فرمایا:

میں خدا کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے جلد ہی تمھارے درمیان سے رخصت ہونے والا ہوں۔ میں خدا کی بارگاہ میں جواب دہ ہوں اور تم بھی جواب دہ ہو۔ تم میرے بارے میں کس طرح کی گواہی دو گے؟

تمام لوگوں نے بہ یک زبان بلند آواز سے کہا:

نشهد انك قد بلغت ونصحت وجهدت فجزاك الله خيراً

''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے رسالت کی ذمہ داریوں کو پورا کیا ہے اور ہماری بھلائی کے لیے ہمیں نصیحت کی ہے اور ہماری ہدایت کی راہ میں بے حد زحمتیں برداشت کی ہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے''۔

آپؐ نے فرمایا: کیا تم سب خدا کی وحدانیت، میری رسالت اور روز قیامت کی حقانیت اور اس روز مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کی گواہی دیتے ہو؟ سب نے بیک زبان کہا: ہم گواہی دیتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: خداوندا! گواہ رہنا۔

آپؐ نے دوبارہ گفتگو شروع کی: اے لوگو! کیا تم سب میری آواز سن رہے ہو؟ سب نے کہا: ہاں اس کے بعد سارے بیابان میں ایک ایسی خاموشی چھائی کہ ہوا کی سنسناہٹ کی آواز کے علاوہ دوسری کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

پیغمبرؐ خدا نے فرمایا: اب بتاؤ ان دو عزیز ترین اور گرانقدر چیزوں کے ساتھ کیا سلوک کرو گے جو کہ میں تمھارے درمیان بطور یادگار چھوڑے جا رہا ہوں؟

مجمع میں سے ایک آواز بلند ہوئی: یا رسولؐ اللہ! وہ دو گرانقدر چیزیں کون سی ہیں؟

آپؐ نے فرمایا: پہلی گرانقدر چیز ''ثقلِ اکبر'' یعنی کتاب الٰہی ''قرآن'' ہے۔ اس کے دامن کو مضبوطی سے تھام کر رکھنا تاکہ گمراہی سے بچے رہو، اور دوسری گرانقدر اور عظیم یادگار چیز ''میری اہل بیتؑ'' ہے اور خداوند لطیف و خبیر نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ یہ دونوں مجھ سے ہرگز جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ جنت میں میرے ساتھ آملیں گے۔ ان دونوں (قرآن و اہل بیتؑ) پر ہرگز سبقت نہ کرنا

وگرنہ ہلاک ہوجاؤ گے اور نہ ہی ان سے پیچھے رہنا کیونکہ اس صورت میں بھی ہلاک ہوجاؤ گے؟

اس دوران یکایک آپ نے کسی کی تلاش میں اردگرد اپنی نظریں دوڑائیں اور جیسے ہی آپ کی نظر حضرت علی علیہ السلام پر پڑی آپؐ نے جھک کر حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑا اور انھیں اس قدر بلند کیا کہ آپ دونوں کی بغلوں کی سفیدی نمایاں ہوگئی اور سب لوگوں نے نہ صرف حضرت علی علیہ السلام کو دیکھا بلکہ ان کو پہچانا۔

اس موقع پر آپؐ کی آواز زیادہ بلند ہوئی اور آپؐ نے فرمایا:

ایها الناس! من اولی الناس بالمومنین من انفسهم

"لوگوں میں سے کون شخص مومنین پر خود ان کی نسبت سے بھی زیادہ حق رکھتا ہے؟"

سب نے کہا: خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔

پیغمبرؐ خدا نے فرمایا: خدا میرا رہبر و مولیٰ ہے اور میں مومنین کا حاکم اور رہبر ہوں اور ان کی نسبت سے میں سب سے زیادہ حق رکھتا ہوں۔

اس کے بعد فرمایا:

من کنت مولاه فعلی مولاه

"ہر وہ شخص جس کا میں مولا ہوں علیؑ اس کے مولا ہیں"۔

آپؐ نے اس بات کو تین مرتبہ اور بعض راویانِ حدیث کے مطابق چار مرتبہ دہرایا اور اس کے بعد اپنے سر کو آسمان کی طرف بلند کیا اور فرمایا:

اللهم وال من والاه وعاد من عاداه واحبّ من احبّه وابغض من ابغضه وانصر من نصره واخذل من خذله وادر الحق معه حیث دار

"خداوندا! اس کے دوستوں کو دوست رکھ اور اس کے دشمنوں کو دشمن، اس شخص کو محبوب رکھ جو اس کو محبوب رکھے اور اس شخص پر غضب نازل فرما جو اس سے کینہ رکھے۔ اس کے مددگاروں کی مدد فرما اور اس کے ساتھ چھوڑنے والوں کو تُو بھی محروم فرما اور جدھر جدھر وہ جائے حق کو بھی اسی طرف موڑ دے"۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: تمام حاضرین اس پیغام کو ان افراد تک پہنچا دیں جو یہاں پر موجود نہیں ہیں۔

ابھی مسلمانوں کی صفیں قائم تھیں کہ وحی خدا کے امین حضرت جبرئیلؑ نازل ہوئے اور یہ آیت پیغمبرؐ خدا تک پہنچی:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ....

"آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کر دیا......" (سورۂ مائدہ: آیت ۳)

اس موقع پر پیغمبرؐ خدا نے فرمایا:

اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر، علی اکمال الدین واتمام النعمة ورضی الرّب برسالتی والولایة لعلی من بعدی

"خدایا! تیری کبریائی کا اعلان کرتا ہوں، خدایا! تیری کبریائی کا اعلان کرتا ہوں۔ اس بات پر کہ تُو نے اپنے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت کو ہم پر تمام کر دیا اور تُو نے میری رسالت اور میرے بعد علیؑ کی ولایت سے اپنی خوشنودی کا اعلان کیا"۔

اس وقت لوگوں کا ایک شور بلند ہوا تھا اور سب لوگ حضرت علی علیہ السلام کو اس منصب کی مبارک باد پیش کر رہے تھے۔ ان میں سے حضرات ابوبکر اور حضرت عمر

نے تمام مجمع کے سامنے حضرت علیؑ سے یہ جملہ کہا:

بخٍ بخٍ لك یابن ابی طالب اصبحت وامسیت مولای ومولا کل مومن ومومنة

''آپ کو مبارک ہو، مبارک ہو اے فرزند ابوطالبؑ! آپؑ میرے حاکم و رہبر اور تمام مومنین و مومنات کے رہبر و حاکم ہو گئے ہیں''۔

## حدیثِ غدیر کی سند

اسلامی تاریخ کے مختلف دانشور حضرات کے ایک بہت بڑے گروہ نے حدیثِ غدیر کو مختلف عبارات کے ساتھ، کہیں تفصیل کے ساتھ اور کہیں انتہائی اختصار کے ساتھ اپنی کتب میں بیان کیا ہے۔ حدیثِ غدیر ان متواتر احادیث میں سے ہے کہ جس کے پیغمبرؐ سے بیان ہونے کی کوئی شخص بھی تردید نہیں کرسکتا۔

جلیل القدر مصنف و محقق علامہ امینی نے اس حدیث کو اپنی مشہور کتاب ''الغدیر'' میں پیغمبرؐ خدا کے ایک سو دس اصحاب اور تین سو ساٹھ مشہور مصنفین کی کتابوں سے نقل کیا ہے۔ نیز یہ حدیث برادرانِ اہلِ سنت کی تفسیر، تاریخ اور حدیث کی اکثر کتابوں میں بیان کی گئی ہے۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ علمائے اسلام کے ایک بڑے گروہ نے خاص طور پر اس حدیث کے بارے میں مستقل کتابیں تحریر کی ہیں۔ انھی میں سے ''علامہ امینی'' نے ایک گراں قدر اور کم نظیر کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اور اس کتاب میں ان چھبیس (۲۶) علمائے اسلام کے نام لکھے ہیں کہ جنھوں نے ''حدیث غدیر'' کے موضوع پر الگ اور مستقل کتابیں تحریر کی ہیں۔

## حدیثِ غدیر میں ''مولا'' کا معنی

بعض حضرات چونکہ حدیث غدیر کی سند کا انکار نہیں کر سکتے تھے لہٰذا انھوں نے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ حدیث امامت یا خلافت کے موضوع پر ہرگز دلالت نہیں کرتی بلکہ اس حدیث میں ''مولا'' سے مراد ''دوست'' ہے حالانکہ حدیث کے مضمون پر توجہ کرنے اور اس کے ارشاد کے مقام اور وقت نیز دیگر حالات وقرائن بخوبی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اس حدیث کا مقصد صرف اور صرف مسئلۂ امامت وولایت بمعنی مکمل رہبری تھا۔ ان میں سے کچھ قرائن درج ذیل ہیں:

الف: آیت ''تبلیغ'' کہ جس کا بیان گذشتہ بحث میں گزر چکا ہے وہ اس واقعہ سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس کا تند وتیز لہجہ خطاب اور اس میں موجود قرائن وشواہد اس بات کے بخوبی گواہ ہیں کہ یہ گفتگو کسی ''عام دوستی'' اور ''رفاقت'' کے لیے ہرگز نہ تھی کیونکہ اس رفاقت اور دوستی کے لیے اس قسم کا اہتمام اور اس کی اتنی اہمیت اور تاکید ضروری نہ تھی۔ اسی طرح آیت ''اکمال دین'' جو کہ اس واقعہ کے بعد نازل ہوئی اس بات کی گواہی ہے کہ پیغمبرؐ کی رہبری اور جانشینی کا مسئلہ یقیناً غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا کہ جس کی وجہ سے یہ تمام گفتگو کی گئی۔

ب: ان تمام مقدمات کے ساتھ اس تپتے ہوئے بیابان میں اس تفصیلی خطبہ کے ہمراہ لوگوں سے اقرار لینا اور وقت وجگہ کے ان حساس حالات میں حدیث غدیر کو بیان کرنا یہ سب چیزیں ہمارے مدعی پر محکم دلائل ہیں۔

ج: مختلف گروہوں، اشخاص اور جلیل القدر صحابہ کی حضرت علی علیہ السلام کو مبارک باد کے علاوہ اس روز کہے گئے شعراء کے اشعار اور اس کے بعد (سے آج تک) کہے گئے اشعار یہ تمام چیزیں اس حقیقت کو عیاں کرتی ہیں کہ یہ گفتگو حضرت علی علیہ السلام کے امامت وولایت کے بلند وبالا منصب کے لیے منتخب ہونے کے سلسلہ میں تھی۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ داستانِ غدیر کی تشریح کریں۔

۲ حدیثِ غدیر پیغمبرؐ اسلام سے کتنی اسناد اور کتنی مشہور اسلامی کتابوں میں نقل ہوئی ہے؟

۳ حدیث غدیر میں ''مولا'' کا معنی رہبر و امام کیوں ہے؟ دوست کیوں نہیں؟

۴ واقعۂ غدیر کے بعد پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ کے لیے کیا دُعا فرمائی؟

۵ مقام ''غدیر'' اور ''جحفہ'' کہاں پر واقع ہیں؟

## ساتواں سبق

# "حدیثِ منزلت" اور "حدیثِ یوم الدار"

بڑے بڑے اہلِ تشیع اور اہلِ سنت مفسرین حضرات نے سورۂ اعراف کی آیت ۱۴۲ کے ذیل میں اس مشہور "حدیث منزلت" کو نقل کیا ہے۔ یاد رہے کہ سورۂ اعراف کی آیت ۱۴۲ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چالیس راتوں کے لیے کوہ طور پر جانے اور حضرت ہارون علیہ السلام کے ان کا جانشین ہونے کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

حدیثِ منزلت کا واقعہ یوں ہے کہ پیغمبرِ اسلام کو خبر دی گئی کہ مشرقی روم کے بادشاہ نے حجاز، مکہ اور مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا ہے تاکہ اس اسلامی انقلاب کو جو کہ انسانیت کی فلاح اور حصول آزادی کے ایک مخصوص پروگرام کے ساتھ واقع ہوا تھا اپنی مملکت کی سرحدوں میں داخل ہونے سے پہلے ہی ختم کر دے۔

آپ نے اس بڑے لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے سرحدی مقام "تبوک" (جو کہ جزیرہ نما عرب کے شمال میں مشرقی روم کے بادشاہ کی سلطنت کی سرحد پر واقع تھا) کے میدان میں جانے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے حضرت علی علیہ السلام کو مدینہ میں اپنے جانشین کے طور پر رکنے کا حکم فرمایا۔

اس موقع پر حضرت علی علیہ السلام نے آپؐ سے عرض کیا: آپؐ مجھے عورتوں اور بچوں کے درمیان چھوڑ دیں گے؟ (اور اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ آپؐ کے ساتھ میدانِ جہاد میں جاؤں اور اس عظیم افتخار کو حاصل کرسکوں؟)

پیغمبر خدا نے ارشاد فرمایا:

الا ترضٰی ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی الا انہ لانبی بعدی

"کیا آپ اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی؟ مگر یہ کہ میرے بعد سلسلۂ نبوت ختم ہونے والا ہے"۔

مذکورہ حدیث اہل سنت کی مشہور ترین احادیث کی کتابوں مثلاً صحیح بخاری و صحیح مسلم میں نقل ہوئی ہے۔ صحیح بخاری میں اس حدیث کا مکمل متن ذکر کیا گیا ہے جبکہ صحیح مسلم میں ایک مرتبہ مکمل متن جبکہ دوسری مرتبہ صرف اس جملہ انت منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی الا انہ لانبی بعدی کو ایک کلی اور عام کلمہ کی صورت میں نقل کیا گیا ہے۔ (صحیح بخاری، ج ۶، ص ۳۔ صحیح مسلم، ج ۱، ص ۴۴ و جلد ۴، ص ۱۸۷)

اس کے علاوہ یہ حدیث اہلِ سنت کی بہت سی کتب مثلاً سنن ابن ماجہ، سنن ترمذی، مسند احمد اور بہت سی کتابوں میں نقل ہوئی ہے۔ جبکہ بیسیوں افراد کہ جن میں جابر بن عبداللہ انصاری، ابوسعید خدری، عبداللہ بن مسعود و... (یہاں تک کہ) معاویہ وغیرہ شامل ہیں، نے اس حدیث کی روایت کی ہے۔

"تاریخ بغداد" میں ابوبکر بغدادی نے اس حدیث کو "عمر بن خطاب" سے یوں نقل کیا ہے: عمر بن خطاب نے ایک شخص کو دیکھا جو کہ امیرالمومنین حضرت علیؑ کے خلاف بکواس کر رہا تھا۔ عمر نے اس سے کہا: تم مجھے منافق معلوم ہوتے ہو کیونکہ میں نے پیغمبر خدا سے سنا ہے کہ

انما علی منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی الا انہ لانبی بعدی،

"علیؑ کی میرے ساتھ نسبت ویسے ہی ہے جیسے ہارونؑ کی موسیٰؑ

ہے تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی دوسرا نبی نہیں ہے"۔(تاریخ بغداد، ج ۷، ص ۴۵۲)

یہاں پر اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ معتبر ترین اسلامی مآخذ کے مشاہدے سے پتا چلتا ہے کہ پیغمبرؐ اسلام نے یہ بات (حدیثِ منزلت) صرف جنگِ تبوک کے موقع پر نہیں فرمائی بلکہ سات مختلف مواقع پر یہ ارشاد فرمایا ہے جو کہ اس حدیث کے عام اور واضح مفہوم پر دلالت ہے۔ وہ سات مواقع درج ذیل ہیں:

۱ "پہلی اُخوت کے دن" یعنی مکہ میں جب پیغمبرؐ خدا نے لوگوں کے درمیان اُخوت کا رشتہ قائم کیا تو اس وقت اس عہد و پیمان میں علیؑ کو اپنے بھائی کے طور پر منتخب فرماتے ہوئے یہی جملہ ارشاد فرمایا۔

۲ "دوسری اُخوت کے دن" جب مہاجرین اور انصار کے درمیان مدینہ میں اُخوت کا عہد و پیمان انجام پایا تو دوبارہ آپؐ نے حضرت علی علیہ السلام کا انتخاب اپنے بھائی کے طور پر فرماتے ہوئے یہی جملہ ارشاد فرمایا۔

۳ جب مسجد نبویؐ میں کھلنے والے لوگوں کے دروازے آپؐ نے بند کروا دیئے اور صرف حضرت علی علیہ السلام کے گھر کے دروازے کو کھلا رکھا تو اس موقع پر بھی آپؐ نے یہی ارشاد فرمایا۔

۴، ۵، ۶، ۷ غزوۂ تبوک اور تین دوسرے مواقع پر کہ جن کی اسناد اہلِ سنت کی کتابوں میں موجود ہیں آپؐ نے یہی "حدیثِ منزلت" ارشاد فرمائی۔

لہٰذا حدیث منزلت کی تردید نہ تو سند کے اعتبار سے کی جا سکتی ہے اور نہ ہی عام مفہوم کے اعتبار سے۔

## حدیثِ منزلت کا مضمون

اگر اپنے ذاتی نظریات و خیالات سے قطع نظر غیر جانب داری سے حدیثِ

منزلت کا تجزیہ کریں تو یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ بنی اسرائیل کے درمیان وہ تمام مراتب اور منصب جو حضرت ہارون علیہ السلام کو حاصل تھے حضرت علی علیہ السلام بھی نبوت کے علاوہ ان تمام عہدوں اور مناصب کے حامل تھے کیونکہ حدیث میں "نبوت کے نہ ہونے" کی قید و شرط کے علاوہ اور کوئی قید موجود نہیں ہے لہٰذا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ:

① پیغمبرؐ خدا کے بعد اُمت مسلمہ میں سب سے افضل حضرت علی علیہ السلام تھے (اور حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد یہی مقام حاصل تھا)۔

② علیؑ پیغمبرؐ خدا کے وزیر، ان کے معاونِ خاص اور ان کی رہبری کے جز ولاینفک تھے کیونکہ قرآنِ مجید سورۂ طٰہٰ کی آیات ۲۹ اور ۳۲ تک حضرت ہارونؑ کے لیے ان تمام عہدوں کا تذکرہ کرتا ہے۔

③ حضرت علی علیہ السلام پیغمبرؐ خدا کے جانشین اور خلیفہ تھے اور آپؑ کی موجودگی میں کوئی دوسرا شخص اس عہدے پر فائز نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے تھے۔

## حدیثِ یوم الدار

اسلامی تواریخ کے بیان کے مطابق نبوت پر مبعوث ہونے کے تین سال بعد آپؐ کو یہ حکم دیا گیا کہ اب اپنی خفیہ دعوت کو آشکار فرما دیں۔ چنانچہ سورۂ شعراء کی آیت ۲۱۴ میں ارشاد ہوا:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ

"اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو عذاب خدا سے ڈرائیں"۔

لہٰذا آپؐ نے حکمِ خدا سے اپنے قریبی رشتہ داروں کو اپنے چچا حضرت ابوطالبؑ کے گھر کھانے کی دعوت دی اور اس کے بعد فرمایا: "اے عبدالمطلبؑ کے فرزندو! خدا کی قسم عرب میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے جو اپنی قوم کے لیے کوئی ایسی چیز لایا

ہو جو میری لائی ہوئی چیز (اور نعمت) سے بہتر ہو۔ میں تمہارے لیے دنیا و آخرت کی نیکیاں اور بھلائیاں لے کر آیا ہوں اور خدا نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ تمہیں اس قانون کی (قبولیت کی) طرف دعوت دوں۔ تم میں سے کون ہے جو میرا مددگار بنے تا کہ وہ میرا بھائی، وصی اور جانشین بن سکے؟

کسی بھی شخص نے اس دعوت پر لبیک نہیں کہی سوائے حضرت علیؑ کے اگرچہ آپ سب سے زیادہ کمسن تھے لیکن پھر بھی آپ کمال شجاعت سے کھڑے ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! میں اس راہ (اسلام) میں آپؐ کا دوست اور مددگار ہوں"۔ پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ کی گردن پر اپنا دستِ مبارک رکھ کر فرمایا:

ان ھذا أخی ووصی وخلیفتی فیکم، فاسمعوا لہ واطیعوہ

"یہ میرا بھائی، وصی اور تمہارے درمیان میرا جانشین ہے۔ اس کی بات کو توجہ سے سنو اور اس کے حکم کی اطاعت کرو"۔

لیکن گمراہ قوم قریش نے نہ صرف پیغمبرؐ کی بات ماننے سے انکار کر دیا بلکہ آپ کا مذاق بھی اُڑایا۔

مذکورہ حدیث جو کہ حدیث "یوم الدار" (گھر پر دعوت کے دن والی حدیث) کے نام سے معروف ہے۔ کافی حد تک حضرت علی علیہ السلام کی جانشینی کے مسئلے کو واضح کرتی ہے۔ جبکہ سند کے اعتبار سے بھی اہلِ سنت کے بڑے بڑے علماء نے اس کو اپنی کتب میں نقل کیا ہے۔ ان علماء میں ابنِ ابی جریر، ابنِ ابی حاتم، ابن مردویہ، ابونعیم بیہقی، ثعلبی، طبری، ابنِ اثیر، ابوالفداء اور دیگر بہت سے علماء شامل ہیں۔

اگر ہم حدیث "یوم الدار" پر غیر جانب دارانہ غور و فکر کریں تو حضرت علی علیہ السلام کی ولایت و خلافت سے متعلق بہت سے حقائق واضح ہو جاتے ہیں کیونکہ اس میں مسئلہ خلافت و ولایت کا ذکر واضح طور پر کیا گیا ہے۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

[۱] حدیث منزلت سے کیا مراد ہے اور بتائیں کہ یہ کتنے مقامات پر بیان کی گئی ہے؟

[۲] حدیث منزلت حضرت علی علیہ السلام کے لیے کن فضائل اور مناصب کو ثابت کرتی ہے؟

[۳] قرآنی نصوص کے مطابق حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے کیا مقام حاصل تھا؟

[۴] حدیث منزلت کو کن علماء نے ذکر کیا ہے؟

[۵] حدیث یوم الدار، اس کا معنی اور مفہوم، اس کی سند اور اس کے ذریعے حاصل کردہ نتیجہ بیان کریں۔

اٹھواں سبق

# حدیثِ ثقلین اور حدیث سفینہ

## حدیثِ ثقلین کی اسناد

علمائے اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے درمیان مشہور و معروف احادیث میں سے ایک حدیثِ ثقلین ہے۔

اس حدیث کو صحابہ کی ایک بہت بڑی تعداد نے پیغمبرؐ خدا سے بلاواسطہ نقل کیا ہے۔ بعض بزرگ علماء نے اس حدیث کے راویوں کی تعداد تیس سے زیادہ بیان کی ہے۔ (سیّد علیؒ، ج ۲۳، ص ۳۰۸)

مفسرین، محدثین اور مؤرخین کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس حدیث کو اپنی کتب میں یوں پے درپے بیان کیا ہے کہ اس حدیث کے متواتر ہونے میں کسی شک و تردید کی گنجائش نہیں ہے۔

بزرگ عالم علامہ سیّد ہاشم بحرانی نے اپنی کتاب ''غایۃ المرام'' میں اس حدیث کو علمائے اہلِ سنت کی ۳۹ اور علمائے شیعہ کی ۸۰ اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے۔ جبکہ بزرگ عالم علامہ میر حامد حسین ہندی نے اس سلسلہ میں مزید تحقیق اور جستجو کے بعد تقریباً دوسو علمائے اہلِ سنت سے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور اس حدیث کے بارے میں اپنی ساری تحقیق کو چھے جلدوں کی ایک بڑی کتاب (عبقات الانوار) میں جمع کیا ہے۔

مشہور ترین صحابہ کہ جنھوں نے اسے نقل کیا ان میں سے ابوسعد خدری،

ابوذر غفاری، زید بن ارقم، زید بن ثابت، ابورافع، جبیر بن مطعم، حذیفہ یمانی، ضمرہ اسلمی، جابر بن عبداللہ انصاری اور حضرت اُم سلمہؓ کے نام قابل ذکر ہیں۔

حضرت ابوذر غفاریؓ اس حدیث کو خانہ کعبہ میں لوگوں کے سامنے کھڑے ہوکر ان الفاظ میں بیان کررہے تھے، میں نے پیغمبرؐ اسلام سے سنا کہ وہ فرمارہے تھے:

انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی وانہما لن یفترقا حتٰی یردا علی الحوض

''میں تمہارے درمیان دو گرانقدر یادگار چیزیں چھوڑے جارہا ہوں: قرآن اور میرے اہلِ بیتؑ۔ یہ دونوں ہرگز جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوضِ کوثر پر پہنچ جائیں گے۔ پس تم ان کا خیال رکھنا اور دیکھنا تم میری سفارش کا ان کے بارے میں کس قدر لحاظ کرتے ہو''۔

یہ روایت اہلِ سنت کے معتبر ترین مآخذ مثلاً صحیح ترمذی، نسائی، مسند احمد، کنز العمال اور مستدرک حاکم وغیرہ میں نقل ہوئی ہے۔

بہت سی روایات میں ''ثقلین'' کی تعبیر یعنی دو گرانقدر چیزیں اور بعض روایات میں خلیفتین کی تعبیر یعنی ''دو جانشین'' آئی ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے ان میں کسی خاص قسم کا فرق نہیں ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مختلف اسلامی احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ اسلام نے اس روایت ''حدیثِ ثقلین'' کو مختلف مواقع پر لوگوں کے گوش گزار کروایا ہے۔ جابر بن عبداللہ انصاریؓ فرماتے ہیں کہ سفرِ حج میں عرفہ کے دن یہ حدیث ارشاد فرمائی۔

عبداللہ بن حنطب فرماتے ہیں: آپ نے یہ حدیث ''جحفہ'' کے مقام پہ

ارشاد فرمائی (جحفہ مکہ اور مدینہ کے مقام پر ایک جگہ کا نام ہے کہ جہاں سے بعض ممالک کے حاجی احرام باندھتے ہیں)۔

حضرت اُمِ سلمہ فرماتی ہیں کہ آپ نے یہ حدیث غدیرِ خم کے مقام پر ارشاد فرمائی جب کہ بعض احادیث سے پتا چلتا ہے کہ پیغمبرِ خدا نے اپنی زندگی مبارک کے آخری دنوں میں بسترِ حالت پر یہ حدیث ارشاد فرمائی۔ ایک اور حدیث کے مطابق آپ نے مدینہ میں منبر پر یہ حدیث ارشاد فرمائی ہے۔ (المراجعات، ص ۴۲)

اہلِ سنت کے معروف عالم ابن حجر نے اپنی کتاب "صواعق المحرقہ" میں تو پیغمبرِ اسلام سے یہاں تک نقل کیا ہے کہ پیغمبرِ اسلام نے اس حدیث ثقلین کو بیان کرنے کے بعد علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر بلند کیا اور فرمایا:

> "یہ علیؑ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے۔
> قرآن اور علیؑ آپس میں جدا نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ میرے پاس حوضِ کوثر پر پہنچیں گے"۔ (صواعق المحرقہ، ص ۷۵)

لہٰذا یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پیغمبرِ اسلام نے اس بنیادی مسئلہ (یعنی حضرت علیؑ کی جانشینی) کے لیے بار بار تاکید کی او. اسلام کی اس حیات بخش حقیقت کے اظہار کے لیے ہر موقع سے فائدہ اُٹھایا اور کسی بھی موقعہ پر اس مسئلہ سے غفلت نہیں برتی۔

## حدیثِ ثقلین کا مفہوم

### چند قابلِ توجہ باتیں

① قرآن اور عترت کا "دو خلیفہ" یا "دو گرانقدر چیزوں" کے طور پر تعارف اس بات کی روشن دلیل ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان دونوں کا دامن

ہرگز ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ اس بات کی اہمیت اس قدر زیادہ ہوجاتی ہے جب بہت سی روایات میں ہم یہ شرط بھی ہمراہ پڑھتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: "اگر ان دونوں کا دامن نہ چھوڑو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے"۔ تو یہ حقیقت اس تاکید کے ساتھ روشن ہوجاتی ہے۔

۲ اس حدیث میں قرآن کو عترت کے ساتھ اور عترت کو قرآن کے ساتھ ساتھ قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ جس طرح قرآن میں تحریف نہ ہوگی اور وہ ہر طرح سے پاک اور محفوظ رہے گا، اسی طرح عترت (خاندانِ پیغمبرؐ) بھی عصمت کے حامل رہیں گے۔

۳ بعض روایات میں پیغمبرِ خداؐ نے صراحت سے فرمایا ہے کہ روزِ قیامت میں تم لوگوں سے ان دونوں اہم یادگاروں کے ساتھ کیے گئے تمہارے برتاؤ کے بارے میں سوال کروں گا تاکہ دیکھوں کہ تمہارا ان کے ساتھ سلوک کیسا تھا؟

۴ بلاشک و تردید ہم "عترت و اہلِ بیت" کی تفسیر جس انداز میں بھی کریں حضرت علیؑ اس کے سب سے زیادہ نمایاں فرد ہیں اور متعدد روایات کے مطابق حضرت علیؑ ہرگز قرآن سے جدا نہیں ہوں گے اور نہ ہی قرآن آپؑ سے جدا ہوگا۔

علاوہ ازیں ہم متعدد روایات میں یہ بھی پڑھتے ہیں کہ آیتِ مباہلہ کے نازل ہونے کے بعد پیغمبرِ اسلامؐ نے حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کو پکارا اور فرمایا: یہ میرے اہلِ بیتؑ ہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح، ص ۵۶۸، چاپ دہلی، و ریاض النضرہ، جلد ۲، ص ۲۴۸، نقل از مسلم و ترمذی)

۵ اس دنیا کی چار دیواری میں محصور ہونے کی وجہ سے قیامت کے اکثر مسائل ہمارے لیے پوری طرح واضح نہیں ہیں لیکن پھر بھی روایات کی روشنی میں پتا چلتا ہے کہ "حوضِ کوثر" سے مراد بہشت میں مختلف نعمتوں سے پُر ایک نہر ہے جو

خالص مومنین اور خاص طور پر پیغمبرؐ اسلام، ان کے اہلِ بیتؑ اور ان کے مکتب کے پیروکاروں کے لیے مخصوص ہے۔

ہماری اب تک کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اُمت کے لیے پناہ گاہ اور مسلمانوں کے رہبر پیغمبرؐ اسلام کے بعد حضرت علی علیہ السلام اور ان کے بعد گیارہ امامؑ ان کے اہلِ بیتؑ میں سے ہیں۔

## حدیثِ سفینۂ نوحؑ

اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کی کتابوں میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول جاذب تعبیرات میں سے ایک وہ تعبیر ہے جو مشہور حدیث "حدیث سفینۂ نوحؑ" میں آئی ہے۔

اس حدیث کے راوی حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ پیغمبرؐ اسلام نے فرمایا:

> الا ان مثل اهل بيتي فيكم مثل سفينة نوح، من ركبها نجي ومن تخلف عنها غرق
>
> "میرے خاندانِ اہلِ بیتؑ کی مثال کشتیٔ نوحؑ کی طرح ہے جو شخص اس میں سوار ہوگیا وہ نجات پا گیا اور جو اس سے جدا ہوا وہ ہلاک ہوگیا"۔ (مستدرک حاکم، ج ۳، ص ۱۵۱)

یہ حدیث جو کہ مشہور احادیث میں سے ہے ہمیں بتاتی ہے کہ پیغمبرؐ اسلام نے اپنی وفات کے بعد حضرت علی علیہ السلام اور خاندانِ پیغمبرؐ کی پیروی اور اطاعت کو ضروری اور لازم قرار دیا ہے۔

اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ اس عظیم و عالم گیر طوفان کے وقت صرف کشتیٔ نوحؑ ہی نجات کا ذریعہ تھی۔ یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اُمت مسلمہ کے لیے پیغمبرؐ اسلام کی وفات کے بعد جو بھی طوفان آئے ان میں راہ نجات صرف ولایت اہلِ بیتؑ سے تمسک ہی تھا اور رہے گا۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

١ حدیثِ ثقلین کا مفہوم اور اس میں مذکور اہلِ بیتؑ کے امتیازات کو بیان کریں؟

٢ حدیثِ ثقلین کے راوی حضرات کون ہیں؟

٣ ''ثقلین'' سے کیا مراد ہے؟ کیا احادیث میں لفظ ''ثقلین'' کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ بھی وارد ہوا ہے، وضاحت کریں؟

٤ پیغمبرِ اسلام نے حدیثِ ثقلین کو کن مواقع پر ارشاد فرمایا؟

٥ حدیثِ سفینہ کی سند اور اس کا مفہوم بیان کریں؟

mablib.org

نواں سبق

# بارہ امامؑ

## بارہ اماموں کے بارے میں روایات

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی بلافصل خلافت اور امامت کو ثابت کرنے کے بعد اب ہم باقی (گیارہ) آئمہ معصومین علیہم السلام کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔اس سلسلہ میں مختصر گفتگو یہ ہے کہ:

آج ہمارے سامنے اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کی کتابوں میں بیان کردہ ایسی متعدد احادیث موجود ہیں جو پیغمبرؐ کے بعد بارہ خلفاء اور آئمہؑ کی خلافت و امامت کے بارے میں ہماری مکمل رہنمائی کرتی ہیں۔

یہ احادیث اہلِ سنت کی انتہائی مشہور اور اہم کتب احادیث مثلاً صحیح بخاری، صحیح ترمذی، صحیح مسلم، صحیح ابی داؤد اور مسند احمد وغیرہ میں نقل کی گئی ہیں۔

"منتخب الاثر" نامی کتاب میں اس موضوع پر دوسو اکہتر احادیث نقل کی گئی ہیں جن میں سے اکثر برادرانِ اہلِ سنت کی کتابوں میں سے جب کہ باقی علمائے اہلِ تشیع کی کتابوں سے نقل کی گئی ہیں، مثلاً: اہلِ سنت کی سب سے زیادہ مشہور کتاب صحیح بخاری میں ایک حدیث ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے کہ:

جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبرِ اسلام سے سنا وہ فرما رہے تھے:

یکون اثنا عشر امیراً ، فقال کلمۃ لم اسمعھا فقال ابی انہ قال کلھم من قریش

"میرے بعد بارہ "امیر" ہوں گے۔ اس کے بعد ایک جملہ ارشاد فرمایا: "جو میں نہ سن سکا لیکن میرے باپ نے کہا کہ پیغمبرؐ نے فرمایا تھا: یہ سب قریش کے خاندان سے ہوں گے"۔ (صحیح بخاری، ج۹، کتاب الاحکام، ص ۱۰۰)

اس حدیث کو "صحیح مسلم" میں بھی کچھ الفاظ کے اضافے کے ساتھ نقل کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبرؐ خدا سے سنا کہ انھوں نے فرمایا:

لا یزال الاسلام عزیزاً الی اثنا عشر خلیفة ثم قال کلمة لم افھمھا فقلت لابی ما قال فقال کلھم من قریش

"اسلام ہمیشہ عزیز رہے گا یہاں تک کہ میرے بارہ خلیفہ ہوں گے۔ اس کے بعد ایک جملہ ارشاد فرمایا جسے میں سمجھ نہ سکا اور میں نے اپنے باپ سے اس جملے کی وضاحت پوچھی تو انھوں نے کہا: پیغمبرؐ خدا نے فرمایا کہ یہ سب (خلفاء و امام) قبیلہ قریش سے ہوں گے"۔ (صحیح مسلم، کتاب الامارہ، باب الناس، تبع قریش)

اہل سنت کی کتاب "مسند احمد" میں مشہور صحابی عبداللہ بن مسعود سے ایک روایت یوں نقل کی گئی ہے کہ پیغمبرؐ خدا سے ان کے خلفاء کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا:

اثناء عشر نقباء بنی اسرائیل

"میرے خلفاء کی تعداد بنی اسرائیل کے نقباء اور رؤسا قوم کی طرح بارہ ہوگی"۔ (مسند احمد، ج۱، ص ۳۹۸)

## مذکورہ احادیث کا مفہوم

تمام مذکورہ احادیث کہ جن میں سے بعض میں اسلام کی عزت کا دارومدار بارہ آئمہؑ کے ذریعے قرار دیا گیا ہے اور دیگر احادیث میں دین اسلام کی قیامت تک بقا و حیات بارہ خلفاء کی مرہونِ منت قرار دی گئی ہے جو سب قریش سے ہوں گے اور بعض احادیث میں ان تمام بارہ آئمہ کو "خاندانِ بنی ہاشم" سے قرار دیا گیا ہے۔ ان تمام احادیث کو ان کے حقیقی معانی کے ساتھ اگر کسی مذہب نے سمجھا ہے اور اس کو اختیار کیا ہے تو وہ مکتب و مذہب "اہلِ تشیع" ہے، جب کہ دیگر مذہب کے علماء ان احادیث کی صحیح توضیح کے سلسلے میں پریشانی کا شکار ہیں کہ کیا خلفاء (اور آئمہ) سے مراد پہلے چار خلفاء اور پھر بنی اُمیہ و بنی عباس کے خلفاء ہیں؟

(یہ قطعاً درست نہیں ہے کیونکہ) ہم جانتے ہیں کہ نہ تو پہلے خلفاء کی تعداد بارہ تھی اور نہ ہی خلفائے بنی اُمیہ یا خلفائے بنی عباسیہ یا دونوں قسم کے خلفاء کو جمع کرنے سے احادیث میں مذکورہ تعداد پوری ہوسکتی ہے۔

اس کے علاوہ بنی اُمیہ میں "یزید" جیسے افراد جبکہ خلفائے بنی عباس میں منصور دوانیقی اور "ہارون الرشید" جیسے افراد بھی خلیفہ بنے تھے کہ جن کے ظلم وستم، استکبار و تباہ کاریوں اور جنایات میں شک و تردید نہیں ہے، لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ان کا شمار خلفائے پیغمبرؐ اور اسلام کی عزت و سربلندی کے لیے کام کرنے والی قابلِ فخر شخصیات میں کیا جاسکے۔ مقام و ولایت و خلافت کا معیار ہم جس حد تک بھی نیچے لے آئیں پھر بھی یہ اور ان کی قسم کے دیگر افراد اس الٰہی عہدہ کے لیے قطعاً غیر موزوں ہیں۔

لہٰذا اس تمام بحث کے بعد خلفاء کا عدد (یعنی بارہ) صرف اہلِ تشیع کے بارہ آئمہؑ سے ہی مکمل ہوسکتا ہے۔

یہ بحث ہم اہلِ سنت کے ایک معروف و بزرگ عالم کی زبان سے ہی پیش کرتے ہیں۔ سلمان بن ابراہیم قندوزی حنفی اپنی کتاب "ینابیع المودۃ" میں فرماتے ہیں:

بعض محققین کہتے ہیں کہ وہ احادیث جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلفاء کی تعداد "بارہ" بتاتی ہیں بہت ہی مشہور ہیں اور بہت سے مختلف طریقوں سے ہم تک پہنچی ہیں۔ گزرتے زمان کے ساتھ جو ہم نے تحقیق کی ہے اس سے صرف ایک بات واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث سے مراد ان کے اہلِ بیت وعترتؑ میں سے بارہ جانشین ہیں۔ لہٰذا یہ بات ممکن ہی نہیں ہے کہ ان احادیث سے مراد خلفائے راشدین (پہلے چار خلفاء) ہوں کیونکہ وہ چار تھے۔ ان احادیث سے مراد "خلفائے بنی اُمیہ" بھی نہیں ہیں کیونکہ ان کی تعداد بارہ سے زیادہ تھی اور عمر بن عبدالعزیز کے علاوہ وہ سب ظالم و ستم گر تھے اور تیسری بات یہ کہ وہ بنی ہاشم میں سے نہیں تھے اور پیغمبرؐ خدا فرما چکے تھے کہ وہ (بارہ آئمہ) بنی ہاشم سے ہوں گے جیسا کہ عبدالملک بن عمر نے جابر بن سمرہ سے نقل کیا ہے اور پیغمبرؐ اسلام کا اس سوال "کہ یہ بارہ خلفاء کس خاندان سے ہوں گے" کے جواب میں آہستہ آہستہ میں جواب فرمانا بتاتا ہے کہ بنی ہاشم کی خلافت پر دیگر قبائل کے اکثر افراد خوش نہ تھے۔ اسی طرح یہ احادیث بنی عباس پر بھی منطبق نہیں ہوسکتیں کیونکہ نہ صرف ان کی تعداد بارہ سے زیادہ تھی بلکہ انھوں نے آیت مودت: قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (سورۂ شوریٰ: آیت ۲۳) پر عمل نہیں کیا اور حدیثِ کسا کو پسِ پشت ڈال دیا۔

ان وجوہات کی بنیاد پر یہ حدیث صرف پیغمبرؐ اسلام کے اہلِ بیت وعترتؑ میں سے منتخب بارہ آئمہؑ پر ہی صد در صد منطبق ہوسکتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

کیونکہ یہ تمام بارہ آئمہؑ علم و دانش کے اعتبار سے سب سے بڑے عالم

ہیں۔ زہد و تقویٰ کے اعتبار سے سب سے بڑے زاہد و پارسا ہیں۔ حسب و نسب کے اعتبار سے سب سے بلند رُتبہ پر فائز ہیں، اور ان سب نے تمام علوم وفنون کو اپنے جد رسولؐ اللہ سے وراثت میں حاصل کیا ہے۔

حدیث ثقلین اور دیگر احادیث جو کہ پیغمبرؐ اسلام سے ہم تک پہنچی ہیں وہ تمام ہماری اس بات کی تائید کرتی ہیں۔ (ینابیع المودۃ، ص ۴۴۶)

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جو حجاز و مکہ کے سفر کے دوران بعض علمائے حجاز سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے پیش آئی وہ بارہ آئمہ سے متعلق وارد احادیث کی ایک اور تفسیر پیش کرتے ہیں جس کو سننے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان احادیث کے مسئلے میں انھوں نے کتنی سخت اور ناقابل حل مشکل کا سامنا کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ان احادیث میں جو بارہ خلفاء کا کہا گیا ہے ان میں سے چار خلفاء وہ ہیں کہ جو اسلام کے ابتدائی دور میں گزر چکے ہیں جب کہ دیگر آٹھ خلفاء آیندہ ظاہر ہوں گے۔

اس طرح سے پیغمبرؐ اسلام کی حدیث میں بیان کردہ بارہ خلفاء کی طرف وہ (دانستہ) توجہ نہیں کرتے۔ ہم کہتے ہیں کہ کیا ہم بارہ آئمہ کے بارے میں احادیث کہ جو صد در صد اہلِ تشیع کے بارہ آئمہ پر منطبق ہوتی ہیں ان کو چھوڑ کر ان افراد کی گفتگو سنیں اور ان ابحاث میں چلے جائیں کہ جن کی مشکلات ہم پر واضح ہیں؟

## ائمہ کے ناموں کے ساتھ ان کا انتخاب

اس مقام پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ پیغمبر گرامیؐ کی بعض روایات جو کہ اہلِ سنت کے ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں ان میں صراحت کے ساتھ بارہ آئمہ کے نام بیان ہوئے ہیں اور ان کی خصوصیات کا بھی تفصیلی ذکر موجود ہے۔

اہلِ سنت کے مشہور عالم شیخ سلمان قندوزی اسی کتاب ''ینابیع المودۃ'' میں رقمطراز ہیں:

''نعثل'' نام کا ایک یہودی پیغمبرؐ خدا کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے چند سوالات کے دوران اس نے پیغمبرؐ خدا سے ان کے اوصیاء اور خلفاء کے متعلق سوال کیا تو پیغمبرؐ خدا نے اپنے جانشینوں کا تعارف ان الفاظ میں کروایا:

ان وصی علی بن ابی طالب وبعدہ سبطای الحسن والحسین تلوہ تسعة ائمة من صلب الحسین قال یامحمد فسھم لی: قال اذا مضی الحسین فابنہ علی، فاذا مضی علی فابنہ محمد، فاذا مضی محمد فابنہ جعفر، فاذا مضی جعفر فابنہ موسٰی، فاذا مضی موسٰی فابنہ علی، فاذا مضی علی فابنہ محمد، فاذا مضی محمد فابنہ علی، فاذا مضی علی فابنہ الحسن، فاذا مضی الحسن فابنہ الحجة محمد المھدی الی فھؤلاء اثنا عشر۔

''میرے وصی علیؑ ابن ابی طالبؑ ہیں، ان کے بعد میرے دو فرزند (نواسے) حسنؑ اور حسینؑ ہوں گے اور حسینؑ کے بعد نو امامؑ ان کی نسل سے ہوں گے۔ یہودی نے عرض کیا: کہ ان نو آئمہ کے نام بھی بیان فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: جب حسینؑ دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے فرزند علیؑ (زین العابدینؑ) ہوں گے اور جب علیؑ دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے فرزند محمدؑ (الباقرؑ) ہوں گے اور جب محمدؑ دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے فرزند جعفرؑ (الصادقؑ) ہوں گے اور جب جعفرؑ دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے فرزند موسیٰؑ (الکاظمؑ) ہوں

گے اور جب موسیٰؑ دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے فرزند علیؑ (الرضاؑ) اور جب علیؑ دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے فرزند محمدؑ (الجوادؑ) ہوں گے اور جب محمدؑ دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے فرزند علی (الہادیؑ) ہوں گے اور جب علیؑ دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے فرزند حسنؑ (العسکری) جانشین ہوں گے اور جب حسنؑ دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے فرزند حجت خدا محمد المہدی عجل اللہ فرجہٗ جانشین ہوں گے اور اس طرح سے بارہ آئمہؑ میرے بعد ہوں گے"۔ (ینابیع المودة، ص ۴۴۱)

نیز اسی کتاب "ینابیع المودة" میں کتاب "مناقب" سے بھی ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس میں بارہ آئمہؑ کے اسمائے مبارک ان کے القاب سمیت بیان کیے گئے ہیں اور حضرت امام مہدیؑ کے بارے میں ان کی غیبت اور ان کے انقلاب اور ان کے زمین کو عدل و انصاف سے پُر کردینے اور ظلم و ستم کو اس کی جڑ سے ختم کردینے کی بشارت دی گئی ہے۔ (ینابیع المودة، ص ۴۴۲)

البتہ اہلِ تشیع کے ذرائع میں اس حوالے سے بہت سی احادیث ہیں کہ جو تواتر کی حد سے بھی بڑھ گئی ہیں۔ (غور کریں)

## جو شخص مرجائے اور اپنے زمانے کے امامؑ کی معرفت حاصل نہ کرے

دلچسپ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اہلِ سنت کی کتابوں میں پیغمبرؐ اسلام کی احادیث میں سے یہ حدیث بھی موجود ہے:

من مات بغير امام مات ميتة جاهلية

"جو شخص (اپنے زمانے کے) امامؑ کے (یعنی امامؑ کی معرفت

کے) بغیر مر گیا اس کی موت جاہلیت کی موت ہے"۔ (المعجم المفہرس لالفاظ الاحادیث النبوی، جلد ٦، ص ٣٠٢)

یہی حدیث اہلِ تشیع کی کتابوں میں ان الفاظ سے ذکر کی گئی ہے۔

من مات ولم یعرف امامه مات میتة جاهلیة

"جو شخص مر گیا اور اس نے اپنے زمانے کے امام کی معرفت حاصل نہیں کی تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے"۔

(بحار الانوار، ج ٥، (چاپ قدیم)، ص ١٦)

یہ حدیث واضح طور پر ہمیں اس بات سے آگاہ کرتی ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں ایک معصوم امام موجود ہوتا ہے اور لوگوں کو چاہیے کہ وہ اس کی معرفت حاصل کریں اور اگر انھوں نے اپنے زمانے کے معصوم امامؑ کی معرفت حاصل نہ کی تو یہ بات اتنی نقصان دہ ہے کہ اسے کفر اور جاہلیت کی سرحد تک پہنچا دے گی۔

کیا اس حدیث میں امام و پیشوا سے مراد وہ لوگ ہیں جو حکومتوں کے سربراہ ہوں جیسے چنگیز خان، ہارون اور ان جیسے دیگر لوگ؟ بلا شک و شبہہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے کیونکہ اکثر حکمران غیر صالح، ظالم و ستم گر اور کبھی شرق و غرب سے وابستہ اور اغیار کی سیاست پر عمل کرنے والے تھے اور ہیں، لہٰذا بغیر کسی شک کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان اشخاص (حکمران) کی معرفت اور ان سربراہان کی امامت پر اعتقاد لوگوں کو جہنم میں بھیج دیتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ہر دور اور ہر زمانے میں ایک معصوم امام موجود ہوتا ہے لہٰذا لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس کو تلاش کر کے اس کی معرفت حاصل کریں اور اس کی امامت کو تسلیم کریں۔

اس کے علاوہ ہر امام معصومؑ کی امامت نہ صرف قرآنی نصوص سے ثابت ہے

بلکہ ان احادیث اور روایات سے بھی ثابت ہے جو ہر سابق امام سے آنے والے امام کے بارے میں ہم تک پہنچی ہیں۔ نیز آئمہ کے معجزات بھی اس بات کو ثابت کرتے ہیں۔

maablib.org

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ بارہ اماموں (ائمہ اثنا عشر) کے بارے میں روایات کن کتابوں میں نقل کی گئی ہیں؟

۲ ان احادیث کا مفہوم بیان کریں؟

۳ ان احادیث و روایات کے بارے میں کی گئی غیر مناسب توجیہات کون سی ہیں؟ بیان کریں؟

۴ کیا اہلِ سنت کی ذکر کردہ احادیث میں بھی بارہ اماموں کا نام بیان ہوا ہے؟

۵ بارہ اماموں (ائمہ اثنا عشر) کے اثبات کے اور کون سے ذرائع ہیں؟ بیان کریں؟

madbib.org

دسواں سبق

# حضرت امام مہدی علیہ السلام

## بارہویں امامؑ اور دنیا کے مصلح اعظم

### تاریک شب کا اختتام

ہم جب بھی آج کے حالات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ہر طرف ظلم و زیادتی، قتل و غارت و فساد، جنگیں، خون ریزیاں، مختلف ممالک کے درمیان کشمکش اور روز بروز زیادہ ہونے والی اخلاقی خرابیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں اور پھر ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سب مسائل اسی طرح جاری رہیں گے؟ اور کیا یہ ظلم و فساد اس قدر بڑھ جائے گا کہ پھر انسانی معاشرہ ایک دائمی جنگ میں پھنس کر تباہ و برباد ہو جائے گا؟ اور کیا صحیح اسلامی عقائد سے انحراف اور اخلاقی برائیاں انسانی معاشرے کو اسی طرح متعفن کرتی رہیں گی؟ کیا انسانیت کی نجات اور اصلاح کے لیے اُمید کی کوئی راہ باقی ہے؟

اس اہم سوال کے دو جواب دیے جا سکتے ہیں:

اوّل: وہ جواب ہے جو بدبین اور مادہ پرست دیتے ہیں کہ دنیا کا مستقبل تاریک ہے اور ہر وقت خطرے کا ایک امکان موجود رہتا ہے۔

دوم: دوسرا جواب آسمانی مذاہب کو ماننے والوں کی طرف سے ہے۔ مسلمان اور ان میں سے بالخصوص اہلِ تشیع اس سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ اس تاریک اور بھیانک شب کے پیچھے اُمید کی ایک صبح موجود ہے۔ یہ سیاہ و تاریک اَبر، موت

کے طوفان اور ویرانی پھیلا دینے والے سیلاب ایک دن ختم ہونے والے ہیں اور پھر اس کے بعد ایک روشن آسمان اور چمکتا ہوا سورج اور امن و امان کی فضا انسانی معاشرے کے سامنے آنے والی ہے۔

مشکلات کے یہ خوفناک بھنور ختم ہوجائیں گے اور اُفق پر ایک نجات کا ساحل ہماری نظروں کے بالکل قریب ہوگا۔ دنیا ایک عظیم مصلح کے انتظار میں ہے جو تمام دنیا کو ایک انقلاب کے ذریعے عدل وحق سے بھر دے گا۔ البتہ مختلف مذاہب کے ماننے والے اس عظیم مصلح کو الگ الگ ناموں سے جانتے ہیں جیسے ایک عرب شاعر کے بقول:

عباراتنا شتی وحسنك واحد
وكل الى ذاك الجمال يشير

''ہماری تعبیریں مختلف ہیں مگر آپ کا حُسن وزیبائی ایک حقیقت ہے اور ہمارے تمام اقوال اسی حُسن وزیبائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں''۔

## فطرت اور مصلح اعظم کا ظہور

باطنی الہامات کہ جن کی امواج بعض اوقات انسان کے عقلی فیصلوں سے بھی زیادہ طاقتور ہوتی ہیں وہ نہ صرف خدا کی معرفت کے حصول کے لیے ہماری رہنمائی کرتی ہیں بلکہ وہ تمام مذہبی اعتقادات کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ وہ باطنی الہامات اس مسئلہ (مصلح اعظم کا ظہور) کے بارے میں بھی ہماری راہنما ہیں۔

## باطنی الہامات کی علامات

پہلی علامت: عالمگیر عدالت وانصاف سے عشق ومحبت ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ دنیا کے تمام انسان اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود اور بغیر کسی استثناء کے صلح و عدالت سے عشق رکھتے ہیں اور ہم سب اسی کے لیے آواز بلند کرتے ہیں اور اس کے لیے کوشش کرتے ہیں اور عالم گیر صلح و عدالت کے اپنے تمام تر وجود کے ساتھ متمنی ہیں۔

مصلح اعظم کے ظہور کے فطری ہونے کی اس سے بہتر دلیل ممکن نہیں ہے کیونکہ ہر جگہ اور ہر ایک کی ایک جیسی تمنا اس کے فطری ہونے کی دلیل ہے (غور کیجیے)۔

ہر فطری اور حقیقی عشق، معشوق کے وجود اور اس کی جاذبیت اور کشش کی حکایت کرتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا نے انسان کے دل میں اس تڑپ کو تو پیدا کیا لیکن وہ چشمہ کہ جس سے وہ سیراب ہو سکے اس کا وجود ہی نہ ہو؟

اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ انسان کا ضمیر اور عدل و انصاف کے حصول کے لیے اس کی فطری خواہش بآواز بلند کہہ رہے ہیں کہ آخرکار تمام دنیا میں صلح و انصاف پھیل کر رہے گا اور ظلم و ستم کی بساط الٹ جائے گی اور تمام انسانیت ایک پرچم تلے ایک ملک کی حیثیت سے مفاہمت اور پاکیزگی پر مبنی زندگی گزارے گی۔

دوسری علامت: دنیا کے تقریباً تمام مذاہب میں ایک مصلح اعظم کے انتظار کا نظریہ و عقیدہ کم و بیش پایا جاتا ہے، اور تمام مذاہب میں اس موضوع پر تفصیلی اور دلچسپ ابحاث موجود ہیں۔ ایک عظیم نجات دہندہ کے ظہور پر ایمان اور وجود بشریت کے زخموں پر مرہم رکھنے جیسے مسائل صرف مسلمانوں کے درمیان ہی زیر بحث نہیں ہیں بلکہ موجودہ دلیلیں اور ثبوت اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ اعتقاد ایسا عام اور قدیم ہے جو مشرق و مغرب کی تمام اقوام اور مذاہب میں موجود تھا لیکن اسلام چونکہ ایک مکمل مذہب ہے لہٰذا اس میں مذکورہ مسئلہ زیادہ تاکید کے ساتھ موجود ہے۔

زرتشتیوں کی مشہور کتابوں میں سے ایک کتاب ''زند'' میں ایزدان اور اہریمنان میں ہمیشہ رہنے والی جنگ کے بیان کے بعد لکھا ہے: جب ایزدان کی طرف سے عظیم کامیابی ہوگی اور اہریمنان کو نابود کردیا جائے گا...... ''یہ کائنات اپنی حقیقی سعادت کو حاصل کرلے گی اور بنی آدم خوش قسمتی کے تخت پر بیٹھ جائیں گے''۔

زردشتویں کی کتاب ''جاماسب نامہ'' میں زردشت سے یوں نقل ہوا ہے کہ تازیوں کی سرزمین سے ایک شخص ظاہر ہوگا...... ایک بڑے سے سر، بڑی پنڈلیوں اور بڑے جسم والا انسان اپنے جد کے دین پر ایک بڑی فوج کے ساتھ آئے گا اور زمین کو عدل وانصاف سے پُر کردے گا۔

ہندوؤں کی کتاب ''وشن جوگ'' میں اس کا ذکر کچھ اس طرح بیان ہوا ہے: بالآخر دنیا ایک ایسے شخص کی طرف پلٹے گی جو خدا کو دوست رکھتا ہوگا اور وہ خدا کے خاص بندوں میں سے ایک بندہ ہوگا۔

ہندوؤں کی ایک اور کتاب ''باسک'' میں ہے کہ دنیا کا اختتام ایک عادل بادشاہ پر ہوگا۔ وہ فرشتوں، پریوں اور انسانوں کا رہبر ہوگا۔ حق وصداقت اس کے ہمراہ ہوں گے اور وہ سمندروں، زمینوں، پہاڑوں میں موجود تمام پوشیدہ چیزوں کو حاصل کرے گا۔ زمین سے لے کر آسمان تک جو کچھ بھی ہوگا اس کی وہ خبریں دے گا اور اس سے زیادہ بڑھ کر کوئی شخص دنیا میں نہیں آئے گا!

قدیم زمانے کی (توارت اور اس سے متعلق مکتوبات) کتابوں میں سے ایک کتاب ''مزامیر داؤد'' میں ہم یہ پڑھتے ہیں: ''شرارتی لوگ ختم ہوجائیں گے لیکن خدا پر توکّل کرنے والے بندے زمین کے وارث بن جائیں گے''۔ اور اسی کتاب کے اسی حصّے میں لکھا ہے: ''سچے لوگ زمین کے وارث ہوں گے اور ہمیشہ اس پر سکونت کریں گے''۔

اس بیان کے مشابہ توریت کی کتابوں میں سے ''اشعیای نبی'' کی کتاب میں بھی ذکر ہوا ہے۔ ''انجیل متی'' کی فصل نمبر ۲۴ میں ہے: ''جیسے مشرق میں بجلی چمک کر مغرب تک ظاہر ہو جاتی ہے اسی طرح ایک انسان بھی ظاہر ہوگا......''۔

''لوقا کی انجیل'' کی بارہویں فصل میں ہے: ''اپنی کمریں تیار اور اپنے چراغوں کی روشنی کو تیز رکھو اور ایک ایسے انسان کی طرح رہو جو اپنے مالک کا منتظر ہوتا ہے کہ جیسے ہی مالک آکر دروازہ کھٹکھٹائے تو وہ دروازے کو بے دریغ کھول دے۔

کتاب ''علائم الظہور'' میں ہے: اہلِ چین کی پرانی کتابوں، ہندوستانیوں کے عقائد، اسکینڈے نیوین ممالک کے باشندوں، قدیم مصریوں اور میکسیکو کے لوگوں اور ان جیسی دیگر اقوام میں بھی ایک ''مصلحِ اعظم'' کے ظہور کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔

## عقلی دلائل

الف: نظام آفرینش ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ دنیائے انسانیت کو بالآخر انصاف پر مبنی ایک قانون کو ماننا پڑے گا اور ایک عادلانہ نظام و پایدار مصلح کے آگے اپنا سرِ تسلیم خم کرنا پڑے گا۔

اس بات کی وضاحت یوں ہے کہ ہمارے علم کے مطابق نظام کائنات بہت سے نظاموں کا ایک مجموعہ ہے اور اس تمام دنیا میں منظم قوانین کا وجود اس نظام ہستی کی وحدت و ہم آہنگی کی دلیل ہے۔

نظم و ضبط، قوانین اور منصوبہ بندی اور حساب و کتاب کا مسئلہ اس دنیا کے سب سے زیادہ حقیقی اور بنیادی مسائل میں شمار ہوتا ہے۔

بڑے بڑے نظاموں سے لے کر ایک ایٹم کے ذرّے تک (کہ لاکھوں ایٹم سوئی کی نوک پر آسکتے ہیں) تمام اشیاء ایک خاص اور صحیح طور پر نپے تلے نظام کے تابع ہیں۔

ہمارے جسم کے مختلف اعضاء "ایک ننھے چھوٹے سے سیل (cell) سے لے کر دماغ و اعصاب کے پیچیدہ جال اور قلب وجگر کے کام کرنے تک" یہ سب کچھ اس طرح منظم ہیں کہ بعض ماہرین کے بقول: "ان میں سے ہر ایک انتہائی صحیح گھڑی کے مانند کام کرتا ہے اور ان کے مقابلے میں انتہائی منظم ماشین کمپیوٹر بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا"۔

کیا اتنی منظم کائنات میں انسان جو اس کُل کائنات کا ایک جز ہے ایک بے رنگ اور غیر منظم جز کے مانند جنگ وجدال، خون ریزی اور ظلم وستم کے سائے تلے زندگی گزار سکتا ہے؟

کیا ناانصافیاں، اخلاقی اور اجتماعی برائیاں جو کہ بے نظمی کی علامتیں ہیں اسی طرح ہمیشہ انسانی معاشرے پر حاکم رہ سکتی ہیں؟

اس بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ نظام کائنات کا دقیق مشاہدہ ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ بالآخر انسانی معاشرہ بھی نظم اور عدل وانصاف کی طرف جھک کر اپنی خلقت کے صحیح راستے کی طرف واپس آجائے گا۔

ب: معاشروں کی راہ کمال پر ارتقائی حرکت انسانیت کے روشن مستقبل کی دلیل ہے کیونکہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ انسانی معاشرے نے جس دن سے اپنے آپ کو پہچانا ہے اس دن سے وہ کسی جگہ اور کسی مرحلے پر رُکا نہیں ہے بلکہ ہمیشہ ترقی کی طرف حرکت کرتا رہا ہے۔

مادی اعتبار سے مکان، لباس، غذا اور آمدورفت کے ذرائع وغیرہ ایک زمانے میں بالکل معمولی شکل میں تھے لیکن آج یہ سب ترقی کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں کہ عقل حیران اور آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں اور ارتقاء کا یہ سفر یقیناً جاری رہے گا۔

علم و دانش اور تمدن بھی ہمیشہ ترقی کی طرف گامزن ہے اور ان تمام شعبہ

جات میں ہر روز نئی معلومات، تحقیقات اور نئے مطالب کا اضافہ ہو رہا ہے۔

اس "ارتقائی قانون" میں آخرکار باطنی، اخلاقی اور اجتماعی پہلو بھی شامل ہو جائیں گے جو انسانیت کو ایک منصفانہ قانون اور ایک پائیدار صلح و عدالت اور اخلاق و باطنی فضائل کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگر آج اخلاقی مفاسد میں اضافہ ہو رہا ہے تو بالآخر یہ چیز بذات خود ایک حقیقی و ارتقائی انقلاب کے لیے زمین ہموار کر رہی ہے۔

ہم ہرگز یہ نہیں کہہ رہے کہ "فساد" کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جس وقت فساد ایک حد سے گزر جائے گا تو اس کے ردعمل میں ایک اخلاقی انقلاب رُونما ہوگا۔

جب انسان مشکلات میں بے بس اور گناہوں کے بدترین نتائج کا شکار ہوں گے اور ان کی عقلیں بیکار ہو جائیں گی اور ان کی جانیں لب پر آجائیں گی تو اس وقت وہ کم از کم ایک ایسے قانون کو ماننے پر آمادہ ہو جائیں گے جو ایک الٰہی رہبر کی طرف سے پیش کیا جائے گا۔

## قرآن اور حضرت مہدیؑ کا ظہور

عظیم آسمانی کتاب قرآنِ مجید کی متعدد آیات اس عظیم ظہور کی خوش خبری دے رہی ہیں (ہم صرف ایک آیت پیش کریں گے)۔

سورۂ نور کی آیت ۵۵ میں ارشاد خداوندی ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ.....

"تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور نیک اعمال

بجا لائے ہیں اللہ نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ انھیں زمین
میں اسی طرح جانشین ضرور بنائے گا جس طرح ان سے پہلے
والوں کو جانشین بنایا"۔

اس آیت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ بالآخر زمین پر جابر حکمرانوں اور ستم گر فرماں رواؤں کی حکومت ختم ہوجائے گی اور ساری زمین پر صالح مومنین حکومت کریں گے۔ اسی آیت کے آخر میں مزید تین وعدے بھی کیے گئے ہیں:

(۱) حقیقی دین کا قیام اور لوگوں کے قلوب میں حکومت الٰہیہ کا نفاذ:

لیمکنن لھم دینھم الذی ارتضٰی لھم

(۲) خوف و بدامنی کا امن و امان میں تبدیل ہونا۔

ولیبدّلنھم من بعد خوفھم امنًا

(۳) ساری زمین سے شرک کا خاتمہ۔

یعبُدُوننی لایشرکون بی شیئًا

حضرت امام علی بن الحسین زین العابدینؑ مذکورہ آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

ھم واللہ شیعتنا یفعل اللہ ذٰلک بھم علی یدی رجلٍ منا
وھو مھدی ھذہ الامۃ

"خدا کی قسم! یہ وہی ہمارے مذہب کے پیروکار ہیں، خدا
ہمارے خاندان کے ایک شخص کے ذریعے سے یہ (حکومت الٰہیہ)
قائم کرے گا اور وہی شخص اس اُمت کا مہدی ہوگا" (تفسیر مجمع
البیان، سورۂ نور، آیت ۵۵ کی تفسیر میں یہ حدیث موجود ہے)۔

## احادیث میں حضرت مہدی علیہ السلام کا تذکرہ

اہلِ تشیع اور اہلِ تسنن کی کتب احادیث میں اس موضوع کے بارے میں کہ ”خاندانِ پیغمبرؐ سے مہدی نامی ایک فرد کے ذریعے سے صلح و عدالت پر مبنی ایک عالمی حکومت قائم ہوگی“۔ بہت سی احادیث ذکر کی گئی ہیں یہاں تک کہ یہ احادیث حد تواتر سے بھی بڑھ گئی ہیں جبکہ کتب اہلِ تشیع میں بھی ایسی متواتر احادیث موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ (مہدیؑ) بارہویں امام، جانشینِ پیغمبرؐ امام حسین علیہ السلام کے نویں بیٹے اور امام حسن عسکری علیہ السلام کے فرزند ہیں۔

اہلِ سنت کی کتب احادیث میں ظہور مہدیؑ کے بارے میں احادیث کے تواتر کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اہلِ سنت کے دانشور حضرات نے اپنی کتب میں انھیں واضح طور پر نقل کیا ہے، یہاں تک کہ حجاز کے سب سے بڑے دینی مرکز ”رابطہ عالمِ اسلامی“ سے شائع ہونے والے رسالے میں لکھا گیا ہے: ”وہ (مہدیؑ) بارہ خلفائے راشدین میں آخری خلیفہ ہیں جن کے بارے میں پیغمبرؐ خدا نے صحیح ترین احادیث میں خبر دی ہے اور مہدیؑ کے متعلق پیغمبرؐ خدا کے بہت سے اصحاب نے احادیث نقل کی ہیں“۔

اس رسالے میں ان بیس صحابہ کے ناموں کا بھی ذکر ہے کہ جنھوں نے حضرت مہدی علیہ السلام کے بارے میں پیغمبرؐ خدا سے احادیث نقل فرمائی ہیں۔ اس کے بعد لکھتے ہیں: ”اس کے علاوہ بھی بہت سے مختلف گروہوں نے احادیث نقل کی ہیں...... بعض اہلِ سنت علماء نے حضرت مہدی علیہ السلام کے بارے میں مستقل کتابیں تحریر کی ہیں ان میں سے ابونعیم اصفہانی، ابن حجر ہیثمی، شوکانی، ادریس مغربی اور ابن العباس ابن عبدالمومن قابل ذکر ہیں“۔

مزید لکھتے ہیں: قدیم و عصرِ جدید کے بڑے بڑے علمائے اہلِ سنت کے

ایک گروہ نے حضرت مہدی علیہ السلام کے بارے میں احادیث کے متواتر ہونے کی توثیق کی ہے۔ مزید لکھتے ہیں: بہت سے حفاظ اور محدثین نے واضح طور پر لکھا ہے کہ مہدی علیہ السلام کے بارے میں احادیث صحیح اور حسن ہیں اور وہ سب ہی قطعی طور پر متواتر بھی ہیں اور قیام مہدیؑ کے بارے میں اعتقاد رکھنا واجب ہے اور یہ عقیدہ قیام مہدیؑ اہلِ سنت والجماعت کے عقائد میں سے ایک عقیدہ ہے۔ اور جاہل اور ایسے لوگ جنھیں ہر چیز میں بدعت نظر آتی ہے ان کے علاوہ کوئی شخص اس عقیدہ کا منکر نہیں ہو سکتا۔

## اہلِ تشیع کی احادیث

اس موضوع پر مختلف راویوں نے پیغمبرؐ اور ائمہ ہدیٰ علیہم السلام سے سیکڑوں احادیث نقل کی ہیں کہ وہ حدِ تواتر سے بھی آگے ہیں اور اہلِ تشیع کے نزدیک یہ عقیدہ ضروریاتِ دین میں سے ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص اہلِ تشیع کے ساتھ زندگی گزارے اور ظہور مہدیؑ کے بارے میں ان کے عقائد، حضرت مہدیؑ کی خصوصیات، ظہور کی نشانیاں، ان کا طرزِ حکومت اور ان کے مختلف منصوبوں کے بارے میں وہ نہ جانتا ہو۔

اہلِ تشیع کے بڑے بڑے علماء نے قرنِ اوّل سے لے کر آج تک لاتعداد کتابیں اس موضوع پر تحریر فرمائی ہیں اور ان میں اس موضوع پر (بڑی تعداد میں) احادیث کو جمع کیا ہے۔ بطور مثال ہم دو حدیثیں نقل کرتے ہیں اور مزید مطالعہ کے شائق افراد کو ہم کتاب "مہدیؑ انقلابی بزرگ"، "نوید امن و امان"، صدر الدین کی کتاب "المہدیؑ" وغیرہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لو لم یبق من الدھر الا یوم لطوّل اللہ ذٰلک الیوم حتّٰی

یبعث رجلا من اهل بیتی یملاها قسطاً وعدلاً کما ملئت ظلماً وجوراً

"اگر دنیا کی زندگی کا آخری دن رہ جائے تو بھی خدا اس دن کو اتنا طولانی کرے گا کہ میرے اہلِ بیتؑ سے ایک شخص کو مبعوث کرے تاکہ وہ زمین کو اسی طرح عدل و انصاف سے بھر دے جس طرح وہ ظلم و جَور سے بھری ہوئی ہے"۔ ①

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اذا قام القائم حکم بالعدل وارتفع الجور فی ایامه وامنت به السبل واخرجت الارض برکاتها، ورد کل حق الی اهله .... وحکم بین الناس بحکم داود وحکم محمد فیحنئذ تظهر الارض کنوزها، وتبدی برکاتها، ولا یجد الرجل منکم یومئذ موضعاً لصدقته ولبره، لشمول الغنی جمیع المؤمنین....

"جب حضرت قائمؑ ظہور فرمائیں گے تو اپنی حکومت کی بنیاد عدل و انصاف پر رکھیں گے۔ ان کے دورِ حکومت میں زمین سے ظلم و جَور کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ان کے وجود کی برکت سے راستے پُرامن ہو جائیں گے، زمین اپنی برکات (خزائن) کو اُگل دے گی اور حق اس کے حق دار تک پہنچ جائے گا...... و: حضرت مہدیؑ انسانوں کے تمام مسائل کو اسی طرح حل کریں گے جیسے حضرت داؤدؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حل فرماتے

① یہ حدیث اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کی اکثر کتابوں میں نقل ہوئی ہے۔

تھے۔ اس وقت کوئی شخص خیرات، صدقہ اور مالی امداد دینے کے لیے کسی مستحق کو تلاش نہ کرسکے گا کیونکہ تمام مومنین بے نیاز اور غنی ہوجائیں گے"۔ (بحار الانوار، ج ۱۳، (چاپ قدیم)

ہم جانتے ہیں کہ امام عصرؑ کی غیبت کے زمانے میں امامت اور ولایت کے معین شدہ خطوط کا تحفظ اور ان کی بقاء امامؑ کے عام نائبین یعنی علماء و فقہاء کے ذریعے ہوتی ہے۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ دنیا کے مستقبل کے بارے میں خدا پرست اور مادہ پرست لوگوں کے نظریات میں کیا فرق ہے؟

۲ کیا فطرت کے اُصولوں سے حضرت حجتؑ کے ظہور کو سمجھا جا سکتا ہے؟

۳ اگر اس ظہور کے بارے میں عقلی دلائل ہیں تو بیان کریں؟

۴ ظہور کے بارے میں قرآنی نظریہ بیان کریں؟

۵ احادیث وسنت کے ذریعے سے ''ظہور حضرت مہدیؑ'' کا تجزیہ کیجیے؟

madblib.org

۱

# معاد

پہلا سبق

# ایک اہم سوال: موت اختتام ہے یا آغاز؟

بہت سے لوگ موت سے ڈرتے ہیں، کیوں؟

موت ہمیشہ لوگوں کی نظروں میں ایک وحشت ناک ہیولا کی صورت میں اُبھرتی رہی ہے۔ بہت سے مقامات پر صرف اس کی سوچ اور فکر ہی زندگی کا سارا مزہ خراب کردیتی ہے۔ لوگ نہ صرف موت سے ڈرتے ہیں بلکہ قبرستان کے نام سے بھی دُور بھاگتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ قبور اور مقبروں پر زرق و برق، آرائش وزیبائش کرکے ان کی حقیقت سے غافل ہوجائیں۔

موت کا یہ خوف ادبی دنیا کے مختلف آثار میں بھی واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے اور ہمیشہ سے اسے مختلف انداز مثلاً ''موت کا ہیولا''، ''موت کا پنجہ''، ''موت کا طمانچہ'' اوراس قسم کے دوسرے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(ایرانی کلچر میں) جب کوئی چاہتا ہے کہ کسی مُردے کا نام لے تو اس لیے کہ سامنے والا وحشت نہ کھائے پہلے اس قسم کے جملے ''اب سے دُور''، ''میری زبان گنگ ہو''، ''سات پہاڑ درمیان ہوں''، ''جو اس کی خاک ہے وہ تمھاری عمر ہو''۔ وغیرہ لاکر کوشش کرتا ہے کہ سننے والے اور موت کے ذکر کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردے۔

لیکن ہمیں تحقیق وتجزیہ کے ساتھ یہ بات معلوم کرنی چاہیے کہ انسانوں میں ہمیشہ سے پائی جانے والی اس وحشت کا سبب اور سرچشمہ کیا ہے؟ جبکہ اس عموی

کیفیت کے برعکس بعض لوگ نہ صرف یہ کہ موت سے خائف نہیں ہوتے بلکہ موت کے سامنے مسکراتے ہیں اور فخریہ انداز سے موت کے استقبال کے لیے قدم بڑھاتے ہیں؟ ایسا کیوں ہے؟

ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ جب بعض لوگ آب حیات اور اکسیر جوانی کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے تو اس وقت کچھ لوگ جذبۂ عشق سے لبریز جہاد کے مورچوں کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے اور نہ صرف موت کا مسکرا کر سامنا کر رہے تھے بلکہ اپنی طولانی زندگی سے شکوہ کرتے ہوئے ایسے دن کی آرزو لیے ہوئے تھے کہ جب وہ اپنے محبوب پروردگار کے دیدار اور مقام لقاء اللہ تک جا پہنچیں، اور آج بھی ہم حق و باطل کے محاذ پر اسی کیفیت کا واضح مشاہدہ کر رہے ہیں کہ کس طرح حق پرست اپنی جان ہتھیلی پر لیے ہوئے شہادت کے استقبال کے لیے تیزی سے قدم بڑھاتے ہیں۔

## خوف کی حقیقی وجہ

تحقیق اور غور و فکر کے بعد ہم اس مقام پر پہنچے ہیں کہ ہمیشہ سے اس خوف کا بنیادی سبب صرف دو چیزیں ہیں:

### 1 موت سے فنا مراد لینا

انسان ہمیشہ سے "نہ ہونے یا نیستی" سے بھاگتا ہے مثلاً بیماری سے بھاگتا ہے جو کہ موت و سلامتی کا "نہ ہونا" ہے۔ تاریکی سے ڈرتا ہے جو کہ روشنی کا نہ ہونا ہے۔ محتاجی سے ڈرتا ہے جو کہ تونگری کو ختم کرنے والی ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی خالی مکان سے بھی ڈرتا ہے اور خالی راستے میں بھی خوف زدہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہاں "کوئی نہیں" ہوتا۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ مُردے سے بھی ڈرتا ہے، مثلاً وہ کبھی اس بات کے لیے تیار نہیں ہوگا کہ کسی ایسے کمرے میں رات بسر کرے جس میں کوئی مُردہ بھی ہو حالانکہ جب وہ شخص زندہ تھا تو یہ اس سے نہیں ڈرتا تھا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ انسان ''عدم اور نیستی'' سے کیوں وحشت زدہ ہے؟ اس کی وجہ واضح ہے کیونکہ ہر موجود چیز دوسری موجود چیز سے آشنا ہے اور تعلق رکھتی ہے جب کہ کسی بھی موجود چیز کی ''غیر موجود'' سے آشنائی نہیں ہے، لہٰذا ہماری ''عدم سے اجنبیت'' مکمل طور پر طبیعی ہے۔

اب اگر ہم موت کو ہر چیز کا اختتام سمجھیں اور یہ خیال کریں کہ مرنے سے سب کچھ ختم ہو جاتا ہے تو پھر ہم یہ حق رکھتے ہیں کہ موت سے ڈریں یہاں تک کہ اس کے نام اور اس کے خیال سے ہی وحشت کھائیں کیونکہ موت ہم سے ہر چیز چھین لیتی ہے۔

لیکن اگر موت کو ایک نئی جاودانی زندگی کا آغاز اور ایک بہت بڑے جہان کی طرف کھلنے والا دریچہ سمجھیں تو پھر اس صورت میں طبعاً نہ فقط ہم اس سے وحشت نہیں کھائیں گے بلکہ ان لوگوں کو مبارکباد بھی دیں گے جو پاکیزگی کے ساتھ سربلند کیے ہوئے اس کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔

### ۲ سیاہ اعمال نامے

بعض ایسے لوگوں کو ہم جانتے ہیں جو موت سے مراد فنا اور عدم نہیں لیتے اور موت کے بعد زندگی کے بھی منکر نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود وہ موت سے خوف زدہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اعمال نامہ اس قدر سیاہ اور تاریک ہے کہ وہ موت کے بعد کی دردناک سزاؤں سے خوف زدہ ہیں۔ ان کا حق ہے کہ وہ موت سے ڈریں کیونکہ وہ ایسے خطرناک مجرموں کے مانند ہیں جو جیل سے رہا ہونے سے

ڈرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جب بھی انھیں جیل کی دیواروں سے باہر نکالا جائے گا تو باہر موجود لوگ انھیں زندگی سے بھی آزاد کردیں گے۔ وہ زندان کی محکم سلاخوں سے اس لیے نہیں چمٹے کہ وہ آزادی سے نفرت کرتے ہیں بلکہ وہ ایسی آزادی سے ڈرتے ہیں کہ جس کا نتیجہ سزائے موت ہے۔ اسی طرح ایسے بدکار بھی موت سے ڈرتے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ ان کی روح بدن کے تنگ قفس سے آزاد ہوتے ہی اپنے پلید و ذلیل اعمال اور ظلم وستم کی وجہ سے ایک بہت بڑی قادر ذات کے شکنجے میں آنے والی ہے۔

لیکن وہ لوگ جو نہ تو موت کو فنا سمجھتے ہیں اور نہ ہی ان کا اعمال نامہ سیاہ اور تاریک ہے وہ موت سے کیوں ڈریں؟ بلاشبہ وہ زندگی کو اس کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ چاہتے ہیں، صرف اس لیے کہ اس سے موت کے بعد والے جہان اور اپنی نئی زندگی کے لیے خوب فائدہ اُٹھا سکیں اور ایسی بامقصد اور پُرافتخار موت کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں کہ جس میں خدا کی رضا وخوشنودی شامل ہو۔

## دو مختلف نظریے

ہم کہہ چکے ہیں کہ لوگ دو قسم کے ہیں: ایک وہ کہ جن کی تعداد زیادہ ہے، موت سے بیزار اور اس سے نفرت کرنے والے ہیں بعض وہ ہیں جو ایسی موت کہ جو کسی بڑے مقصد کی خاطر ہو، جیسے "اللہ کی راہ میں شہادت" تو وہ اس کا استقبال کرتے ہیں یا کم از کم جب محسوس کریں کہ ان کی طبعی زندگی کا چراغ گل ہونے والا ہے تو وہ اپنے اندر کسی قسم کا رنج وغم نہیں پاتے۔

اس کی وجہ دو مختلف نظریوں کا ہونا ہے:

پہلی قسم کے لوگوں کا یا تو موت کے بعد والے جہان پر ایمان نہیں ہوتا۔ اگر ایمان ہو تو بھی انھیں ابھی تک صحیح طریقے سے اس کا یقین نہیں ہوتا لہٰذا وہ لمحہ موت

کو تمام چیزوں سے جدائی کا لمحہ سمجھتے ہیں۔ یہ طے شدہ امر ہے کہ تمام چیزوں سے جدائی بہت ہی مشکل ہے۔ روشنی اور نور سے باہر نکلنا اور مطلق تاریکی میں قدم رکھنا بہت ہی دردناک ہے۔

اسی طرح ایک جیل سے آزاد ہو کر عدالت میں حاضر ہونا کسی ایسے مجرم کے لیے کہ جس کے جرائم کی فائل کھل چکی ہو بہت ہولناک اور وحشت انگیز ہے۔

دوسری قسم کے لوگ موت کو ایک نئی ولادت سمجھتے ہیں، یعنی ایک محدود اور تاریک دنیاوی ماحول سے باہر نکلنا اور ایک بہت وسیع و عریض روشن جہان میں قدم رکھنا۔ ایک تنگ اور چھوٹے سے پنجرے سے آزاد ہو کر لامحدود آسمان میں پر کھولنا، ایک ایسے ماحول سے باہر نکلنا کہ جو لڑائیوں، کش مکشوں، تنگ نظریات، ناراضیوں، کینہ توزیوں اور جنگوں کا مرکز ہے اور ایسے ماحول میں قدم رکھنا جو ایسی تمام آلودگیوں سے پاک ہے۔ واضح ہے کہ وہ ایسی موت سے وحشت نہیں کھائیں گے بلکہ امیر المومنین علی علیہ السلام کے مانند کہیں گے:

لابن ابی طالب انس بالموت من الطفل بثدی امه

"خدا کی قسم! ابوطالبؑ کے فرزند کا موت سے انس اس شیر خوار بچے سے زیادہ ہے جو ماں کی چھاتیوں سے مانوس ہے"۔

یا اس فارسی شاعر کے مانند یہ اشعار زبان پر جاری کریں گے:

مرگ اگر مرد است گو نزد من آی

تا در آغوشش بگیرم تنگ تنگ!

"موت اگر دلیر اور شجاع ہے تو اسے کہو۔ میرے پاس آئے

تاکہ میں اسے اپنی گود میں بھینچ

من ز او جامۂ ستانم جاودان
او زمن دلقی ستاند رنگ رنگ!

"اس نے تو مجھ سے رنگ برنگے درویشانہ پیراہن لیے ہیں
جبکہ میں نے اس سے دائمی زندگی لے لی ہے"۔

کتنا اچھا لگتا ہے کہ جب ہم اسلامی تاریخ میں امام حسین علیہ السلام اور ان پر جان نچھاور کرنے والے ان کے باوفا ساتھیوں جیسے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ جیسے جیسے لحۂ شہادت قریب آرہا تھا ان کے چہروں پر شادابی اور چمک بڑھ رہی تھی اور وہ اپنے محبوب پروردگار کی ملاقات کے اشتیاق میں اپنے جسم میں نہیں سمارہے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے اوراق میں حضرت علی علیہ السلام کی بافخر زندگی کے حالات میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب قاتل کی تلوار کی ضرب ان کے سرِ اقدس پر لگی تو انھوں نے زبانِ مبارک پر فزت وربّ الکعبۃ کے کلمات جاری فرمائے یعنی "کعبہ کے رب کی قسم! میں کامیاب ہوگیا"۔

یہ واضح ہے کہ اس بات کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنی زندگی کو خواہ مخواہ خطرات میں ڈالے اور زندگی جیسی عظیم نعمت سے لاپرواہ ہوجائے اور عظیم مقاصد تک پہنچنے کے لیے زندگی سے فائدہ نہ اٹھائے، بلکہ ہماری مراد یہ ہے کہ انسان زندگی سے صحیح طریقے سے فائدہ اٹھائے اور کبھی زندگی کے ختم ہوجانے کے خیال سے وحشت زدہ نہ ہو بالخصوص اس وقت کہ جب وہ اعلیٰ اور عظیم اہداف کی راہوں پر گامزن ہو۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ لوگ موت سے کیوں ڈرتے ہیں اور اس کی کیا وجوہات ہیں؟

۲ بعض لوگ موت کا سامنا کرتے وقت کیوں مسکراتے ہیں؟ اور اللہ کی راہ میں شہادت کے مشتاق کیوں ہوتے ہیں؟

۳ "لمحۂ موت" کو کس چیز کے ساتھ تشبیہ دی جاسکتی ہے؟ باایمان پاکیزہ لوگ کیا محسوس کرتے ہیں؟ اور بے ایمان ناپاک لوگ کیا محسوس کرتے ہیں؟

۴ کیا آپ نے اپنی زندگی میں ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو موت سے نہ ڈرتے ہوں؟ کیا ایسا کوئی واقعہ آپ کو یاد ہے؟

۵ موت کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام کی کیا رائے ہے؟

maablib.org

دوسرا سبق

# معاد کے بغیر زندگی بے معنی ہے

اگر اس جہان کی زندگی کو دوسرے جہان سے قطع نظر ملاحظہ کریں تو یہ بے معنی اور فضول لگے گی۔ یہ زندگی بالکل ایسے ہی ہوگی جیسے ہم شکم مادر میں جنین کی زندگی کا اس دنیاوی زندگی سے قطع نظر تصور کریں۔

وہ بچہ جو شکم مادر میں زندگی گزار رہا ہے اور اس تنگ و تاریک جیل میں کئی مہینوں کا قیدی ہے۔ اگر اس وقت اسے عقل و دانائی حاصل ہو جائے اور وہ حالت جنین والی زندگی کے بارے میں سوچے تو یقیناً حیران ہوگا۔

(اور اپنے آپ سے یہ سوال کرے گا:)

میں کیوں اس تاریک جیل میں محبوس ہوں؟

کیوں میں یہاں پانی اور خون میں اپنے ہاتھوں اور پاؤں کو حرکت دوں؟ زندگی کے آخر میں یہاں مجھے کیا نتیجہ حاصل ہوگا؟ میں کہاں سے آیا ہوں اور کس لیے آیا ہوں؟ لیکن اگر اسے یہ بتایا جائے کہ یہ ایک ابتدائی دور ہے۔ یہاں تمھارے اعضاء کی شکل و صورت بنتی ہے، انھیں قوت ملتی ہے تا کہ ایک وسیع تر دنیا میں حرکت کے لیے تیار رہیں، نو مہینے گزرنے کے بعد تمہیں اس جیل سے آزادی کا پروانہ مل جائے گا اور تم ایسی دنیا میں قدم رکھو گے کہ جہاں چمکتا سورج اور روشن چاند، سرسبز درخت اور پانی کی جاری نہریں اور بہت سی اقسام کی نعمتیں ہوں گی۔ تو اس وقت وہ اطمینان بھرا سانس لے گا اور کہے گا کہ میں اب سمجھا کہ یہاں میرے

وجود کا فلسفہ کیا ہے!

یہ ایک ابتدائی مرحلہ ہے، دوسری دنیا تک رسائی کے لیے ایک پُل ہے۔ یہ ایک بڑی یونیورسٹی تک جانے کی کلاس ہے۔ لیکن اگر جنین کی زندگی کا دنیاوی زندگی سے تعلق ٹوٹ جائے تو ہر چیز تاریک اور بے معنی ہو جائے گی اور شکمِ مادر ایک وحشت ناک اور اذیت ناک قید خانہ بن جائے گا۔ جہاں بے ہدف اور بے نتیجہ زندگی کے چند لمحات گزر رہے ہیں۔

اس دنیاوی زندگی کی ''موت کے بعد والے جہان کے ساتھ تعلق'' کی یہی نوعیت ہے۔ کیوں ضروری ہے کہ ہم ستر سال یا اس سے کم و بیش اس دنیا کی مشکلات میں ہاتھ پاؤں ماریں؟ کچھ عرصہ خام اور بے تجربہ رہیں اور جب ہمارے اندر پختگی پیدا ہو تو ہماری عمر تمام ہو جائے!

ایک مدت ہم علم و دانش حاصل کریں اور جب ہم علمی حوالے سے کسی مقام تک جا پہنچیں تو بڑھاپے کی چاندنی ہمارے سروں سے جھانکنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ہم زندگی کیوں گزار رہے ہیں؟ غذا کھانے کے لیے، لباس پہننے کے لیے، سونے کے لیے؟ کیا انھی چیزوں کا کئی سال تکرار کرنا ہی زندگی ہے؟ واقعاً کیا، یہ بہت بڑا آسمان، یہ وسیع و عریض زمین اور یہ سب چیزیں یہ علم اور تجربات کا حاصل کرنا، یہ سب اساتذہ اور مربی ــــ یہ سب کچھ صرف اسی کھانے پینے اور پہننے کے لیے اور اسی پست تکراری زندگی کے لیے ہے؟

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں معاد کو قبول نہ کرنے والوں کے لیے زندگی کی بے وقعتی یقینی ہو جاتی ہے کیونکہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو زندگی کا ہدف اور مقصد شمار کریں جبکہ وہ موت کے بعد والے جہان پر ایمان بھی نہیں رکھتے۔ لہٰذا دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے بعض لوگ ایسی فضول اور بے معنی زندگی

سے نجات حاصل کرنے کے لیے خودکشی جیسے اقدام کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن اگر ہم مان لیں کہ دنیا آخرت کے لیے "مزرعہ" ہے، دنیا ایک ایسا کھیت ہے کہ جس میں ہمیں چاہیے کہ بیج ڈالیں اور اس کا ثمرہ ایک جاودانی اور اَبدی زندگی میں اُٹھائیں۔

دنیا ایک ایسا "سکول" ہے کہ جس میں کچھ معلومات حاصل کریں، اور اپنے آپ کو ہمیشہ رہنے والے گھر میں زندگی کے لیے تیار کریں۔ دنیا ایک راستہ اور پُل ہے کہ جسے ہم ضرور عبور کریں۔

اس صورت میں دنیاوی زندگی فضول اور بے معنی نہیں ہوگی بلکہ ایک ابتدائی دور ہوگا۔ ایک ایسی اَبدی اور جاودانی زندگی کے لیے کہ جس کے لیے جس قدر کوشش کریں کم ہے۔ ہاں صرف معاد پر ایمان زندگی کو بامعنی اور بامقصد بناتا ہے اور اسے اضطراب، پریشانی اور بے وقعتی سے نجات دیتا ہے۔

## انسانی تربیت میں عقیدہ معاد کا اہم کردار

روز آخرت ایک بڑی عدالت کے قیام پر ایمان کے علاوہ معاد کا عقیدہ ہماری موجودہ دنیاوی زندگی میں بھی بہت زیادہ اثر رکھتا ہے۔

فرض کریں اگر کسی ملک میں یہ اعلان ہوجائے کہ سال کے فلاں دن میں کسی جرم کی سزا نہیں ملے گی، کوئی مقدمہ نہیں چلے گا۔ لوگ چاہیں تو ہر قسم کی سزا اور پکڑ دھکڑ کے نہ ہونے سے آسودہ خاطر ہوکر وہ دن گزار سکتے ہیں۔ پولیس اور تمام قانونی ادارے چھٹی کریں گے۔ عدالتیں بند ہوں گی یہاں تک کہ دوسرے دن جب معمول کے مطابق زندگی شروع ہوگی تب بھی اس دن کے جرائم کو عدالتوں میں پیش نہیں کیا جائے گا۔

ذرا سوچیے اس روز پورے معاشرے کی کیا حالت ہوگی؟ معاد پر ایمان دراصل ایک ایسی عظیم عدالت پر ایمان ہے کہ جس کا دنیا سے کبھی مقایسہ نہیں کیا جاسکتا۔

اس عظیم عدالت کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

① ایک ایسی عدالت ہے کہ جس کے قوانین پر نہ سفارش اثرانداز ہے اور نہ تعلقات اور نہ وہاں قاضی کی سوچ کو جھوٹے دلائل کے ساتھ تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

② ایسی عدالت کہ اس جہان کے مانند تکلفات کی محتاج نہیں ہے اس لیے وہاں لمبے اور تفصیلی مراحل کی ضرورت نہیں ہے۔ بجلی کی سی تیزی سے معاملہ پر غور ہوگا اور انتہائی وقت کے ساتھ حکم صادر ہوگا۔

③ ایسی عدالت کہ جہاں لوگوں کے جرم کے گواہ خود ان کے اعمال ہوں گے، یعنی خود اعمال وہاں حاضر ہوں گے اور اپنے فاعل کے ساتھ، اپنے تعلقات کو اس طرح واضح کریں گے کہ انکار کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔

④ اس عدالت میں گواہ ہاتھ، پاؤں، کان، آنکھ، زبان اور انسان کے جسم کی جلد ہوگی، یہاں تک کہ ایسے گھر جہاں گناہ یا کارخیر ہوا ہے اس کی زمین، دروازے اور دیواریں بھی گواہ ہوں گی۔ ایسے گواہ ہوں گے کہ جو انسان کے اعمال کے نتائج کی طرح قابل انکار نہیں ہوں گے۔

⑤ یہ عدالت ایسی عدالت ہے کہ جس کا حاکم خدا ہے، وہ خدا جو ہر چیز سے آگاہ، ہر چیز سے بے نیاز اور ہر ایک سے زیادہ عادل ہے۔

⑥ اس کو چھوڑیں، وہاں سزا اور جزا صرف حکم کی حد تک نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر خود ہمارے ہی اعمال سزا یا جزا کے لیے شکل تبدیل کریں گے اور ہمارے ہی ساتھ ہوں گے یا تو ہمیں اذیت دیں گے یا آسائش ونعمت میں لے جائیں گے۔ ایسی عدالت پر ایمان ہی انسان کو اس مقام پر لے جاتا ہے کہ وہ علی علیہ السلام کے مانند کہتا ہے۔

"خدا کی قسم! اگر مجھے نرم بستر کے بجائے راتوں کو صبح تک

خاردار جھاڑی کے کانٹوں پر جاگتے ہوئے گزارنا پڑے اور میرے ہاتھوں اور پاؤں کو زنجیر میں مقید کر کے مجھے گلیوں اور بازاروں میں گھسیٹا جائے یہ مجھے اس سے کہیں زیادہ پسند ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے اس حالت میں ملاقات کروں کہ میں نے کسی بندے پر ظلم کیا ہو یا مال دنیا میں سے کوئی چیز غصب کی ہو"۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۴)

اس عدالت پر ایمان انسان کو یہ درس دیتا ہے کہ وہ آگ سے سرخ جلتا ہوا لوہا اس بھائی کے ہاتھ کے قریب کرے جو چاہتا تھا کہ بیت المال سے خصوصی حصہ لے جائے اور جب بھائی بلبلاتا ہے تو اسے ڈراتے ہوئے کہتا ہے:

"تو اس آگ کے معمولی سے شعلے سے جو کہ انسانوں کے ہاتھوں میں کھلونوں کے مانند ہے بلبلا رہا ہے لیکن اپنے بھائی کو ایسی ہولناک آگ کی طرف کھینچ رہا ہے جو پروردگار کے قہر وغضب سے بھڑک رہی ہے"۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۲۲۴)

آیا ایمان کے اس مرتبے پر فائز انسان کو فریب دیا جاسکتا ہے؟ آیا رشوت کے ساتھ اس کے ضمیر کو خریدا جاسکتا ہے؟ آیا ممکن ہے کہ اسے لالچ یا دھمکی سے راہ حق سے ہٹا کر ظلم وستم پر مجبور کیا جائے؟

قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ "جب گناہ گار اپنے نامۂ اعمال کو دیکھیں گے تو ان کی فریاد بلند ہوگی اور وہ کہیں گے:

مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا

"یہ کیسا نامۂ اعمال ہے؟ اس نے کسی چھوٹی اور بڑی بات کو نہیں چھوڑا (بلکہ) سب کو درج کرلیا ہے"۔

اس دن پر عدالت کے ایمان سے روح انسان کی گہرائیوں میں ہر کام کرتے وقت ذمہ داری کے احساس کی ایک طاقتور موج پیدا ہوتی ہے اور یہی احساس اسے ہر قسم کے انحراف، ظلم و گمراہی اور زیادتی کے مدمقابل کنٹرول کرتا ہے۔

maablib.org

# سوچیے اور جواب دیجیے

١ اگر دنیا کی اس محدود اور عارضی زندگی کے بعد کوئی اور جہان نہ ہو تو کیا ہوگا؟

٢ مبدا اور معاد کے منکر افراد میں سے کچھ لوگ خودکشی کیوں کرتے ہیں؟

٣ روز قیامت کی عدالت اور اس دنیا کی عدالتوں میں کیا فرق ہے؟

٤ معاد پر ایمان انسان کے اعمال پر کیا اثر ڈالتا ہے؟

٥ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے بھائی عقیلؑ سے کیا فرمایا؟ انھوں نے کیا چاہا تھا اور علی علیہ السلام نے اسے کیا جواب دیا؟

تیسرا سبق

# روزِ قیامت کی عدالت کا نمونہ خود آپ کے وجود میں ہے

جہاں تک موت کے بعد زندگی اور روز قیامت کی عظیم عدالت کا تعلق ہے یہ اس محدود جہان میں قید کسی بھی انسان کے لیے ایک نئی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس عدالت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہماری اس دنیا میں بھی پیش کیا ہے جس کا نام "ضمیر کی عدالت" ہے لیکن یہ بات نہ بھولیں کہ یہ اس عدالت کا چھوٹا سا نمونہ ہے۔

اس بات کی زیادہ وضاحت یہ ہے کہ انسان جو بھی اعمال بجالاتا ہے وہ چند عدالتوں میں پیش ہوتے ہیں۔ سب سے پہلی عدالت اپنی تمام تر کمزوریوں اور نقائص کے باوجود وہی دنیا کی معمولی عدالتیں ہیں۔ اگرچہ یہی معمولی عدالتیں جرائم کی کمی میں کچھ حد تک اثر انداز ہیں۔ لیکن ان عدالتوں کی اساس ایسی ہے کہ کبھی ان سے مکمل عدالت کی اُمید نہیں رکھنی چاہیے۔

کیونکہ جب تک ان میں غیر مناسب قوانین اور خیانت کار قاضی ہوں گے تو ان کا کردار واضح ہے۔ رشوت خوریاں، پارٹی بازی، خصوصی تعلقات، سیاسی کھیل اور ہزاروں قسم کی دیگر برائیاں ان عدالتوں کو ان کے ہدف سے اس طرح دُور کردیتی ہیں کہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کا نہ ہونا ان کے ہونے سے بہتر ہے، کیونکہ ان کے ہونے سے منحرف لوگوں کے برے مقاصد پورے ہوتے ہیں۔

اور اگر عدالتوں کے قوانین عادلانہ ہوں اور قاضی حضرات بھی اہل اور متقی

ہوں پھر بھی بہت سے ایسے مجرم ہیں جو ایسی مہارت سے جرم کرتے ہیں کہ جرم کا ذرا سا بھی نشان باقی نہیں رہتا، یا عدالت میں ایسے فائل بنواتے ہیں اور یوں ناٹک رچاتے ہیں کہ قاضی بے بس ہو جائے اور قوانین بے اثر ہو جائیں۔ دوسری عدالت جو اس سے زیادہ منظم اور دقیق ہے، وہ "مکافات عمل" کی عدالت ہے۔

ہمارے ہر عمل کا ایک نتیجہ ہے جو کہ تھوڑی مدت یا لمبی مدت کے بعد بالآخر ہماری طرف پلٹ آئے گا۔ اگرچہ یہ چیز قانونِ کُلی نہیں بلکہ اکثر مقامات پر یہ بات سچ ثابت ہوتی ہے۔

ہم ایسی حکومتوں کو دیکھتے ہیں کہ جو ظلم وستم کی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں اور ان سے جو کچھ ہوتا ہے وہ کرتے ہیں لیکن آخرکار وہی جال جو وہ دوسروں کے لیے بچھاتے ہیں ان میں خود ہی پھنس جاتے ہیں۔ ان کے برے اعمال کے برے نتائج انھیں گھیر لیتے ہیں۔ وہ یوں بلندیوں سے گرتے ہیں اور نابود ہو جاتے ہیں کہ سوائے لعنت اور نفرین کے ان کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔

مکافات عمل کا اعمال سے تعلق اسی طرح ہے جس طرح علت و معلول کا باہمی تعلق، یا آگ اور حرارت کا باہمی تعلق دنیا میں بہت کم لوگ مکافاتِ عمل کی گرفت سے خاص منصوبہ بندی کی وجہ سے بچ نکلتے ہیں۔ اس عدالت میں نقص یہ ہے کہ یہ عمومی اور کُلی نہیں لہٰذا اس عدالت کے باوجود ہم روز قیامت کی عظیم عدالت سے بے نیاز نہیں ہیں۔

**تیسری عدالت جو اس سے بھی منظم اور دقیق ہے وہ "ضمیر کی عدالت ہے"**

درحقیقت جس طرح نظام شمسی کو تمام عجائب و غرائب کے ساتھ ایک چھوٹی سی شکل میں، ایک ایٹم میں دیکھا جا سکتا ہے اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ روز قیامت کی عدالت کا ایک چھوٹا سا ماڈل ہمارے وجود میں بھی ہے۔

کیونکہ انسان کے وجود میں ایک ایسی پوشیدہ طاقت ہے کہ جسے فلاسفہ "عقلِ عملی" سے تعبیر کرتے ہیں اور قرآن مجید میں اسے "نفسِ لوّامہ" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور سادہ الفاظ میں اسے "ضمیر" کہا جاتا ہے۔ ادھر انسان سے نیکی یا برائی ہوئی، فوراً بغیر کسی شور وشرابے کے یہ عدالت تشکیل پاتی ہے اور مکمل سنجیدگی اور اُصولی انداز سے اپنا کام شروع کر دیتی ہے جس کے حکم کا نتیجہ سزا کی صورت میں یا روحانی حوصلہ افزائی یعنی اجر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

کبھی یہ عدالت مجرموں کو اندر سے یوں کوڑے مارتی ہے اور انھیں ایسا روحی شکنجہ دیتی ہے کہ وہ بازو کھول کر موت کا استقبال کرتے ہیں اور اسے ایسی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں اور اپنے وصیت نامے میں لکھتے ہیں کہ اگر ہم نے خودکشی کی ہے تو صرف ضمیر کی خلش سے نجات پانے کے لیے۔

کبھی کوئی اچھا کام کرنے پر یہ عدالت انسان کی یوں حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ اس پر وجد و سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے وجود میں گہرائی تک سکون محسوس کرتا ہے۔ ایسا ناقابل بیان دل کو لبھانے والا سکون کہ جس کی لذت اور عظمت کو بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل سکتے۔ اس عدالت کی بہت ہی عجیب خصوصیات ہیں:

① اس عدالت میں قاضی، گواہ، حکم سنانے اور عدالت کی کارروائی دیکھنے والا سب ایک ہی ہے۔ وہی ضمیر کی طاقت گواہی دیتی ہے، فیصلہ کرتی ہے اور پھر آستین کھول کر حکم جاری کرتی ہے۔

② دنیا کی پُررونق عدالتوں کے برعکس کہ جہاں ایک فیصلہ ہوتے ہوتے کئی سال لگ جاتے ہیں۔ یہاں فیصلہ فوری ہوتا ہے یہاں وقت اور مدت نہیں چاہیے۔ البتہ کسی جرم کے دلائل ثابت ہونے اور دل کی نگاہ سے غفلت کے پردے اُٹھنے میں

ایک مدت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب جرم کے دلائل مل جائیں تو پھر حکم کا صدور فوری اور یقینی ہے۔

③ اس عدالت میں حکم ایک ہی مرحلہ میں صادر ہوتا ہے۔ کسی اور عدالت کی طرف رجوع، نظر ثانی اور سپریم کورٹ میں جانا وغیرہ کا اس میں کوئی وجود نہیں ہے۔

④ اس محکمہ میں صرف سزا ہی نہیں ملتی بلکہ اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح پہچاننے والوں کو اجر بھی ملتا ہے لہٰذا یہ وہ عدالت ہے کہ جہاں نیکی کرنے والے اور بدکار دونوں حاضر ہوتے ہیں اور ہر ایک کو اس کے عمل کی مناسبت سے جزا یا سزا ملتی ہے۔

⑤ اس عدالت کی سزائیں کسی بھی طرح دنیا کی سزاؤں سے شباہت نہیں رکھتیں، ظاہراً نہ کوئی قید، نہ کوڑے اور نہ تختہ دار لیکن کبھی یہ سزا اس قدر اندر سے جلاتی ہے اور ایسے قیدخانہ میں ڈال دیتی ہے کہ دنیا اپنی تمام تر وسعت کے باوجود انسان کے لیے تنگ ہوجاتی ہے۔ ایک وحشت ناک اور خوف زدہ کرنے والے قیدخانہ سے بھی تنگ۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ عدالت دنیا کی کسی قسم کی عدالتوں کے مانند نہیں ہے بلکہ قیامت کی عدالت کے مانند ہے۔

اس عدالت کی عظمت اس قدر ہے کہ قرآن نے اس کے نام کی قسم کھائی ہے اور روز قیامت کی عدالت کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ○ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ ○
اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَہٗ ○ بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی
اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ○ (سورۂ قیامہ، آیات ۱ تا ۴)

”قسم ہے قیامت کے دن کی اور قسم ہے سرزنش کرنے والے بیدار ضمیر کی، آیا انسان گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی بکھری ہوئی

ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے، کیوں نہیں ہم قادر ہیں کہ اس کی
انگلیوں کو روز اوّل کے مانند بنالیں"۔

البتہ یہ عدالت ان تمام خصوصیات کے باوجود پھر بھی دنیاوی ہے۔ کچھ ایسے نقائص رکھتی ہے کہ جس کی وجہ سے وہ ہمیں قیامت کی عدالت سے بے نیازی نہیں کرسکتی کیونکہ:

① ضمیر کی وسعت میں ہر چیز نہیں آسکتی، ہمیشہ ضمیر کی وسعت انسان کی فکر اور تشخیص کے مطابق ہوتی ہے۔

② کبھی ماہر فریبی انسان چاہے تو اپنے ضمیر کو بھی فریب دے سکتا ہے جب کہ ضرب المثل ہے کہ "ضمیر کی آنکھوں میں دھول جھونکنا"۔

③ کبھی بعض گناہ گاروں میں ضمیر کی آواز اس قدر کمزور ہوتی ہے کہ وہ نہیں سنتے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں چوتھی عدالت "قیامت کی عظیم عدالت" کی ضرورت واضح ہوجاتی ہے۔

mablib.org

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱. انسان حقیقتاً کتنی عدالتوں میں پیش ہوتا ہے؟

۲. پہلی عدالت کی خصوصیات اور اس کا نام کیا ہے؟

۳. دوسری عدالت کی خصوصیات کون کون سی ہیں؟

۴. تیسری عدالت کی کیا خصوصیات ہیں؟

۵. ضمیر کی عدالت کی خصوصیات اور نقائص شمار کریں؟

## چوتھا سبق

# فطرت کی تجلیوں میں معاد

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا شناسی انسان کی فطرت میں ہے۔ اگر کسی باضمیر انسان پر ریسرچ کریں تو اس میں ایک ایسے ماوراطبیعت خالق پر ایمان اور اس کے ساتھ انس کا جذبہ پائیں گے کہ جس نے اپنے علم، پروگرام اور ہدف کے ساتھ اس کائنات کو پیدا کیا۔ لیکن یہ بات صرف توحید اور خدا شناسی تک منحصر نہیں ہے بلکہ دین کے تمام اُصول اور بنیادی فروعی مسائل فطرت میں ہونے چاہییں، کیونکہ اس کے علاوہ تو کبھی بھی تکوینی اور تشریعی احکام میں موافقت حاصل نہیں ہوسکتی (اس نکتہ پر توجہ فرمائیں)۔

ہم اگر اپنے دلوں پر ایک نگاہ ڈالیں اور اپنی روح و جان کی گہرائیوں میں اُتریں تو ہم باطنی کانوں سے یہ روحانی زمزمہ سنیں گے کہ زندگی موت سے ختم نہیں ہوتی بلکہ موت تو عالمِ بقا کی طرف کھلنے والا دریچہ ہے۔

اس حقیقت کو صحیح طریقے سے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل نکات پر توجہ کریں۔

### بقا کے ساتھ عشق

اگر واقعاً انسان "فنا اور ختم ہونے کے لیے" پیدا کیا جاتا تو ضروری تھا کہ وہ "فنا" سے عشق کرتا۔ ایک مدت زندگی گزارنے کے بعد موت سے لذت حاصل کرتا۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ موت کی صورت (فنا کے معنی کے ساتھ) انسان کے لیے

کسی بھی دور میں نہ صرف باعث خوشی نہیں رہی بلکہ وہ اپنے تمام وجود کے ساتھ اس سے فرار کرتا رہا ہے۔ طویل عمر کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ، جوانی و طاقت کی خواہش، آب حیات کی تلاش وغیرہ ہر ایک اسی حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں۔

پس بقا کے ساتھ یہ انس اور عشق واضح کر رہا ہے کہ ہم لوگ باقی رہنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور اگر ہم ختم ہونے کے لیے پیدا کیے جاتے تو یہ بقا کے ساتھ انس اور عشق بے معنی ہوتا۔

وہ تمام بنیادی محبتیں جو ہمارے اندر ہیں وہ ہمارے وجود کو مکمل کرتی ہیں۔ اسی طرح اپنی بقا کے ساتھ عشق بھی ہمارے وجود کو مکمل کرتا ہے۔

یاد رکھیں ہم معاد کی بحث کو "پروردگار حکیم و دانا کے وجود کو قبول کرنے کے بعد کر رہے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ جو کچھ اس نے ہمارے وجود میں پیدا کیا ہے اس میں حکمت پوشیدہ ہے۔ اسی لیے انسان کا اپنی بقا کے ساتھ انس بھی حکمت رکھتا ہے اور وہ حکمت "اس جہان کے بعد ایک اور جہان میں وجود" کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتی۔

## گذشتہ اقوام میں موت کے بعد زندگی کا تصور

جس طرح انسانی تاریخ گواہی دیتی ہے کہ زمانہ قدیم سے گذشتہ اقوام میں مذہب کسی نہ کسی انداز میں موجود رہا ہے۔ اسی طرح زمانہ قدیم سے "موت کے بعد انسانی زندگی" کے عقیدے کی موجودگی پر بھی گواہی دیتی ہے۔

قدیم دور کے انسانوں بلکہ تاریخ سے ماقبل کے انسانوں کے آثار قدیمہ میں مُردوں کی مخصوص طرز کی قبریں اور ان کے دفن کے طریقے یہ سب اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ وہ موت کے بعد زندگی پر ایمان رکھتے تھے۔

یہ ایک ایسا عقیدہ ہے کہ جس کی جڑیں ہمیشہ انسانوں میں رہی ہیں۔ اسے

محض ایک سادہ سی بات یا ایک عادت یا ایک تلقین نہیں لیا جاسکتا۔ ہمیشہ جب بھی کسی عقیدہ کو بطور راسخ اور پوری تاریخ میں ہر انسانی معاشرے میں پائیں تو یہ اس کے فطری ہونے کی دلیل ہے۔ چونکہ تنہا فطرت ہی وہ چیز ہے جو گزرتے اُدوار اور معاشرتی وفکری تغیرات کے مقابلے میں ثابت قدم رہ سکتی ہے ورنہ عادت، رسم اور تلقین زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بھلا دی جاتی ہیں۔ مثلاً فلاں طرح کا لباس پہننا یا تو ایک عادت ہے یا آداب ورسوم کا ایک حصّہ ہے۔ لہٰذا یہ چیز ماحول کی تبدیلی یا زمانے کے گزرنے کے ساتھ تبدیل ہوجاتی ہے۔

لیکن ماں کی بچے کے ساتھ محبت ایک غریزہ فطری ہے لہٰذا نہ تو ماحول کی تبدیلی اس محبت کی تپش کو کم کرسکتی ہے اور نہ گزرتے زمانے کی گردوغبار اس کے بھلانے کا سبب بن سکتی ہے۔ پس جو بھی اندرونی کشش اس صورت میں جلوہ گر ہو تو یہ اس کے انسانی فطرت کا حصّہ ہونے کی دلیل ہے۔

جب دانشور یہ کہتے ہیں: ”گہری تحقیقات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسانوں کے ابتدائی ترین گروہ بھی کسی نہ کسی مذہب کے پیرو تھے کیونکہ وہ اپنے مُردوں کو خاص انداز سے دفن کرتے تھے۔ ان کے کام کرنے کے آلات ان کے نزدیک رکھتے تھے اور اس طریقے سے دوسری دنیا کے وجود پر اپنے عقیدے کو ثابت کرتے تھے (”جامعہ شناسی“، Sociology گینگ، ص ۱۹۲)۔ تو ہم اچھی طرح جان لیں گے کہ یہ قومیں موت کے بعد کی زندگی کو قبول کرچکی تھیں۔ اگرچہ وہ اس عقیدہ میں غلط راہ پر چل پڑے اور انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ زندگی بالکل اسی زندگی کے مشابہہ ہے اور وہاں ان وسائل وآلات کی ضرورت ہوگی۔

انسان کے اندر پایا جانے والا محکمہ احتساب بنام ”ضمیر“ معاد کے فطری ہونے پر ایک اور گواہ ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا تھا کہ ہم سب اچھی طرح یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اندر کی "عدالت" ہمارے اعمال کی جانچ پڑتال کرتی ہے۔ نیکیوں کے بدلے جزا دیتی ہے تو اس وقت اس قدر اپنے اندر سکون کا احساس کرتے ہیں اور ہماری روح خوشی و نشاط سے لبریز ہو جاتی ہے کہ یہ لذت کسی بھی انداز سے ناقابل بیان اور ناقابل تحریر ہے اور یہ عدالت برے کاموں پر خصوصاً بڑے گناہوں پر اس قدر سزا دیتی ہے کہ انسان کی زندگی ہر حوالے سے تلخ ہو جاتی ہے۔

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ ایک جرم مثلاً قتل کا ارتکاب کرنے اور اس کے بعد عدالت کی گرفت سے فرار ہونے کے بعد عدالت میں اقرار کے لیے حاضر ہو جاتے ہیں اور اپنی پہچان کرواتے ہیں اور تختۂ دار پر چڑھ جاتے ہیں۔ اس چیز کی دلیل وہ ضمیر کے شکنجے سے نجات پانا ذکر کرتے ہیں۔

انسان اپنے اندر اس عدالت کا مشاہدہ کرنے کے بعد اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے میں ایک معمولی وجود رکھنے والا انسان اپنے اندر ایسی عدالت رکھوں اور اتنا بڑا عالم، یہ جہانِ خلقت ایسی عدالت کا حامل نہ ہو جو اس کے مناسب ہو؟

اسی ترتیب سے تین راہوں سے معاد اور موت کے بعد زندگی کے عقیدہ کے فطری ہونے کو ثابت کیا جا سکتا ہے:

۔۔۔ بقا سے عشق کے ذریعے۔

۔۔۔ تاریخ عالم میں اس پر ایمان کے پائے جانے سے۔

۔۔۔ اور انسان کے وجود میں اس کے چھوٹے سے نمونہ کے پائے جانے سے۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ کس طرح فطری اُمور کو غیر فطری اُمور سے جدا کیا جا سکتا ہے؟

۲ انسان بقا کے ساتھ کیوں عشق کرتا ہے؟ اور یہ بقا کے ساتھ عشق کس طرح معاد کے فطری ہونے پر دلیل ہے؟

۳ آیا گذشتہ اقوام بھی معاد پر ایمان رکھتی تھیں؟

۴ ضمیر کی عدالت ہمیں جزا یا سزا دیتی ہے؟ کس دلیل کے ساتھ؟ اس کے چند نمونوں کی تشریح کریں؟

۵ ضمیر کی عدالت اور قیامت کی عظیم عدالت کے درمیان کیا ربط موجود ہے؟

maablib.org

پانچواں سبق

# قیامت عدل کے ترازو میں

کائنات کے نظام اور قوانین تخلیق میں تھوڑی سی دقت کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ قانون کی حکمرانی ہے اور ہر چیز اپنے مقام پر موجود ہے۔ انسانی بدن میں ہر عادلانہ نظام اتنی ظرافت کے ساتھ جاری ہے کہ اس میں معمولی سی غیر موضوع تبدیلی بیماری یا موت کا باعث بن جاتی ہے۔

مثلاً آنکھ، دل اور مغز میں ہر چیز بالکل اپنی جگہ پر موجود ہے۔ اسی انداز سے یہ عدالت اور نظم نہ صرف انسانی بدن کی ساخت میں بلکہ پورے جہان آفرینش میں حاکم ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ:

بالعدل قامت السموات والأرض

"عدل کی وجہ سے تمام آسمان اور زمین قائم ہیں"۔

ایک ایٹم اس قدر چھوٹا ہے کہ کروڑوں ایٹموں کو سوئی کی نوک پر اکٹھا کیا جاسکتا ہے۔ ذرا سوچئے اس کا جسم کس قدر دقیق اور منظم ہوگا کہ کروڑوں برسوں تک اپنی زندگی کو قائم رکھتا ہے۔ یہ نظم الیکٹرونوں اور پروٹونوں کے دقیق نظام میں غیر معمولی حساب کتاب اور عدالت کی وجہ سے ہے۔ کوئی بھی چھوٹا اور بڑا وجود اس حیران کن نظام سے باہر نہیں ہے۔

آیا واقعاً انسان ایک منفرد وجود ہے؟ یا اس وسیع جہان میں ایک اجنبی پیوند ہے کہ آزاد رہے اور جو کچھ بھی چاہے بے نظمی، ظلم اور بے عدالتی اس کا ارتکاب

کرے؟ یا یہاں کوئی نکتہ پوشیدہ ہے؟

## اختیار اور ارادہ کی آزادی

حقیقت یہ ہے کہ انسان کائنات کے تمام موجودات کے ساتھ ایک اساسی و بنیادی امتیاز رکھتا ہے اور وہ انسان کا ''اختیار اور ارادہ کی آزادی'' کا حامل ہونا ہے۔ خدا نے اسے آزاد کیوں پیدا کیا؟ اور کسی چیز کے ارادہ کا حق اسے کیوں دیا ہے تا کہ وہ جو چاہے اسے کرے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ آزاد نہ ہوتا تو کمال کی منزل نہ پاتا۔ یہ بہت بڑی خصوصیت اس کے اخلاق اور معنویت کے کمال کی ضامن ہے، مثلاً اگر کسی کو نیزے کی نوک سے دھکیل کر مساکین کی مدد پر یا معاشرہ کے دوسرے اُمور خیر پر مجبور کیا جائے تو اگرچہ یہ نیک کام ہونا شروع ہو جائیں گے لیکن اس میں مدد کرنے والے کے لیے کسی قسم کا اخلاقی اور انسانی کمال حاصل نہیں ہوگا۔

حالانکہ اگر وہ اپنے ارادہ اور رغبت کے ساتھ ان کاموں کا ایک فی صد حصّہ انجام دیتا تو اسی قدر وہ اخلاقی اور معنوی کمال کی راہوں میں قدم بڑھاتا۔ اسی لیے اخلاق اور معنوی کمال کی پہلی شرط اختیار اور ارادہ کی آزادی رکھنا ہے، یعنی انسان بذات خود اپنے پاؤں پر یہ راہ طے کرے نہ کہ مجبوری سے۔ جیسا کہ کائنات کے نظام مادہ میں اسباب و مسببات کا جبری نظام حاکم ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار جیسی عظیم نعمت بخشی ہے تو صرف اسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے ہے لیکن یہ عظیم نعمت اس پھول کے مانند ہے کہ جس کے گرد کانٹے بھی اُگ آئے ہیں اور وہ لوگوں کا اس نعمت آزادی سے غلط فائدہ اُٹھانا اور ظلم و فساد اور گناہ سے آلودہ ہونا ہے۔

البتہ خدا کے لیے کوئی مانع نہیں کہ اگر انسان ظلم و ستم سے اپنے ہاتھوں کو آلودہ کرے تو وہ اسے ایسے عذاب میں مبتلا کرے کہ پھر وہ کبھی ایسا نہ سوچے

(مثلاً) اس کے ہاتھوں پر فالج ہو جائے۔ اس کی آنکھیں بے نُور ہو جائیں، اس کی زبان کام کرنا چھوڑ دے۔ ایسی صورت میں درست ہے کوئی بھی آزادی سے ناجائز فائدہ نہیں اُٹھائے گا اور گناہ کے پیچھے نہیں جائے گا۔ لیکن پھر پرہیزگاری اور تقویٰ کی حیثیت محض جبری ہوگی اور یہ تقویٰ انسان کے لیے کسی بھی قسم کا کمال شمار نہیں ہوگا کیونکہ یہ سب نیکیاں اس شدید اور بغیر کسی وقفہ کے فوری نازل ہونے والی سزا کے خوف سے ہوں گی۔

لہٰذا انسان کو ہر حال میں آزاد رہنا چاہیے اور پروردگار کی طرف سے آنے والے مختلف امتحانوں کا سامنا کرنا چاہیے اور اسے فوری عذاب سے سوائے چند موارد کے محفوظ رہنا چاہیے تاکہ وہ خود اپنے ذاتی کمالات کو ظاہر کر سکے۔

لیکن یہاں ایک چیز باقی رہ گئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر معاملہ یونہی رہے اور ہر کوئی اپنے لیے راستہ منتخب کرے تو یہ چیز کائنات پر حاکم اللہ کی عدالت کے قانون کے خلاف ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر ہمیں یقین ہونا چاہیے کہ انسان کے لیے ایک ایسی عدالت اور محکمہ بنایا گیا ہے کہ جہاں سب بغیر کسی استثناء کے حاضر ہوں گے اور اپنے اعمال کی جزا پائیں گے اور جہانِ آفرینش کی عمومی عدالت سے اپنا حصّہ وصول کریں گے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ دنیا کے تمام نمرود، فراعنہ، چنگیز اور قارون ظلم و ستم میں ایک عمر مشغول رہیں اور ان کا کوئی حساب و کتاب نہ ہو؟ آیا ممکن ہے گناہ گار اور پرہیزگار پروردگار کے میزانِ عدالت کے پلڑے میں ایک حیثیت کے حامل ہوں؟

بقول قرآن کے:

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ○ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ○ (سورہ قلم: آیت ۳۵-۳۶)

"کیا ہم مسلمانوں کو مجرمین جیسا بنا دیں گے؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟

ایک اور مقام پر قرآن کہتا ہے:

اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّارِ (سورۂ ص: آیت ۲۸)

"آیا (ممکن ہے کہ ہم) اہلِ تقویٰ کو بدکاروں کی طرح قرار دیں"۔

درست ہے کہ بعض گناہگار اس جہان میں ہی مکافات عمل کے ذریعے سے اپنے برے اعمال کی سزا پا لیتے ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ ضمیر کی عدالت بھی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے، اور یہ بھی درست ہے کہ گناہ اور ظلم وستم کا ردعمل اور بے عدالتی کے برے نتائج بھی خود ہی انسان کے دامن کو گھیر لیتے ہیں۔

لیکن اگر ہم صحیح دقت کریں تو دیکھیں گے کہ ان تینوں چیزوں میں سے کوئی بھی اتنی عمومی اور کلی نہیں کہ ہر ظالم اور گناہ گار کو اس کے جرم کے مطابق سزا ملے۔ بہت سے ایسے ظالم ہیں جو مکافات عمل، ضمیر کی عدالت اور برے نتائج کے پنجوں سے فرار کر جاتے ہیں یا کافی حد تک سزا نہیں ہوتی۔

اس قسم کے افراد اور دیگر تمام لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ ایسا محکمہ عدل ہو کہ جہاں سوئی کی نوک کے برابر اچھے اور برے کام کی پڑتال ہو ورنہ حقیقی عدالت حاصل نہ ہوگی۔

پس اسی لیے خدا کے وجود اور اس کی عدالت کو قبول کرنا قیامت کے قبول کرنے کے مساوی ہے۔ یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ آسمان اور زمین کس طرح عدل کے ساتھ قائم ہیں؟

۲ انسان کو ارادہ اور اختیار کی آزادی کی نعمت کیوں دی گئی ہے؟

۳ اگر بدکار افراد اسی جہان میں اپنے اعمال کی شدید اور فوری سزا کو پالیں گے تو کیا ہوگا؟

۴ مکافات عمل، ضمیر کی عدالت اور اعمال کے برے نتائج ہمیں قیامت کی عدالت سے بے نیاز کیوں نہیں کرسکتے؟

۵ پروردگار کی عدالت اور مسئلہ معاد کے درمیان کیا تعلق ہے؟

چھٹا سبق

# موت کے بعد کی زندگی اسی جہان میں کئی دفعہ مشاہدہ ہو چکی ہے؟

قرآنی آیات بخوبی اس حقیقت کو واضح کر رہی ہیں کہ بت پرست اور تمام کفار نہ صرف زمانہ پیغمبرؐ بلکہ تمام اَدوار میں معاد اور موت کے بعد زندگی کے مسئلے پر حیرت کا شکار اور وحشت زدہ رہے ہیں یہاں تک کہ جو بھی اس کا قائل ہوتا اسے مجنون کے لقب سے پکارتے تھے اور ایک دوسرے کو کہتے تھے:

هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ○ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ

"کیا ہم تمھیں ایک ایسے آدمی کا پتا بتائیں جو تمھیں یہ خبر دیتا ہے کہ جب تم مکمل طور پر پارہ پارہ ہو جاؤ گے تو بلاشبہ تم نئی خلقت پاؤ گے؟ اس نے اللہ پر جھوٹ، بہتان باندھا ہے یا اسے جنون لاحق ہے؟" (سورۂ سبا: آیت ۷-۸)

جی ہاں! اس روز جہالت اور افکار کی تنگ نظری کی وجہ سے موت کے بعد کسی جہان پر عقیدہ اور مُردوں کا زندہ ہونا ایک قسم کا جنون یا خدا پر تہمت محسوب ہوتا تھا اور بے جان مادہ (وہ جسم جو مرنے کے بعد مٹی ہو چکا ہو) سے چشمۂ حیات کے جاری ہونے کا عقیدہ دیوانگی کہلاتا تھا۔

لیکن جالب بات یہ ہے کہ قرآنِ مجید نے اس قسم کے انکار کا مختلف دلائل کے ساتھ مقابلہ کیا ہے کہ عام لوگ بھی ان سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور بڑے بڑے صاحبانِ نظر بھی۔ غرض یہ کہ ہر کوئی اپنی فکری استطاعت کے مطابق ان سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔

اگرچہ ان تمام قرآنی دلائل کی تشریح کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے لیکن ہم ان دلائل کے کچھ حصوں کو یہاں پر بیان کرتے ہیں:

۱ کبھی قرآن انھیں کہتا ہے کہ تم ہمیشہ اپنی آنکھوں سے روزانہ کی زندگی میں معاد کے مختلف مناظر دیکھتے ہو کہ کس طرح بعض موجودات مرتے ہیں اور پھر زندہ ہوتے ہیں۔ پھر بھی معاد کے مسئلہ میں شک و تردید کا شکار ہو؟

وَ اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ

"اور اللہ ہی ہواؤں کو بھیجتا ہے تو وہ بادل کو اُٹھاتی ہیں پھر ہم اسے ایک اُجاڑ شہر کی طرف لے جاتے ہیں۔ پھر ہم اس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح (قیامت کے دن) اُٹھنا ہوگا"۔ (سورۂ فاطر: آیت ۹)

موسمِ سرما میں طبیعت کے رُخ پر نظر ڈالیں تو ہر جگہ موت کی بُو محسوس ہوگی۔ درخت، پتوں، پھولوں اور پھلوں سے بالکل خالی ہو جاتے ہیں۔ بے حرکت خشک لکڑیاں اپنی جگہ پر باقی رہ جاتی ہیں۔ نہ کوئی پھول مسکراتا ہے، نہ کوئی کلی کھلتی ہے، نہ میدانوں اور پہاڑوں میں زندگی کی حرارت نظر آتی ہے۔

جیسے جیسے موسمِ بہار آتا ہے ہوا میں ملائمت پیدا ہو جاتی ہے۔ بارش کے حیات بخش قطرات نازل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ طبیعت کروٹ بدلتی

ہے۔ پودے اُگنے شروع ہو جاتے ہیں۔ درخت پتے نکالتے ہیں۔ پھول اور کلیاں کھلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ پرندے درختوں کی شاخوں پر پھدکنا شروع ہو جاتے ہیں اور ہر طرف ایک محشر کا شور بپا ہو جاتا ہے۔

اگر موت کے بعد زندگی کا کوئی مفہوم نہ ہوتا تو ہم ہر سال یہ منظر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتے۔ اگر موت کے بعد زندگی ایک ناممکن یا جنون آمیز بات ہوتی تو یہ چیز محسوس صورت میں ہماری آنکھوں کے سامنے بار بار نہ آتی۔

آخر کیا فرق ہے۔ زمین کے مُردہ ہونے کے بعد زندہ ہونے میں اور انسان کے مرنے کے بعد زندہ ہونے میں؟

کبھی قرآن ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے آغازِ تخلیق کے مراحل کی طرف لے جاتا ہے اور سب سے پہلی تخلیق کی یاد دلاتا ہے۔ اس صحرائی بدو عرب کو جو بوسیدہ ہڈیوں کا ٹکڑا ہاتھ میں لیے ہوئے پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور پکار کر کہتا ہے: اے محمدؐ! کون قادر ہے کہ اس بوسیدہ ہڈی کو زندہ کرے؟ مجھے بتاؤ کون یہ کرسکتا ہے؟ وہ یہ گمان کرتا تھا کہ اس کے پاس مسئلہ معاد کے خلاف دندان شکن دلیل ہے۔ قرآنِ مجید پیغمبر خداؐ کو حکم دیتا ہے:

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ

"کہیے وہی اسے زندہ کرے گا جس نے اس (بے جان مادہ) کو (اسی پانی اور مٹی سے) شروع میں خلق کیا"۔ (سورۂ یٰسین: آیت ۷۹)

کسی چیز کو ابتدا میں پیدا کرنے اور دوبارہ پیدا کرنے میں کیا فرق ہے؟ لہٰذا دوسری آیات میں ایک چھوٹے اور پُرمعنی جملہ میں یوں فرماتا ہے:

كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ

''جس طرح ہم نے شروع میں پیدا کیا اسی طرح پھر لوٹا دیں گے''۔ (سورۂ انبیاء: آیت ۱۰۴)

کبھی قرآن مجید پروردگار کی عظیم قدرت کو زمین و آسمان کی خلقت کے حوالے سے یاد کرواتا ہے کہ آیا وہ خدا کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ قادر نہیں کہ ان جیسوں کو پیدا کرے؟ ہاں (وہ اس کام پر قادر ہے) اور وہ پیدا کرنے والا آگاہ ہے، وہ جب بھی کسی چیز کے بارے میں ارادہ کرتا ہے اسے حکم دیتا ہے ہوجا، وہ ہوجاتی ہے۔ (سورۂ یٰسین: آیات ۸۱-۸۲)

ان مسائل میں تردید کا شکار ایسے افراد تھے کہ جن کی فکر کی وسعت ان کے چھوٹے سے معمولی گھر کے احاطہ سے زیادہ نہیں تھی، وگرنہ وہ جان لیتے کہ دوبارہ پیدا ہونا آغاز خلقت (پہلی دفعہ پیدا ہونے) سے زیادہ آسان ہے۔ مردوں کو دوبارہ زندہ کرنا ایسے خدا کی قدرت کے سامنے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے۔

قرآن کبھی موت کے بعد زندگی کی طاقتوں کو ان کی نگاہوں میں مجسم کرتا ہے اور فرماتا ہے: ''دیکھو اس پروردگار کو جس نے سرسبز درخت اور شجرۂ اخضر سے آگ کو خلق کیا وہ قادر ہے کہ انسانوں کو موت کے بعد زندہ کرے''۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ○ (سورۂ یٰسین: آیت ۸۰)

''وہی ہے جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی پھر تم اس سے آگ سلگاتے ہو''۔

جب ہم قرآن مجید کی اس عجیب و غریب تعبیر میں دقت کرتے ہیں اور جدید علوم سے مدد لیتے ہیں تو آج کا علم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جب ہم کسی درخت کی خشک

لکڑی کو جلاتے ہیں اور اس سے آگ اور حرارت حاصل کرتے ہیں تو یہ حرارت اور گرمی وہی سورج کی شعاعیں، حرارت اور انرجی (Energy) ہے کہ جو اس طویل عرصے میں وہاں ذخیرہ ہوتی رہی۔ ہم نے سمجھ لیا کہ وہ شعاع اور حرارت ختم ہو چکی ہے لیکن آج جب ہم لکڑی کو جلاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ حرارت نئے سرے سے جان حاصل کر رہی ہے اور زندگی کا ایک نیا لباس پہن لیتی ہے۔ آیا اس خدا کے لیے کہ جو یہ قدرت رکھتا ہے کہ برسوں کی کئی دہائیوں سے سورج کی شعاعوں اور حرارت کو ایک درخت کے جسم میں ذخیرہ کرے اور ایک لحہ میں اس تمام حرارت کو اس جسم سے باہر لے آئے تو کیا اس کے لیے مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنا مشکل کام ہے؟

بہر حال ہم دیکھ رہے ہیں کہ قرآن نے کیسے روشن اور استدلالی منطق سے ایسے لوگوں کو دندان شکن جواب دیا ہے کہ جنھوں نے مسئلہ معاد پر شک و تردید کا اظہار کیا اور اس کا دعویٰ کرنے والوں کو دیوانہ سمجھا اور قرآنِ مجید نے واضح انداز سے معاد کے امکان کو ثابت کیا ہے کہ جس کا کچھ حصّہ اُوپر بیان کیا جا چکا ہے۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ مشرکین مسئلۂ معاد پر حیرت کا اظہار کیوں کرتے تھے؟

۲ ہم نباتات کی دنیا میں معاد کے منظر کو ہر سال اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں؟ وضاحت کریں۔

۳ قرآن مجید اپنی بعض آیات میں جنین کی زندگی کے مراحل کو معاد پر دلیل قرار دیتا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟

۴ موت کے بعد زندگی کی طاقتیں کون سی ہیں؟

۵ قرآن نے ''الشجر الاخضر'' (سبز درخت) سے استدلال کیوں کیا ہے؟

madblib.org

ساتواں سبق

# معاد اور فلسفہ، تخلیق

بہت سے لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کس لیے پیدا کیا ہے؟ کبھی اس سے بڑھ کر کہتے ہیں کہ بالآخر اس وسیع و عریض جہان کی تخلیق کا فلسفہ کیا ہے؟ کسان اور باغبان درخت کو پھل کے لیے اُگاتا ہے اور زمین کو فصل کے لیے تیار کرتا ہے اور بیج بوتا ہے تو تخلیق کے باغبان نے ہمیں کس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے؟

آیا خدا کے پاس کوئی کمی تھی کہ جس کا جبران ہمیں تخلیق فرما کر کیا ہے؟ تو اس صورت میں وہ محتاج کہلائے گا۔ احتیاج رکھنا پروردگار کے مقام اور اس کے لامحدود وجود کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

اس سوال کے جواب میں بہت سی باتیں ہیں لیکن چند جملوں میں اس واضح جواب کا خلاصہ کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی صفات کا اپنی ذات کے ساتھ قیاس کرتے ہیں۔ ہم چونکہ محدود سے وجود کے مالک ہیں لہٰذا جو بھی کرتے ہیں اپنی کمی کو پورا کرنے کے لیے کرتے ہیں (مثلاً) درس پڑھتے ہیں کہ علم کی کمی پوری ہو۔ کام کرتے ہیں کہ مالی پریشانی ختم ہو، علاج و معالجہ کرواتے ہیں کہ صحت و سلامتی حاصل ہو۔

لیکن پروردگار کی طرف سے کہ جو ہر جہت سے لامحدود ہے کوئی کام ہوتا ہے تو ہم اس کام کے ہدف کو اس کی ذات سے قطع نظر دوسرے موجودات میں

ڈھونڈیں گے، وہ اس لیے پیدا نہیں کرتا کہ اسے فائدہ حاصل ہو بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے بندوں پر اپنی بے شمار نعمتوں کو نازل کرے۔

وہ بے انتہا روشنیوں سے روشن آفتاب ہے کہ جو بغیر کسی ضرورت اور محتاجی کے اپنا نُور پھیلا رہا ہے تاکہ سب اس کے نُورانی وجود سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ اس لامحدود اور پُرفیض ذات کا کرم ہے کہ وہ مخلوقات کا ہاتھ پکڑے انھیں کمال کی راہوں میں آگے سے آگے لے جارہی ہے۔

عدم سے جہان رنگ و بُو میں آنا بذاتِ خود راہِ کمال میں پہلا قدم تھا۔ پیغمبروںؑ کا آنا، آسمانی کتابوں کا نزول اور قوانین شریعت کی تعیین اور اجرا یہ سب کے سب ہماری راہ کمال کے مراحل شمار ہوتے ہیں:

—— یہ جہان بہت بڑی یونیورسٹی ہے اور ہم اس کے طالب علم!

—— یہ جہان تیار شدہ کھیت ہے اور ہم اس کے کاشت کار!

—— یہ جہان منفعت بھری منڈی ہے اور ہم اس کے تاجر!

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم انسان کی خلقت کے لیے کسی بھی ہدف کے قائل نہ ہوں؟ حالانکہ جب ہم اردگرد بغور نگاہ کریں اور موجودات کے ذرہ ذرہ کی چھان بین کریں تو دیکھیں گے کہ ہر ایک کوئی نہ کوئی ہدف لیے ہوئے ہے۔

ہمارے بدن کی عجیب وغریب ورکشاپ میں کوئی چیز بے ہدف نہیں ہے حتیٰ کہ ہماری آنکھوں کی پلکیں اور ہمارے پاؤں کے درمیان خلا بھی! آخر کیسے ہوسکتا ہے کہ ہمارے وجود کی عمارت کا ہر ذرہ ہدف کے تحت ہو لیکن ہمارا مکمل وجود بے ہدف ہو؟!

اپنے وجود سے باہر آئیں، اس عظیم کائنات پر نظر دوڑائیں۔ ہر چیز کو اپنے اپنے جدا ہدف کے ساتھ دیکھیں گے۔ سورج کی حرارت ایک ہدف کے تحت ہے،

برسات کی بارش ایک ہدف کے تحت ہے۔ ہوا کا مخصوص آمیزہ ایک ہدف کے ساتھ ہے لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ یہ مکمل جہان بغیر کسی ہدف کے ہو۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس وسیع و عریض جہان کے دل میں ہدف کی وضاحت کے لیے بہت بڑا بورڈ نصب ہے کہ کبھی اس کی وسعت کی وجہ سے ہم شروع میں اسے نہیں دیکھ پاتے اور اس پر یہ لکھا ہوا ہے: ''تربیت اور تکامل''۔

اب جب کہ اپنی تخلیق کے ہدف سے کچھ حد تک ہم آشنا ہو چکے ہیں تو بات یہ ہے کہ آیا دنیا کی یہ چند روزہ زندگی اپنی تمام تر مشکلات، مصیبتوں اور ناکامیوں کے باوجود ہماری تخلیق کا ہدف قرار پا سکتی ہے؟ فرض کریں میں ساٹھ سال اس دنیا میں زندگی گزارتا ہوں۔ ہر روز صبح سے شام تک روزی کی تلاش میں کام کرتا ہوں اور رات کو تھکا ماندہ گھر کو لوٹتا ہوں جس کے نتیجے میں اپنی اس طولانی عمر میں چند ٹن غذا اور پانی صرف کرتا ہوں۔ بہت ہی زحمتوں اور مشکلات سے ایک گھر بناتا ہوں اور پھر اس کو اسی جگہ چھوڑ کر اس جہان سے چلا جاتا ہوں۔ یہ ہدف اس قدر اہم تھا کہ ''مجھے درد و رنج سے پُر زندگی کی طرف بھیجا گیا''۔ جس طرح اگر کوئی انجینئر کسی صحرا کے وسط میں عظیم الشان عمارت بنائے، سالہا سال اس کی تکمیل و تنظیم میں کوشش کرتا رہے اس کے لیے ہر ضرورت کی چیز فراہم کرے اور جب اس سے سوال کیا جائے کہ تمہارا اس عمارت کو بنانے کا مقصد کیا ہے؟

وہ کہے کہ میرا ہدف یہ ہے کہ جب تک یہ عمارت قائم رہے کوئی ادھر سے گزرے اور اس میں ایک ساعت آرام کرے۔

کیا سب تعجب کرتے ہوئے ہم یہ نہیں کہیں گے کہ گزرنے والے مسافر کے ایک ساعت کے آرام کے لیے اس قدر زحمتوں اور محنت کی ضرورت نہیں ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو موت کے بعد کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے

وہ اس دنیا کی زندگی کو فضول سمجھتے ہیں اور ایسے کلمات مادہ پرست لوگوں (خدا پر ایمان نہ رکھنے والے) کی گفتگو میں بکثرت پائے جاتے ہیں کہ "یہ جہان بے ہدف ہے!" حتیٰ کہ ان میں سے کچھ لوگ خودکشی کر لیتے ہیں کیونکہ وہ اس یکساں مادی زندگی سے جو کہ ان کے خیال میں بے ہدف ہے، تھک جاتے ہیں۔

وہ چیز جو اس زندگی کو باہدف اور بامقصد بناتی ہے اور اسے معقول اور باحکمت قرار دیتی ہے وہ یہ ہے کہ "یہ زندگی کسی اور جہان کا مقدمہ (یعنی ابتدائی مرحلہ) ہو اور اس زندگی کی تمام مشکلات کو برداشت کرنا اور یہ سب زحمات ایک ابدی زندگی کے حصول کی خاطر ہو۔

یہاں اسی جالب سی مثال کا ذکر مناسب ہے کہ جو پہلے ذکر کی جاچکی ہے وہ یہ کہ اگر شکم مادر میں کسی ایسے جنین سے کہا جائے جو کافی حد تک عقل و شعور کا حامل ہو کہ یہ زندگی جو تم گزار رہے ہو اس کے بعد کچھ نہیں ہے۔

یقیناً وہ اپنی زندگی پر اعتراض کرے گا اور کہے گا: "اس کا کیا مطلب ہے کہ میں اسی جگہ پہ قید رہوں؟ خون میری غذا ہو اور ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ایک گوشہ میں پڑے ہوں اور اس کے بعد کچھ بھی نہ ہو؟ خالق کا میری اس تخلیق سے کیا ہدف ہے؟!" لیکن اگر اسے اطمینان دلایا جائے کہ یہ چند مہینے ایک عارضی مرحلہ ہے اور دنیا کی لمبی زندگی گزارنے کے لیے تیار ہونے کا زمانہ ہے۔ ایک ایسے جہان میں جانے کے لیے جو اس جنین کے جہان سے وسیع، روشن اور باعظمت ہے۔ اس سے بڑھ کر وہاں عنایات اور نعمات ہیں تو اس وقت وہ قانع ہو جائے گا کہ یہ زمانہ جنین ایک قابل توجہ ہدف کے لیے ہے۔ لہٰذا اس ہدف کی خاطر اس کے لیے یہ سب کچھ قابل برداشت ہوگا۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ

''اور بتحقیق پہلی پیدائش کو تم جان چکے ہو پھر تم عبرت حاصل کیوں نہیں کرتے''۔ (سورۂ واقعہ: آیت ۶۲)

خلاصہ یہ ہے کہ یہ جہان اپنے تمام وجود کے ساتھ پکار رہا ہے کہ اس کے بعد ایک اور جہان ہے ورنہ وہ لغو، فضول اور بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ یہ بات قرآنِ مجید کی زبان سے سنیے کہ فرما رہا ہے:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ

''کیا تم گمان کرتے ہو کہ تمہیں ہم نے فضول پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹو گے''۔ (سورۂ مومنون: آیت ۱۱۵)

اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ''معاد جس کو قرآن نے خدا کی طرف لوٹنے سے تعبیر کیا ہے'' نہ ہو تو انسان کی خلقت بالکل فضول ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ فلسفۂ خلقت صاف صاف کہہ رہا ہے کہ اس جہان کے بعد ضروری ہے کہ ایک اور جہان ہو۔

maablib.org

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ پروردگار کی صفات کا مخلوق کی صفات کے ساتھ مقایسہ کیوں نہیں کیا جا سکتا؟

۲ ہماری خلقت کا ہدف کیا تھا؟

۳ آیا اس جہان کی زندگی انسان کی خلقت کا ہدف ہو سکتی ہے؟

۴ زمانہ جنین کی زندگی اور اس جہان کی زندگی کا مقایسہ ہمیں کیا سکھاتا ہے؟

۵ قرآن اس جہان کی خلقت سے آخرت کے وجود پر کیسے استدلال کرتا ہے؟

**اٹھواں سبق**

# روح کی بقا موت کے بعد زندگی کی علامت

کوئی بھی نہیں جانتا کہ انسان نے کس زمانے سے "روح" کے وجود کے بارے میں فکر شروع کی۔ صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ انسان نے شروع ہی سے اپنے اور اس جہان کے دوسرے موجودات کے درمیان فرق دیکھا ہے۔ اس کے اور پتھر، لکڑی، پہاڑ اور صحرا کے درمیان فرق اور اس کے دوسرے حیوانات کے درمیان فرق۔

انسان نیند کی حالت کو دیکھ چکا ہے اور اسی طرح موت کی حالت کو بھی وہ دیکھ رہا ہے کہ سونے یا مرنے کی حالت میں جسم و مادہ میں بہت بڑی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ یہیں سے وہ سمجھتا ہے کہ جسم کے علاوہ ایک اور گوہر بھی اس کے اختیار میں ہے (کہ جو تبدیل نہیں ہوتا)۔

نیز یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ وہ حیوانات سے مختلف ہے، کیونکہ وہ اپنے ارادہ میں آزاد اور بااختیار ہے جبکہ حیوانات اپنی حرکات میں فطری و غریزہ حیوانی کی وجہ سے مجبور ہیں۔

بالخصوص خواب کی حالت میں مختلف مناظر دیکھنا جبکہ بدن کے تمام اعضاء ساکت ہوتے ہیں۔ یہ اس بات پر شاہد ہے کہ ایک اور مخفی طاقت اس کے وجود پر مسلط ہے کہ جسے "روح" کہا جاتا ہے۔

جب سے جہانِ بشر کے مفکرین نے علم فلسفہ کی بنیاد رکھی ہے۔ انھوں نے "روح" کو دوسرے فلسفی مسائل کے ساتھ ایک اہم مسئلہ بیان کیا ہے، یہاں تک

کہ بقول بعض مفکرین اسلامی اب تک روح کی حقیقت اور اس کے متعلق دوسرے مسائل کے حوالے سے تقریباً "ایک ہزار اقوال و نظریات" سامنے آچکے ہیں۔ اگرچہ یہاں بحث بہت زیادہ ہے لیکن اہم ترین چیز جس کا جاننا ہماری نظر میں ضروری ہے اس سوال کا جواب ہے کہ:

آیا روح مادی ہے یا غیر مادی؟ یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ روح ایک مستقل چیز ہے یا دماغ اور اعصاب کے سلسلے کے مادی اور کیمیائی خواص میں سے ہے؟

مادی مکاتب کے فلاسفہ کا ایک گروہ اس بات پر مصر ہے کہ روح اور اس کے متعلق اشیاء مادی ہیں اور دماغ کے خلیات (cells) کے خواص میں سے ہیں اور جب انسان مرجاتا ہے تو روح بھی اسی طرح ختم ہوجاتی ہے جس طرح ایک گھڑی کو جب ہتھوڑی کی ایک ضرب سے توڑ دیا جائے تو فوراً ہی اس کی وقت بتانے والی حرکت بھی ختم ہوجاتی ہے۔

ان کے مدمقابل الٰہی فلاسفہ اور حتیٰ کہ بعض مادی مکاتب کے حامل فلاسفہ بھی روح کی حقیقت اور جاودانی کے قائل ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ جسم کی موت سے روح نہیں مرتی بلکہ وہ اسی طرح زندگی کی راہوں پر گامزن رہتی ہے۔

روح کی جاودانی اور اس کے استقلال کے اثبات کے لیے بہت سی دقیق دلیلیں قائم کی گئی ہیں کہ ہم بطور اختصار ان میں سے بعض واضح دلیلوں کو سادہ اور رواں عبارتوں سے اپنے عزیز جوانوں کے لیے ذکر کرتے ہیں تاکہ وہ خوب آگاہ ہوسکیں۔

ایک بڑا جہان ایک محدود سی چھوٹی جگہ پر نہیں سما سکتا۔ فرض کریں آپ ایک بہت بڑے سمندر کے کنارے بیٹھے ہیں کہ جس کے اردگرد سربفلک پہاڑ تن کر کھڑے ہیں۔ سمندر کی بڑی بڑی اُمواج خشم و قہر سے گرجتی ہوئیں بار بار ساحلی

چٹانوں سے ٹکرا رہی ہیں اور اسی حالتِ غضب و شدت میں سمندر کی طرف پلٹ جاتی ہیں۔ پہاڑی سلسلہ میں پھیلی ہوئی عظیم الجثہ چٹانیں بخوبی بتا رہی ہیں کہ پہاڑوں کے اُوپر کیا قیامت سا منظر برپا ہے، تاحدِ نگاہ نیلگوں آسمان کا خیمہ ان پہاڑوں اور سمندر پر لگا ہوا ہے اور رات کے وقت اس کی عظمت و شکوہ کے جلوے دیکھنے والے ہوتے ہیں۔

ہم ایک لمحہ اس منظر کو دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے ذہن میں اسی منظر کو اسی شان و شوکت سے دوبارہ مجسم کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ اتنا بڑا ذہنی نقشہ اور یہ سب مناظر اسی قدر عظیم جگہ میں سمائیں گے؟ ایسا ممکن نہیں کہ یہ دماغ کے محدود سے خلیات میں بند ہو جائیں۔ اگر ایسا ہو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بہت بڑے نقشے کو ایک معمولی سے نقطہ میں بنا دیا جائے۔ (حالانکہ یہ محال ہے تو ذہن میں کیسے ممکن ہے؟ کیونکہ) ہم بلاشبہ اس بہت بڑے منظر کو اسی عظمت و شکوہ کے ساتھ اپنے ذہن میں محسوس کر رہے ہیں۔

یہیں سے معلوم ہو رہا ہے کہ جسم اور مغزی خلیات کے علاوہ ہم اپنے وجود میں ایک ایسا گوہر بھی رکھتے ہیں کہ جو ہر قسم کے نقشہ اور منظر کو ہر مقدار کے ساتھ اپنے اندر منعکس کر سکتا ہے۔ لامحالہ یہ گوہر جہان مادہ سے ماورا ہوگا چونکہ جہان مادہ میں ایسا ہونا ناممکن ہے۔

## روح میں بیرونی دنیا کے انعکاس جیسی خصوصیت

ہم اپنے وجود میں بہت سے فزیکلی اور کیمیائی خواص پاتے ہیں مثلاً دل و معدہ میں مختلف حرکات یہ ایک فزیکلی عمل ہے جبکہ پیٹ میں جانے والی غذا پر مختلف قسم کے مواد کا ترشح یہ ایک کیمیائی عمل ہے۔ اس قسم کی مثالیں ہمارے پورے جسم میں فراواں ہیں۔

اگر فرضاً روح خیالات اور فکر سب کے سب مادی اور معنوی سلز کی فزیکلی اور کیمیائی خصوصیات میں سے ہیں تو پھر ان میں اور دوسری جسمانی خصوصیات میں اتنا بڑا فرق کیوں ہے؟

ہماری فکر، ہمارا خیال اور ہماری روح بیرونی دنیا سے مربوط کرتی ہیں جو کچھ ہمارے اردگرد ہو رہا ہے۔ ہمیں اس سے بخوبی آگاہ کرتی ہیں جبکہ معدہ کے کیمیائی مواد اور فزیکلی حرکات، آنکھ، زبان اور ہمارے دل کی یہ کیفیت نہیں ہے۔

ایک اور انداز سے اس مطلب کو واضح کرتے ہیں کہ ہم اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ بیرونی دنیا سے ہم اپنے وجود کے ساتھ مربوط ہیں اور بیرونی دنیا کے مسائل سے آگاہ ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ آیا بیرونی دنیا ہمارے اندر داخل ہوئی ہے؟ یقیناً نہیں تو پھر اصل مسئلہ کیا ہے؟

یقیناً بیرونی جہان کا منظر ہمارے پاس آتا ہے جس سے روح میں پائی جانے والی انعکاس جیسی خصوصیت کی وجہ سے ہم بخوبی آگاہ ہوجاتے ہیں اور یہ انعکاس کی خصوصیت ہمارے جسم کے کسی بھی فزیکلی یا کیمیائی حصہ میں نہیں ہے (دقت کریں)۔

پھر ایک اور طرح سے وضاحت کرتے ہیں۔ بیرونی دنیا کے موجودات سے باخبر ہونے کے لیے ان پر ایک قسم کا تسلط ضروری ہے۔ یہ کام مغزی خلیات یا سلز کا نہیں ہے۔ مغزی خلیات یا سلز بدن کے دوسرے سلز کے مانند صرف بیرونی دنیا کے عمل و ردعمل سے متاثر ہوتے ہیں۔

اس خصوصیات سے واضح ہو رہا ہے کہ بدن کی فزیکلی اور کیمیائی تبدیلیوں کے علاوہ یہاں ایک اور حقیقت بھی موجود ہے جو ہمارے وجود سے باہر کی دنیا پر ہمارا تسلط برقرار کرتی ہے اور ہم ان سے آگاہ ہوجاتے ہیں اور یہ حقیقت "روح"

کے علاوہ کچھ نہیں اور یہ ایسی حقیقت ہے جو اس مادی جہان اور اس کی خصوصیات سے بڑھ کر ہے۔

## روح کے حقیقی ہونے اور مستقل ہونے پر تجرباتی دلائل

خوش قسمتی سے آج مفکرینِ جہان نے مختلف علمی اور تجرباتی راہوں سے روح کی مستقل اور حقیقی حیثیت کو ثابت کر دیا ہے اور ان لوگوں کو مضبوط دندان شکن جواب دیا ہے جو روح کی مستقل حیثیت کے منکر ہیں یا اسے مادی خواص میں سے سمجھتے ہیں۔

① مقناطیسی نیند (Hypnotism or Magnetism) ان محکم دلائل میں سے ہے جو بہت زیادہ تجربات کے بعد سامنے آئے ہیں اور بہت سے لوگوں نے اس چیز کو دیکھا ہے اور جن لوگوں نے اسے نہیں دیکھا ان کے لیے تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ کچھ افراد مختلف علمی طریقوں سے دوسروں کے ذریعے نیند میں چلے جاتے ہیں۔ نیند لانے والے "عامل" کہلاتا ہے اور وہ جو نیند میں چلا جاتا ہے اسے "معمول" کہا جاتا ہے۔ اس میں تلقین، فکری ارتکاز اور آنکھ کی مقناطیسی قوت اور دوسرے ذرائع سے "معمول" کو گہری نیند میں لے جایا جاتا ہے لیکن یہ کوئی معمول کے مطابق نیند نہیں ہوتی بلکہ ایسی نیند ہوتی ہے کہ جس میں سونے والے کے ساتھ رابطہ برقرار رکھا جا سکتا ہے اس سے سوال و جواب ہو سکتا ہے۔

اسی حالت میں اس کی روح کو مختلف جگہ بھیجا جاتا ہے اور وہ کبھی نئی نئی خبریں لاتی ہے اور ایسے مسائل کے حوالے سے ہمیں مطلع کرتی ہے کہ جن کے بارے میں ہم عام حالات میں مطلع نہیں ہوتے۔

کبھی وہ اسی مقناطیسی نیند میں اپنی مادری زبان سے ہٹ کر ایسی زبان میں گفتگو کرتا ہے کہ جس سے وہ بالکل آشنا نہیں ہوتا۔

کبھی وہ اسی حالت میں ریاضی کے پیچیدہ ترین سوال حل کرتا ہے۔

کبھی وہ ایسے صندوق میں پڑی ہوئی الواح پر لکھتا ہے کہ جس کے دروازے مضبوطی سے بند ہیں اور یہاں تک کہ کبھی یہ اَرواح دھندلی صورتوں اور روشن سایوں کے مانند مختلف پروگراموں میں ظاہر ہوتی ہیں کہ اس کی تشریح ہم نے کتاب ''عود اَرواح'' میں کی ہے۔

۲ ''اسپری تیسم'' (Spiritisms) یا موت کے بعد ''اَرواح سے ارتباط'' روح کی حقیقت اور اس کی مستقل حیثیت پر ایک اور دلیل ہے۔

آج بھی ایسے کام کرنے والے لوگوں کی پوری دنیا میں تنظیمیں ہیں۔ مشہور مصری دانشور ''فرید وجدی'' کے بقول تقریباً تین سو رسالے اور اخبار ان تنظیموں کی طرف سے پوری دنیا میں نشر ہوتے ہیں۔ دنیا کی بڑی بڑی مختلف شخصیات ان کے پروگراموں میں شرکت کرتی ہیں اور ان کی موجودگی میں اَرواح سے رابطہ کیا جاتا ہے اور معمول سے ہٹ کر (خارق العادت) عجیب وغریب کام کیے جاتے ہیں۔

اگرچہ بہت سے فریب کار جو کہ درحقیقت ان مسائل (روح سے رابطہ) سے لاعلم ہوتے ہیں لیکن لوگوں کو فریب دینے کے لیے اس قسم کے دعوے کرتے ہیں کہ وہ روح سے رابطہ کر سکتے ہیں اور اس حوالے سے بہت غلط فائدہ اُٹھاتے ہیں لیکن اس قسم کا فریب اور غلط فائدہ اُٹھانا اس موجود حقیقت کو نہیں چھپا سکتا کہ جس کا بڑے بڑے محققین نے اعتراف کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ''اَرواح سے رابطہ کرنا ممکن ہے''۔[1]

یہ سب کچھ انسان کی روح کی حقیقت اور اس کی مستقل حیثیت اور اس کی موت کے بعد باقی رہنے پر دلیل ہے اور ساتھ یہ کہ یہ موت کے بعد زندگی اور معاد

---

[1] اس چیز کی مزید وضاحت کے لیے کتاب ''عود اَرواح'' اور کتاب ''معاد و جہان پس از مرگ'' کی طرف رجوع فرمائیں۔

کی طرف بھی ایک موثر قدم ہے۔

۳ وہ خواب جو ہم دیکھتے ہیں اور وہ مناظر جو عالمِ خواب میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں یہ کبھی آنے والے حادثات کی خبر دیتے ہیں اور کبھی یہ بہت سے پوشیدہ مسائل کو بھی آشکار کرتے ہیں کہ جنھیں ہم اتفاقیہ نہیں کہہ سکتے۔ یہ چیز بھی روح کی حقیقت پر ایک اور دلیل ہے۔

اکثر افراد کو اپنی زندگی میں سچے خوابوں کے حوالے سے واقعات پیش آتے ہیں اور وہ سنتے ہیں کہ کس طرح وہ خواب جو فلاں دوست یا عزیز کو آیا تھا کچھ مدت کے بعد کم وبیش سچ ثابت ہوا۔ یہ چیز واضح کر رہی ہے کہ انسان کی روح کا کس طرح دوسرے جہانوں سے خواب کی حالت میں رابطہ ہوتا ہے اور وہ پیش آنے والے حادثات کو دیکھتی ہے۔

بہرحال مجموعی طور پر یہ سب کچھ واضح کر رہا ہے کہ روح نہ مادی ہے اور نہ وہ دماغ کی فزیکلی اور کیمیائی خصوصیت ہے بلکہ ماوراء طبیعت ایک حقیقت ہے جو بدن کی موت سے ختم نہیں ہوتی۔ یہ چیز خود ہی مسئلہ معاد اور موت کے بعد جہان کے اثبات کی راہ کو ہموار کرتی ہے۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ روح کے حوالے سے الٰہی فلاسفہ اور مادی فلاسفہ کے نظریات میں کیا فرق ہے؟

۲ "بڑی چیز کا چھوٹی چیز میں سمانا" کہ جو روح کی حقیقت پر ایک دلیل ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟

۳ آپ مقناطیسی نیند کے حوالے سے کیا جانتے ہو؟

۴ روح سے رابطہ سے کیا مراد ہے؟

۵ سچے خواب روح کی حقیقت اور اس کی مستقل حیثیت پر کس طرح دلیل ہے؟

نواں سبق

# جسمانی اور روحانی معاد

معاد کی بحث میں اُٹھائے جانے والے اہم سوالات میں سے ایک سوال یہ ہے کہ آیا معاد میں صرف "روحانی" جنبہ ہے یا اس جہان میں انسان کا بدن اور جسم بھی دوبارہ لوٹ آئے گا اور انسان اسی روح اور جسم کے ساتھ کہ جو اس دنیا میں ہے وہاں بھی ایک اچھی اور بلند حیثیت کے ساتھ اپنی نئی زندگی کو شروع کرے گا؟

کچھ سابقہ فلسفی حضرات صرف معاد روحانی کے قائل تھے اور جسم کو ایسا وسیلہ یا سواری سمجھتے تھے جو صرف اس دنیا میں انسان کے ساتھ ہے اور موت کے بعد انسان اس کا محتاج نہیں رہے گا اور اسے چھوڑ کر عالمِ اَرواح کی طرف چلا جائے گا لیکن عالمِ اسلام کے بزرگ علماء اور اکثر فلاسفہ کا عقیدہ یہ ہے کہ معاد میں دونوں پہلو ہیں یعنی "روحانی" اور "جسمانی"۔

ر یہ بات درست ہے کہ یہ جسم خاک بن جائے گا اور یہ خاک بکھر کر کہاں کی کہاں چلی جائے گی، لیکن وہ قادر اور عالم ذات روز قیامت ان تمام ذرات کو جمع کرے گی اور انھیں دوبارہ نئی زندگی کا لباس پہنائے گی، وہ اس چیز کو "معاد جسمانی" کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں کیونکہ روز قیامت روح کا لوٹنا تو ایک ثابت شدہ بات ہے بحث صرف جسم کے لوٹنے کے حوالے سے ہے اسی لیے انھوں نے اپنے عقیدے کو جسمانی معاد کا نام دیا ہے۔

بہرحال وہ تمام آیات قرآن جو معاد کے حوالے سے گفتگو کرتی ہیں "اگر چہ

وہ بہت زیادہ اور مختلف قسم کی ہیں" وہ معاد جسمانی کو بیان کرتی ہیں۔

## جسمانی معاد پر قرآنی شواہد

پہلے ہم پڑھ چکے ہیں کہ کس طرح ایک بدو عرب فرسودہ ہڈی کو لیے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ کون اس کو زندہ کرسکتا ہے؟

پیغمبر اکرمؐ حکم پروردگار کے مطابق جواب فرماتے ہیں: وہی جس نے اسے پہلی دفعہ پیدا کیا تھا وہی جس نے آسمان اور زمین کی تخلیق کی اور سرسبز درخت سے آگ باہر نکالتا ہے جیسا کہ سورہ "یٰس" کے آخر میں یہ آیات موجود ہیں۔

قرآن ایک اور مقام پر فرماتا ہے: "تم قیامت میں قبروں سے نکلو گے"۔ (سورۂ یٰسین: آیت ۵۱، اور سورۂ قمر: آیت ۷)۔ اور ہم یہ جانتے ہیں کہ قبریں خاک ہوجانے والے اجسام کی جگہیں ہیں، ارواح کی جگہیں نہیں ہیں۔ اصولی طور پر معاد کے منکرین کی حیرت کا مرکز یہی تھا کہ جو وہ کہتے ہیں: "کس طرح جبکہ ہم خاک ہو چکے ہوں گے اور ہماری خاک بکھر جائے گی دوبارہ ہم زندگی کی طرف لوٹ جائیں گے؟"

وَقَالُوٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ

اور قرآن انھیں جواب دے رہا ہے کہ جس طرح پروردگار اس پر قادر ہے کہ وہ کسی چیز کو پہلی دفعہ پیدا کرے وہ اس پر بھی قادر ہے۔ کیا انھوں نے کبھی غور نہیں کیا کہ اللہ خلقت کی ابتدا کیسے کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کرتا ہے۔ یقیناً اللہ کے لیے یہ (اعادہ) زیادہ آسان ہے۔ (سورۂ عنکبوت: آیت ۱۹)

کوئی جاہل عرب کہہ رہا تھا: "کس طرح یہ مرد تمھیں وعدہ دے رہا ہے کہ جب تم مرجاؤ گے اور خاک اور ہڈی بن جاؤ گے تو پھر دوبارہ زندگی کی طرف لوٹائے جاؤ گے"۔ (سورۂ مومنون: آیت ۳۵)

یہ سب قرآنی تعبیرات اور دوسری آیات واضح طور پر بتا رہی ہیں کہ پیغمبرؐ اسلام نے ہر جگہ جسمانی معاد کا مسئلہ مورد بحث قرار دیا تھا اور تنگ نظر مشرکین کے لیے باعثِ حیرت بھی یہی بات تھی اور جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے قرآن معاد جسمانی کی وضاحت کے حوالے سے عالمِ نباتات اور اس قسم کے دوسرے عوالم کی مثالیں دیتا ہے اور پروردگار کی پہلی تخلیق اور اس کی قدرت کو بطور شاہد ذکر کرتا ہے۔

اسی لیے یہ ممکن نہیں کہ کوئی مسلمان ہو اور بہت ہی کم حد تک قرآن سے آگاہی رکھتا ہو اور پھر بھی جسمانی معاد کا انکار کرے کیونکہ جسمانی معاد کا انکار قرآن کی نظر میں خود معاد کے انکار کرنے کے مساوی ہے۔

## عقلی شواہد

اس سے صرف نظر کریں تو عقل کہتی ہے کہ روح اور بدن باوجود مستقل حیثیتوں کے دو علیحدہ حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ آپس میں پیوند اور رابطہ رکھتی ہیں۔ دونوں کی اکٹھی نشوونما ہوتی ہے۔ اکٹھے راہ کمال طے کرتے ہیں۔ اسی طرح واضح سی بات ہے کہ ابدی زندگی گزارنے کے لیے بھی دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔

اگر یہ دونوں زمانہ برزخ (دنیا و آخرت کا درمیانی عرصہ) میں کچھ مدت ایک دوسرے سے دُور رہتے ہیں تو یہ جدائی ہمیشہ کے لیے ممکن نہیں ہے۔ جس طرح جسم و روح کے بغیر ناقص ہے اسی طرح روح بھی جسم کے بغیر نقصان میں ہے۔ روح حاکم اور عاملِ حرکت ہے اور بدن فرماں بردار اور وسیلہ حرکت ہے۔ کوئی بھی حاکم اپنے فرماں بردار اور کوئی فنکار اپنے وسائل سے بے نیاز نہیں ہے۔

چونکہ روح روز قیامت اس جہان سے بڑھ کر اچھی وضعیت میں ہوگی تو بدن بھی اسی طرح راہ کمال طے کرتے ہوئے اسی مقام پر ہوگا اور یہ بھی ہوگا کہ انسان کا جسم روز قیامت بوسیدگی اور اس جہان کے دوسرے عیوب و نقائص سے پاک ہوگا۔

بہر حال جسم و روح ایک دوسرے کے ہمزاد اور ایک دوسرے کو مکمل کرنے والے ہیں، ایسا نہیں ہو سکتا کہ معاد میں صرف جنبہ روحانی ہو یا صرف جنبہ جسمانی، یعنی جسم و روح کی خلقت کی کیفیت اور ان کے آپس میں گہرے تعلق پر مطالعہ اس چیز پر واضح دلیل ہے کہ معاد میں دونوں پہلو موجود ہوں گے۔

دوسری طرف قانونِ عدالت بھی یہی کہتا ہے کہ معاد دونوں اعتبار سے ہو، اگر انسان نے گناہ کیا ہے تو اس روح و جسم کے ساتھ کیا ہے اور اگر نیکی کی ہے تو بھی اسی روح و جسم کے ساتھ کی ہے اسی لیے جزا و سزا بھی اسی روح و جسم کے لیے ہو۔ اگر یہ سزا و جزا صرف جسم یا صرف روح کے لیے ہو تو قانونِ عدالت کا اجرا نہیں ہو سکے گا۔

## معاد جسمانی کے حوالے سے سوالات

دانشور حضرات اس مقام پر متعدد سوالات کرتے ہیں کہ ان میں سے بعض کا ذکر ان ابحاث کی تکمیل کے لیے ضروری ہے:

1. علوم طبیعی کے محققین کی تحقیقات کے مطابق انسان کا بدن اس کے عرصۂ حیات میں کئی دفعہ تبدیل ہوتا ہے۔ بالکل اسی پانی کے حوض کے مانند کہ جس میں ایک طرف سے پانی داخل ہو رہا ہے اور دوسری طرف سے آہستہ آہستہ نکل رہا ہے۔ واضح رہے کچھ دیر بعد اس حوض کا تمام پانی تبدیل ہو جائے گا۔

یہ صورت انسانی بدن کے حوالے سے احتمالاً ہر سات سال میں ایک دفعہ پیش آتی ہے تو اسی بنا پر ہم اپنے عرصۂ زندگی میں کئی دفعہ تبدیل ہوتے ہیں۔ اب یہ سوال پیش آتا ہے کہ ان تمام جسموں میں سے کون سا جسم (روز قیامت) لوٹ آئے گا؟

جواب میں کہیں گے: آخری جسم، جس طرح کہ مندرجہ بالا آیات میں ہم

نے پڑھا کہ پروردگار انسانوں کو اسی بوسیدہ اور خاک ہوئی ہڈیوں سے نئی خلقت دے گا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ سب لے آخری بدن لوٹ آئے گا۔ اسی طرح قبروں سے نکلنے سے مراد یہی ہے کہ آخری بدن کے ساتھ نکلیں گے۔

لیکن اہم نقطہ یہ ہے کہ یہ آخری بدن ان تمام خواص کا حامل ہوگا جو ان تمام جسموں کے تھے جو عرصۂ حیات انسانی میں بدلتے رہے۔ ایک اور تعبیر کے ساتھ یوں کہیں گے کہ وہ تمام بدن جو آہستہ آہستہ ختم ہوتے رہے وہ اپنی تمام خصوصیات اور آثار آنے والے بدن میں منتقل کرتے رہے۔ اسی لیے یہ آخری بدن پچھلے تمام اجسام کی صفات کا وارث ہے۔ لہٰذا قانونِ عدالت کے مطابق سزا و جزا کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے۔

۲ بعض کا یہ کہنا ہے کہ جب ہم خاک ہوجائیں گے اور ہماری خاک کے ذرات نباتات کے اجزا بن کر کسی اور انسان کے بدن کا جز بن جائیں گے تو روز قیامت حکمِ خدا کیا ہوگا؟ (یہ وہی بحث ہے جسے ہم فلسفہ وکلام کی ابحاث میں "شبہہ آکل وماکول" کے نام سے یاد کرتے ہیں)۔

اگرچہ اس کے سوال کے جواب کے لیے بہت تفصیلی بحث کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم کوشش کرتے ہیں کہ ضرورت کی حد تک مختصر سی عبارت میں یہ بحث کریں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ طے ہے کہ وہ ذرات جو ایک انسان کے خاک شدہ بدن کے ہوں اور دوسرے انسان کے بدن کا جز بن جائیں وہ واپس پہلے بدن کی طرف لوٹ جائیں گے (سابقہ آیات اسی چیز پر تفصیل سے شہادت دے رہی ہیں)۔

اگر کوئی مشکل یہاں باقی رہتی ہے تو وہ یہ کہ دوسرا بدن ناقص ہوجائے گا، لیکن یوں کہنا چاہیے کہ دوسرا بدن ناقص یا نامکمل نہیں ہوگا بلکہ چھوٹا ہوجائے گا۔

چونکہ یہ ذرات اس کے تمام بدن میں بکھرے ہوئے تھے جب اس سے لے لیے گئے تو وہ اس حساب سے کمزور اور چھوٹا ہو جائے گا لہٰذا یہ پہلا بدن ختم ہوگا اور نہ دوسرا بدن، فقط یہ ہوگا کہ دوسرا بدن چھوٹا ہو جائے گا اور اس سے کوئی مشکل پیدا نہیں ہوگی کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ روز قیامت تمام انسانی بدن تکامل پائیں گے۔ ان کے نقائص برطرف ہو جائیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک بچہ نشوونما پاتا ہے یا ایک زخمی انسان کا نئے سرے سے گوشت بنتا ہے جس کی وجہ سے اس کی شخصیت تباہ نہیں ہوتی لہٰذا قیامت کے روز نامکمل اور چھوٹے بدن بھی عالمِ کمال میں ہوں گے اور ایک کامل صورت میں محشور ہوں گے۔ اسی لیے کوئی مشکل بھی باقی نہیں رہے گی۔ (دقت کریں اور مزید وضاحت کے لیے کتاب "معاد جہان پس از مرگ" کی طرف رجوع فرمائیں)۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ معاد جسمانی سے کیا مراد ہے؟

۲ معاد جسمانی کے منکر کیا کہتے ہیں؟ اور قرآن انھیں کیسے جواب دیتا ہے؟

۳ معاد جسمانی پر عقلی استدلال کیا ہے؟ ذکر کریں۔

۴ معاد جسمانی اور قانونِ عدالت میں کیا ربط ہے؟

۵ آکل و ماکول کے شبہہ سے کیا مراد ہے؟ اس کا کیا جواب ہے؟

دسواں سبق

# جنت، جہنم اور اعمال کا مجسم ہونا

بہت سے لوگ اپنے آپ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ موت کے بعد کا جہان بالکل اسی جہان کے مانند ہے یا اس سے مختلف ہے؟ وہاں کے مزے اور وہاں کی سزائیں مختصر یہ کہ وہاں پر حاکم نظام اور قوانین بالکل اسی جہان کے مانند ہیں؟ تو جواب میں ہم واضح طور پر کہیں گے کہ ہمارے پاس بہت سے شواہد ہیں جو واضح کر رہے ہیں کہ وہ جہان اس جہان سے بہت سی جہات سے مختلف ہے۔ جو کچھ قیامت کے بارے میں ہم یہاں جانتے ہیں وہ اس کی شبیہ ہے جیسے دور سے کسی کی شبیہ دکھائی دیتی ہے۔

بہتر یہ ہے کہ ہم اسی "جنین" کی مثال سے واضح کرتے ہیں کہ جس قدر "عالمِ جنین" کا اس "دنیا" سے فاصلہ ہے اتنا یا اس سے زیادہ اس جہان اور اس جہان کے درمیان فاصلہ ہے۔

وہ بچہ جو عالمِ جنین میں ہے اگر وہ عقل و شعور کا حامل ہو اور وہ یہ چاہے کہ باہر کی دنیا آسمان، زمین، چاند، سورج، ستارے، پہاڑ، جنگل اور دریاؤں کی صحیح تصویر لے تو یہ طے ہے کہ وہ کسی بھی صورت میں ایسا نہیں کرسکتا۔

لہٰذا وہ بچہ جو عالم جنین میں ہے اور ماں کے شکم میں چھوٹے سے جہان کا ایک حصّہ ہے اس کے لیے چاند، سورج، دریا، امواج، طوفان، بادِنسیم، پھول اور اس جہان کی خوبصورتیاں بالکل کوئی مفہوم نہیں رکھتیں۔ اس کی لغت کی کتاب صرف چند

الفاظ میں ہی مکمل ہو جاتی ہے اور فرض کریں جب بھی ہو سکے کہ اس سے باہر سے بات کی جا سکے تو وہ کبھی باہر والے کی بات کا مفہوم درک نہیں کر سکتا۔

اس دنیا کی محدودیت کا اس جہان (موت کے بعد کا جہان) کی وسعت سے فرق اسی قدر یا اس سے بھی زیادہ ہے، لہٰذا ہم کبھی یہ قدرت پیدا نہیں کر سکیں گے کہ اس جہان کی نعمات، عنایات اور بہشت بریں سے کما حقہٗ باخبر ہوں۔

اسی لیے ہم ایک حدیث میں پڑھتے ہیں:

فیھا ما لا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر

"جنت میں ایسی نعمتیں ہیں کہ جنھیں کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ کسی دماغ میں یہ خیال آیا ہے"۔

قرآن مجید نے اسی بات کو ایک اور انداز سے بیان کیا ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (سورۂ سجدہ، آیت ۱۷)

"اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے اعمال کے صلہ میں ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا کیا سامان پردۂ غیب میں موجود ہے"۔

اس جہان پر حاکم نظام اس جہان سے بہت ہی زیادہ مختلف ہے، مثلاً: قیامت کی عدالت میں انسان کے ہاتھ، پاؤں، اس کے جسم کی جلد اور یہاں تک کہ وہ زمین جہاں اس نے گناہ یا نیکی کی وہ اس کے اعمال پر گواہ قرار پائیں گے۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ (سورۂ یٰس: آیت ۶۵)

"آج ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ سے کلام کریں گے اور ان کے پاؤں جو کچھ وہ انجام دیتے تھے اس پر

گواہی دیں گے"۔

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (سورۂ فصلت: آیت ۲۱)

"اور وہ اپنے جسموں کی جلد سے کہیں گے کیوں تم ہمارے خلاف گواہی دے رہی ہو۔ وہ کہیں گی: وہ پروردگار جس نے ہر موجود کو بولنے کی قوت دی اس نے ہمیں (بھی) بولنے کی قوت دی ہے (تاکہ حقائق بیان کریں)"۔

کسی زمانہ میں اس قسم کی چیزوں کا تصور بہت مشکل تھا لیکن آج علم وسائنس کی ترقی کے باعث جب ہم مختلف مناظر اور آوازوں کے حاصل (catch) کرنے کی بہت سی مثالوں کا مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ چیز بھی باعث حیرت نہیں رہتی۔

بہرحال اگرچہ ہم اس جہان کی نعمات کے بارے میں دُور سے نظر آنے والی شبیہ کے مانند جتنا بھی علم رکھتے ہیں اس کی وسعت، اہمیت اور اس کی خصوصیات کو تفصیلاً نہیں جان سکتے لیکن ہم اس قدر جانتے ہیں کہ اس جہان کی نعمتیں اور اسی طرح اس جہان کی سزائیں دونوں پہلوؤں کی حامل ہیں یعنی جنبہ جسمانی اور جنبہ روحانی، کیونکہ جب معاد میں دونوں پہلو ہیں تو اس کی جزا وسزا میں بھی دونوں جہتیں ہونی چاہییں۔ جس طرح کہ پروردگار مادی اور جسمانی نعمات کے بارے میں فرمارہا ہے:

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

"وہ جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیتے رہے انھیں
بشارت دیں کہ ان کے لیے ایسے (جنت کے) باغات ہیں کہ
جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں جاری ہیں...... اور ان کے
لیے پاکیزہ بیویاں ہیں اور وہ وہاں ہمیشہ کے لیے رہیں گے"۔

اسی طرح معنوی نعمات کے بارے بھی فرما رہا ہے: ورضوان من اللہ اکبر..... "اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضایت جو کہ جنتیوں کے شاملِ حال ہوگی وہ ان تمام نعمتوں سے برتر اور بڑھ کر ہوگی"۔ (سورۂ توبہ: آیت ۷۲)

ہاں جب جنتی لوگ یہ محسوس کریں گے کہ پروردگار ان سے راضی ہے اور ان کے اعمال کو اللہ تعالیٰ نے قبول کرلیا ہے تو انھیں ایسی خوشی اور لذت محسوس ہوگی کہ جس کا دنیا کی کسی چیز سے مقایسہ نہیں کیا جاسکتا۔

جہنمیوں پر آگ اور دوسرے جسمانی عذابوں کے علاوہ خود پروردگار کا غضب اور اس کی ناراضگی ہر شکنجے سے بدتر ثابت ہوگی۔

## اعمال کا مجسم ہونا

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ روز قیامت ہمارے اعمال زندہ ہوجائیں اور یہ مختلف صورتوں میں ہمارے ساتھ ہوں گے، جزا وسزا کا ایک اہم ترین حصّہ یہی اعمال کا مجسم ہونا ہے۔

ظلم وجور ایک سیاہ وتاریک بادل کی شکل میں ہمیں ہر طرف سے گھیر لے گا جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ایک حدیث میں یوں آیا ہے:

الظلم ھو الظلمات یوم القیامۃ
"ظلم روز قیامت کی تاریکیاں ہیں"۔

یتیموں کا ناجائز طریقے سے کھایا ہوا مال آگ کے شعلوں کی صورت میں

ہمیں گھیر لے گا اور ایمان نور و روشنی کی صورت میں ہمارے اردگرد پھیلا ہوا ہوگا۔ (سورۂ حدید: آیت ۱۲)

سود خور جو کہ اپنے اس ذلیل و پلید عمل سے معاشرے کے اقتصادی توازن کو تباہ و برباد کردیتے ہیں وہ تشنج کے ایسے مریض کے مانند ہوں گے جو اُٹھتے وقت اپنا توازن قائم کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ کبھی زمین پر گر جاتا ہے اور کبھی اُٹھ پڑتا ہے۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۷)

وہ مال جسے ذخیرہ اندوز اور کنجوس مال دار لوگوں نے جمع کیا تھا اور اس میں سے ضروریات سے محروم لوگوں کو ان کا حق نہیں دیا تھا وہ بھاری طوق کی صورت میں ان کی گردن میں اس انداز سے لٹکایا جائے گا کہ وہ ہلنے جلنے پر بھی قادر نہ ہوں گے۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۱۸۰)

اسی طرح تمام اعمال عمل کی مناسبت سے مختلف صورتوں میں مجسم ہوں گے۔

ہم جانتے ہیں آج علم و سائنس یہ کہہ رہے ہیں کہ دنیا میں کوئی چیز ختم نہیں ہوتی کیونکہ (چیزوں کے اصلی عناصر) مادہ اور انرجی ہمیشہ سے شکل و صورت کو تبدیل کر رہے ہیں۔ ہمارے افعال و اعمال بھی اس قانونِ جہان سے خارج نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ باقی ہیں۔ اگرچہ بعد میں ان کی شکل تبدیل ہوجائے گی۔ قرآنِ مجید قیامت کے بارے میں ایک مختصر مگر لرزہ دینے والی عبارت میں یوں فرما رہا ہے:

وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا (سورۂ کہف: آیت ۴۹)

''لوگ اپنے اعمال کو وہاں موجود پائیں گے''۔

کیونکہ حقیقت میں انسان جو کچھ بوتا ہے اپنے اعمال کے ذریعے بوتا ہے، لہٰذا پروردگار اسی آیہ کے ذیل میں بلافاصلہ فرماتا ہے: وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ''تمھارا پروردگار کسی پر ظلم و ستم نہیں کرتا''۔ (سورۂ کہف: آیت ۴۹)

قرآن مجید میں ایک اور مقام پر روز قیامت کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ:

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ (سورۂ زلزال: آیت ٦)

''اس روز لوگ گروہ گروہ کی شکل میں (اپنی قبروں) سے نکلیں گے تاکہ انھیں ان کے اعمال دکھائے جائیں''۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝ (سورۂ زلزال: آیت ٧-٨)

''جس نے (بھی) ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا''۔

غور کریں کہ کہا جا رہا ہے کہ وہ خود اعمال کو دیکھیں گے۔

اس حقیقت پر توجہ ہونی چاہیے کہ ہمارا ہر چھوٹا، بڑا، اچھا اور برا عمل اس جہان میں باقی اور محفوظ رہے گا اور ختم نہیں ہوگا۔ اور روز قیامت ہمارے ساتھ رہے گا اور یہ چیز ہوسکتا ہے سب کے لیے خطرے کی گھنٹی ہو تاکہ سب برائیوں کے مدمقابل محتاط اور محکم رہیں اور نیکیوں کو چاہنے والے اور ان پر ثابت قدم رہنے والے بن جائیں۔

ایک دانش ور لکھتا ہے: آج ممکن ہے دو ہزار سال قبل کے مصری کمہاروں کی آوازوں کی لہریں یوں حاصل کرلی جائیں کہ وہ سننے کے قابل ہوں، کیونکہ مصری عجائب گھروں میں دو ہزار سال پرانے ایسے کوزے بھی موجود ہیں کہ جنھیں مخصوص چکروں اور ہاتھوں کے ذریعے بناتے وقت بنانے والوں کی آوازوں کی لہریں ان کوزوں کے جسموں پر نقش ہوگئی تھیں کہ آج ممکن ہوچکا ہے کہ ان لہروں کو دوبارہ

نئے سرے سے یوں زندہ کیا جائے کہ ہم اپنے کانوں سے انھیں سن سکیں۔ بہر حال قرآن مجید میں مذکورہ مسئلہ معاد اور نیکوکاروں کی ہمیشہ کی جزا اور بدکاروں کی ہمیشہ کی سزا کے حوالے سے جو بہت سے سوال مطرح ہوتے ہیں تو ان کا اسی بحث "اعمال کا مجسم ہونا" اور یہ کہ ہر عمل چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا ہماری روح و جان پر اثر انداز ہوتا ہے اور وہ اثر ہمیشہ ہمارے ساتھ باقی رہتا ہے" کے ذریعے جواب دیا جاتا ہے۔

## سوچیے اور جواب دیجیے

۱ کیا انسان کی روز قیامت کی زندگی ہر جہت سے دنیا کی زندگی کے مشابہ ہے؟

۲ کیا ہم قیامت کی سزاؤں اور جزاؤں کو بالکل اسی طرح اس دنیا میں بھی درک کر سکتے ہیں؟

۳ آیا جنتی نعمات اور جہنمی عذاب صرف جسمانی حوالے سے ہیں؟

۴ اعمال کے مجسم ہونے سے کیا مراد ہے؟ اور قرآن اسے کیسے بیان کر رہا ہے؟

۵ اعمال کے مجسم ہونے کا عقیدہ بحث معاد کی کون سی مشکلات کو حل کر رہا ہے؟

maablib.org

ادارہ منہاج الصالحین لاہور (رجسٹرڈ)